حیات

شیخ الہند

امام العصر حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہ

تالیف

حضرت میاں صاحب سید اصغر حسین رحمہ اللہ تعالیٰ

محدث دار العلوم دیوبند

ادارہ اسلامیات لاہور

تاج العلماء سراج الفقہاء زبدۃ الکاملین قدوۃ العارفین خاتم المحدثین

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے حالات و کمالات پر مستند کتاب

مؤلفہ

العارف الربانی مولانا الحاج حضرت میاں صاحب سید اصغر حسین رحمۃ اللہ تعالیٰ

محدث دارالعلوم دیوبند

پہلی بار عکسی کتابت ———— جنوری ۱۹۷۷ء

باہتمام ———— اشرف برادرز ، لاہور

ناشر ———— ادارۂ اسلامیات : انارکلی لاہور

کتابت ———— خلیل الرحمٰن خوش نویس

طباعت ———— نفیس پرنٹرز ۔ لاہور

قیمت مجلد سنہری ڈائی دار ———— /- روپے

ادارۂ اسلامیات

پبلشرز ۔ بک سیلرز ۔ ایکسپورٹرز

www idaraeislamiat.com, e-mail idara e islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

- ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ ۔ انارکلی لاہور
- دارالاشاعت ۔ مولوی مسافر خانہ ، بند روڈ ، کراچی
- مکتبۂ دارالعلوم ، دارالعلوم ، کراچی ۔ ۱۴
- ادارۃ المعارف ، دارالعلوم ، کراچی ۱۴

فہرست مضامین

نوٹ

خط کشیدہ عنوانات مصنف کے قائم کردہ ہیں: جب کہ باقی عنوانات کا بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔

(ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرمایا کہ:

حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب ہی ذات تھی۔ مدعیانِ محبت نے تو مولانا کو پہچانا ہی نہیں اور اس نہ پہچاننے کی وجہ سے وہ شیخ العالم کو شیخ الہند کہتے ہیں، ہمارے اعتقاد میں تو وہ شیخ الہند والسند والعرب والعجم ہیں۔

افاضات الیومیہ

حصہ چہارم

ملفوظ ۹۲۷۔ ص ۵۸۴۔ بتاریخ ۴ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

(مجلس عام بعد نماز ظہر)

حامداً ومصلیاً۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری لکھنا کچھ آسان نہیں ہے۔ ابتدائی واقعات کے لحاظ سے لکھنے والا ایسا شخص ہونا چاہیے جو فی الحقیقت حضرت کا ہم عصر ہو یا تقریباً شمار ہو سکتا ہو اور پھر صحبت و رفاقت کا شرف بھی حاصل ہو دوسرا شخص بھی ادھر اُدھر سے یہ مشکل حالات جمع کر سکتا ہے لیکن وہ بات کہاں۔ لیس الخبر کالمعاینۃ

اس کے علاوہ مہارت فی العلوم کے ساتھ ذہن ثاقب اور فہم کامل کی ضرورت ہے تاکہ واقعات کو اندازہ اور وزن کر سکے قابل ذکر کو ذکر کرے اور قابل حذف کو حذف اور بسط و تفصیل کے مواقع میں طول سے کام لے اور محل اجمال میں اختصار پر اکتفا کرے، واقعات کو مرتب کر کے ان کے نتائج اخذ کرے اور ہر واقعہ میں ایک ایک کمال دکھلاوے پھر ان سب اوصاف کے ساتھ قادر علی الکلام بھی ہو تاکہ واقعات کو دلچسپ طرز میں ادا کرے۔ ناظرین و سامعین کے اشتیاق و رغبت کو بڑھا دے۔ صاحب سوانح کی تقلید، اقتداء کا شوق پیدا کرے اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت بندھا دے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں یہ سب وصف بدرجہ کمال موجود تھے۔ مولانا ممدوح اگر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے سوانح مبسوط لکھتے تو سب امور کی کامل رعایت فرما سکتے تھے آپ نے مختصر لکھے مگر پھر بھی اس خوبی سے لکھے کہ اہل علم معترف ہیں کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور نہایت تہذیب سے ضروری امور کو جمع فرما دیا ہے۔

اور محض یہ اوصاف کافی نہیں بلکہ کامل اطمینان و فرصت اور محنت برداشت کرنے کی طاقت بھی ضروری ہے اور ان تمام امور کے جمع ہو جانے کے بعد بھی یہ کام مشکلات سے خالی نہیں اور بلا دردسری اور احتمالِ ضیق کے میسر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حضرت کے حالات ہی کچھ ایسے ہیں، شریعت میں نظر کیجئے تو کچھ انتہا ہی نہیں، طریقت میں غور کیجئے، تو پایاں ہی نہیں، علوم و کمالات کا ذکر کیجئے تو سلسلہ ختم ہی نہ ہوگا۔ اوصاف حسنہ و اخلاق حمیدہ کو لکھئے تو احصار دشوار ہوگا کوئی لکھے تو کیا لکھے، کس کس بات کو لکھے اور کہاں تک لکھے ہر چیز ایک مستقل بحث ہے اور مبسوط تصنیف کی محتاج ہے

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب

کی طرف اہل علم کی نظریں پڑ رہی ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے انہی حضرات کی توجہ سے تکمیل کی اُمید ظاہر فرمائی ہے۔ ان حضرات کی کمال اہلیت میں کس کو کلام ہے لیکن مسلمانوں کے مصائب اور حالاتِ حاضرہ نے جس پریشانی اور بے چینی میں ان حضرات کو مبتلا کر رکھا ہے اس کا صرف یہی اثر نہیں کہ فرصت اور وقت میں گنجائش نہیں بلکہ دل و دماغ بھی ایسے ماؤف و متاثر ہو رہے ہیں کہ ان سے اُمید نہیں کہ کہ ایسی حالت میں اس عظیم اہتمام کی ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

با ایں ہمہ موانعات سب مشکلات کا مقابلہ کر کے اور کسی طرح یکسوئی حاصل کر کے ان حضرات میں سے کسی نے اس قومی بلکہ شرعی فرض کو ادا کرنے کا ارادہ بھی کیا تو یقین نہیں کہ مذکورہ سابقہ دشواریں اور بسط و تفصیل کی ضرورتیں ان حضرات کو اپنی محنت اور دیدہ ریزی کا نتیجہ قوم کے سامنے پیش کرنے کا دو سال سے کم میں موقع دیں۔ لیکن یہ تاخیر بالفعل اگرچہ ناواقفوں کو کسی قدر گراں گذرے گی لیکن نتیجہ دیکھنے کے بعد ان کی شکایت جاتی رہے گی اور یہ مقولہ صادق ہو جائے گا۔ لَا يَسْئَلُوْنَكَ فِي كَمْ فَرَغْتَ بَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلٰى حُسْنِ الْمَعْمُوْلِ وَجَوْدَةِ صَنْعَتِهٖ۔

بہر حال احقر جو چند صفحات اپنی پرانی زبان سے سیاہ کر کے شائع کرتا ہے اس کو ناظرین کوئی سوانحمری یا حیاتِ شیخ الہند سمجھ کر حضرت کے تلامذہ اور اہل عصر کو الزام نہ دیں بلکہ آپ کے سوانح پر بہترین تالیف کے منتظر رہیں (جس کی تاخیر کے بعض اسباب احقر ذکر کر چکا ہے) اور جمع کرنے والے حضرات کے لئے اعانت و توفیق من اللہ کی دُعا کرتے رہیں۔

احقر نے حضرت کی تشریف آوری کے وقت بہت سے شناسا اور متعارف لوگوں کے خطوط آنے کے جواب میں بعض دفعہ تشریف آوری کے مفصل واقعات لکھے اور چونکہ ہر طرف سے خطوط آ رہے تھے۔ اس لئے رباؔنی کی تحریکات اور بمبئی سے دیوبند تک تشریف آوری کے مفصل حالات ترتیب دے کر ارادہ کیا کہ بہت جلد طبع کرا دیئے جائیں تاکہ ہر خط کے جواب میں ایک نسخہ بھیج دیا جائے لیکن انہی ایام میں دیوبند میں تپ ولرزہ شروع ہو گیا۔ اس کے دوروں نے احقر کو دو ماہ تک کاروبار سے معذور رکھا اور یہ ارادہ تقریباً ملتوی ہو گیا۔ پھر حضرت کو سخت علالت کے بعد صحت ہوئی تو غایت مسرت نے اس خیال کو پھر تازہ کر دیا اور مرض و صحت کے حالات کا اضافہ بہت مناسب معلوم ہوا۔ اکثر حالات لکھ لئے تھے اور طبع و اشاعت کے تہیہ میں تھا کہ حضرت کے مرض نے عود کر کے اشتداد کی صورت اختیار کر لی اور اسی مرض میں دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

ایک عرصہ تک قلم اٹھانے کو دل ہی نہ چاہا اسی طرح دو ماہ گزر گئے۔ اب کچھ خیال آیا تو مرض د

وفات کے حالات سب سے زیادہ مہتم بالشان نظر آئے اور اس وقت ان کی تحریر سے بہتر کوئی مشغلہ ہی نظر نہ آیا جس میں دل بہلتا۔ تشریف آوری کے شاندار و مسرت انگیز حالات اب اگرچہ بے رونق اور پھیکے ہوگئے ان کو پڑھ کر اب خوشی کی جگہ حسرت ہوتی ہے اور ہنسی کی جگہ رونا آتا ہے تاہم بالکل حذف کرنا مناسب نہ سمجھا کسی قدر اختصار کر دیا ہے بقول شخصے ؎

اے دل آغاز کن افسانۂ ایام وصال

تا بہ مشغولی آں قصہ شب غم گذرد

کیونکہ تحریر و ترتیب میں کسی قدر محنت اٹھانی پڑی ہے اس لئے اپنے حضرت کی ادنیٰ یادگار سمجھ کر طبع و اشاعت کا قصد مصمم ہوگیا تو کسی قدر ابتدائی حالات اور نظر بندی و اسیری کے مختصر واقعات بھی شامل کر دئے اور اس طرح اوراق پریشان کا ایک اچھا مجموعہ ہوگیا مگر پھر بھی آپ یقین فرمائیں کہ بلا مبالغہ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے حضرت کے حالات و کمالات کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے ان اوراق کے متعلق کسی سے نظر پسندیدگی کی کیا توقع کی جائے جو سوانح اعلیٰ دماغ اور رذائل اہل قلم کی محنت کا نتیجہ ہوں گے۔ خدا کے بندے اس میں بھی نیبہ نکالنے کو موجود ہو جائیں گے۔ دیکھئے مولانا عاشق الٰہی صاحب نے کتنی محنت اور دردسری سے حتی الوسع بہتر صورت میں تذکرۃ الرشید پیش کیا مگر بعض مبصرین کی نظر قبول نے اُسے بھی مرحبا نہ کہا اور اس زمانہ میں تو کسی کی حقیقت کیا ہے، امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ جیسے اعلیٰ کمال کے بحر العلوم نے آٹھ جلدوں میں تفسیر لکھی اور جس قدر محنت اُٹھائی ہوگی وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ مگر پھر بھی دوستوں نے اس کی نسبت فیہ کل شیئ الا التفسیر کا مقولہ مشہور کرا کر چھوڑا۔ پھر یہ اجزائے پریشان تو کس شمار و قطار میں ہیں۔ ہمارے عنایت فرما اس کو اگر

چشمانِ تو زیر ابرواند   دندانِ تو جملہ در دہانند

کا مصداق کہنے پر اکتفا کریں تو غنیمت ہے۔

البتہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اکثر چشم دید حالات ہیں یا یہ حضرت اقدس کی زبان مبارک سے سُنے ہوئے واقعات یا بعض بہت ہی معتمد حضرات کی روایات۔ لہٰذا اگر کوئی بات خلاف تحقیق نظر آئے تو عوام کالانعام بل ھم اضل کی طرح حرف گیری نہ کرتے پھریں۔ بلکہ اگر کوئی تاویل و تطبیق ممکن ہی نہ ہو بطرز مناسب مطلع فرمائیں شکریہ کے ساتھ اصلاح شائع کر دی جائے گی۔

دوسری عرض یہ ہے کہ اس مختصر رسالہ کو دوسروں کے لئے سدِ راہ اور مضر نہ سمجھیں اور یہ خیال نہ فرمادیں کہ اس کی وجہ سے شائقین کی توجہ ہٹ گئی آتشِ شوق سرد ہوگئی۔ اس لئے کہ یہ چند اوراق حضرت کی سوانحعمری یا حیاتِ شیخ

کہلانے کے حقیقت میں مستحق ہی نہیں۔ یہ امر دیگر ہے کہ سر دست کوئی اور مناسب نام خیال میں نہ آنے کی وجہ سے باد نے مناسبت اس کو بھی "حیات شیخ الہند" سے موسوم کر دیا گیا ہے اور اگر علی سبیل التنزل اس کو بھی سوانحعمری تسلیم کر لیا جائے تو مضائقہ کیا ہے۔ مقبولان خداوندی کی دس دس اور بیس بیس (بلکہ بہت زائد) سوانحعمریاں لکھی گئیں ہیں۔ صغیر ہو یا کبیر عظیم ہو یا حقیر ایک دوسری کے لئے نہ سنگ راہ ہوئی اور نہ سد راہ، نہ مانع ہوئی نہ حاجب۔ جس المماری میں شیخ جلال الدین کی تبییض الصحیفہ[1] اور خیرات الحسان رکھی ہیں وہیں مناقب النعمان اور سیرۃ النعمان موجود ہے اور غرائب البیان کے ساتھ ہی ساتھ رحمت رضوان۔

احقر کے جمع کردہ بے سر و پا اجزاء تو کالعدم ہیں مساوی الرتبہ معتمد مصنفین کی مقبول تصنیفات کی نسبت کم ترک الاول للاخر کا سچا مقولہ زبان زد ہے لوگ مختلف ذرائع سے اظہار درد کر رہے تھے احقر نے بھی اپنے دل کا بخار نکال کر ان اوراق کو سیاہ کر دیا اور چونکہ احقر نے اس رسالے کو ایسے وقت میں ترتیب دیا ہے کہ حضرت کی کوئی معتبر یا غیر معتبر سوانحعمری موجود ہی نہ تھی۔ اس لئے اس کی غلطیاں روشنی میں آ کر دوسروں کے لئے مشعل راہ ہو جائیں گی اور تعرف الاشیاء باضدادھا کے قاعدے سے یہ تالیف ضعیف آئندہ سوانح کی قدر و قیمت بڑھائے گی۔

افسوس سب کچھ ہے مگر حضرتؒ نہیں جو ایک لفظ کہکر میری اُلٹی سیدھی باتوں کی داد دے دیا کرتے تھے اور سادہ دلی کی غلطیوں پر ادنیٰ تبسم سے صاد فرما دیا کرتے تھے۔ تاہم ایام ترتیب و تالیف میں بعنوانات مختلفہ سات مرتبہ خواب میں زیارت ہو جانے سے اتنی امید بندھتی ہے کہ ناراض نہیں ہیں اور ایک خستہ جگر خادم کی تسلی کے لئے یہی کافی ہے۔

خدا تعالیٰ اپنی عنایت و رحمت سے اُنہیں کے خدام و متوسلین میں محشور فرما دے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

خاکسار

دیوبند۔ رجب ۱۳۳۹ھ　　　احقر الخدام و التلامذہ فقیر اصغر حسین حسنی حنفی عفی عنہ

---

[1] یہ سب نام امام صاحب کی سوانحعمریوں کے ہیں۔ آپ کی سوانح کی تعداد لوگوں نے ساٹھ اور ستر تک بتلائی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وطن، خاندان، تولد اور ابتدائی حالات

وطن دیوبند

دہلی اور سہارنپور کے درمیان میں دہلی سے ننانوے[۹۹] میل اور سہارنپور سے بیس[۲۰] میل جانب جنوب ضلع سہارنپور کے متعلقات میں قصبہ دیوبند ایک نہایت قدیم بستی ہے مشہور یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مبلغ اور سفیروں نے یہاں کے باشندوں کی فریاد پر تشریف لا کر ایذا دہندہ جنات کو قید کر دیا۔ چنانچہ ایک پرانے کنوئیں کو دوبارہ کھودنے کے وقت ایک جن کا نکلنا بھی عوام الناس کی زبان پر ہے لیکن یہ وجہ تسمیہ کچھ معتبر نہیں کسی کا ایجاد طبع معلوم ہوتی ہے۔ معتبر لوگوں سے یہ منقول ہے کہ تمام ہندوستان کی طرح اس نواح میں بھی ہنود بت پرست آباد تھے۔ بتوں اور دیبیوں کی کثرت نے اس کو دیبی بن مشہور کرایا اور تصرف متکلمین سے ابتدا میں دیبن اور رفتہ رفتہ دیوبند کہلایا۔

اس بستی کی آبادی کا طرز بھی قابل ذکر ہے ہندوؤں کی آبادی ایک جانب ہے اور مسلمانوں کی دوسری طرف۔ درمیان میں ایک بازار ہے جو بمنزلہ حد فاصل شمار ہو سکتا ہے اور پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہر ایک قوم اور فرقہ علیحدہ علیحدہ ایک جگہ آباد ہے۔ اگرچہ اب تغیر زمانہ اور نقل و تبدیل سے وہ حالت رفتہ رفتہ بدلتی جاتی ہے تاہم ابھی یہ ترتیب مخصوص بالکل ظاہر او محسوس ہے۔ اس قصبہ کی تعریف میں حضرت شیخ الہند کے والد ماجد رحمہما اللہ تعالیٰ اپنی کتاب الہدیۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ العربیۃ میں اہل سخن کے مبالغہ کو استعمال فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :-

کورۃٌ قدیمۃٌ وقصبۃٌ عظیمۃٌ مدینۃٌ کریمۃٌ وبلدۃٌ فخیمۃٌ کانہا اوّل عمران عُمّر بعد الطوفان ذات المعاھد الوسیلۃ و المساجد الرفیعۃ والمعالم المشھورۃ والمقابر المزورۃ والاٰثار المحمودۃ والاخبار المسعودۃ وابنیۃٍ مرصوصۃٍ وامکنۃٍ مخصوصۃٍ

اس کے بعد فرماتے ہیں: طینتہا احکم من الجص وصماءھا المسنون اثبت من الرصاص فی الرض۔ پھر یہاں کے نیشکر کی نسبت لکھتے ہیں۔" واما قصب السکر والقند۔ فقلما یوجد ان فی البلاد مثل دیوبند فی المذوق کالعسل وفی الریح کالرند فاین منہا سمرقند۔

اس قصبہ کے مسلمانوں میں غالب اور معزز عنصر ہمیشہ سے خلفائے راشدین کی اولاد یعنی شیوخ کا رہا ہے جن میں بعض شیوخ صدیقی ہیں اور اکثر عثمانی چنانچہ مولانا ممدوح تحریر فرماتے ہیں۔

والاشراف اکثرھم من ولد السعید الشھید الصابر الشاکر۔ السخی الاریحی اندا ھم یداً واقربھم الی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نسبًا ومحتدًا واصلاً ومحفدًا مجھّز جیش العسرۃ ثالث الخلفاء والعشرۃ المبشرۃ من ھاجر ھجرتین وفاز بالخطبتین سیّدنا ابی عمرو عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ وعن الصحابۃ والتابعین۔

خاندان اور والد ماجد

اسی مبارک سلسلہ کے چند معزز خاندان ہیں حضرت مولانا کا خاندان ہے حضرت کے جد امجد شیخ فتح علی صاحب تھے ان کے تین صاحبزادے تھے جن میں سے حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب ایک نہایت صاحب اقبال اور دینی و دنیاوی حیثیتوں سے صاحب وجاہت و عزت عالم تھے باوجود کرم۔ اخلاق کے صورت سے سیادت اور رعب

عیال تھا۔ حق تعالیٰ نے اموال و اولاد صحت وحیات سے بہرۂ وافی عطا فرمایا تھا اور مولانا اپنے شہر میں نہایت خوش قسمت اور بلند اقبال شمار ہوتے تھے۔ ۱۳۲۲ھ میں پچاسی سال کی عمر میں وفات ہوئی تو شمار کرنے سے معلوم ہوا کہ ساٹھ[1] افراد اولادِ ذکور و اناث چھوڑے ہیں۔ دہلی کے عربی کالج میں جہاں سے بہت سے فخر روزگار علماء نکلے ہیں آپ نے استاذ العلماء والمشائخ مولانا محمد مملوک علی[2] صاحب سے تعلیم پائی تھی۔ تمام عمر آپ کی علمی خدمات میں بسر ہوئی۔ علوم ادبیہ سے خاص مناسبت تھی۔ نظم ونثر آپ کی عرب العرباء کو یاد دلاتی تھی۔ دیوبند کے حالات میں ابھی آپ چند جملے حضرت ممدوح کے ملاحظہ کر چکے ہیں اور چند اشعار حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مرثیہ میں نظر سے گذرینگے۔

ہندوستان کے مشہور پھل آم کی نسبت جو کچھ بطرز بدیع وعجیب تحریر فرمایا ہے اس کا انتخاب خالی از ذائقہ معنوی نہیں۔

ان کنت تبغی اطیب اللذات	فعلیك صاح بانبه الثمرات
فی حسن مرء فی نباهة سیرة	فی لطفِ ذات فی ستوصفاتِ
من طعمها فی کل قلب شهوةٌ	فکانها مجموعة الشهوات
یا حسن حمرتها وخضرتها وصُفـ	رتها علی الاشجار فی الروضات
فکانها الوان وجنات الحبـا	ئب مسها العشاق فی الخلوات
واذا عصارتها مصصت وجدتها	احلی کمثل رضاب محبوبات
وتری ثماراً علقت فی غُصنها	مختومُ راحٍ فی اکف سُقاتِ
لم تختلف کمثالها الاثمار فی ال	الوان والاذواق والهیئات
سبحان من بالفضل فضلها علی	اشهی مذوقاتٍ ومشمومات
بالجامعیة فاقت الاثما	رکالانسان فاق جمیع حیوانات

---

[1] بیٹے بیٹی پوتے نواسے وغیرہ ۱۲ [2] مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد ماجد ہیں اور مولینا رشید احمدؒ مولانا محمد قاسمؒ اور مشہور علماء کے استاذ ہیں۔

جَلَّ القدیر الفرد من فی تمرۃ
بالصنع یجمع سائرالثمرات

دیوان حماسہ اور دیوان متنبی کی مفید شروح تسہیل الدراسہ اور تسہیل البیان آپ کی بہترین علمی یادگار ہیں اور قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت سعاد کی شرح بین عطرالوردہ اور الارتشار، جس شوق و ذوق سے تحریر فرمایا ہے وہ حُبِّ نبوی کی علامت اور بہترین ذخیرۂ آخرت اور کمالِ ایمان کی دلیل ہے اسی طرز پر عرب کے مشہور سبعہ معلقات کی شرح التعلیقات علی السبع المعلقات تحریر فرماکر طالبانِ ادب پر احسان فرمایا ہے اور فن معانی و بیان کو نہایت خوبی سے اردو زبان میں دکھلاکر تذکرۃ البلاغت نام رکھا ہے، اور قواعد و ضوابط معانی کی مثالیں اساتذۂ اردو کے کلام سے دکھلاکر کمال کیا ہے بلکہ زبانِ اُردو میں سب سے پہلے مولانا ممدوح نے اس فن کو جاری کرکے دکھلایا ہے۔ ایسے باکمال حضرات اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ کی اُولاد

جناب موصوف کے دو صاحبزادیاں تھیں (جن کی شادی شہر کے مشہور خاندانوں میں ہوئی تھی، دونوں کا انتقال ہوگیا۔ اور اولاد موجود ہے) اور چار صاحبزادے۔

اوّل۔ فخر آباء و اجداد حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔

دوم۔ مولوی حامد حسن صاحب جن کی ملازمت کا اکثر حصہ ضلع بجنور میں گزرا اور ۱۳۲۹ھ میں حضرت مولانا کو اُن کے انتقال سے بڑا صدمہ پہنچا۔ اب ان کی اولاد بفضلہ تعالیٰ بیٹے پوتے موجود ہیں۔

سوم۔ مولانا الحاج حافظ حکیم محمد حسن صاحب مدرس و طبیب دارالعلوم دیوبند وغیرہ آپ نے علوم دین حدیث شریف وغیرہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ سے گنگوہ میں قیام کرکے حاصل کیے اور دیگر علوم دارالعلوم دیوبند میں اور اپنے بھائی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے اور طب دہلی میں حکیم عبدالمجید خاں صاحب مرحوم و مغفور

سے حاصل فرمائی۔ حالانکہ برادر خورد ہیں لیکن حضرت مولانا ان کی نہایت تعظیم و توقیر و رعایت فرماتے۔ بالالتزام خطوط میں سب خاندان کو ان کی تعظیم و اطاعت کی تاکید فرماتے۔ حکیم صاحب بھی عجیب جامع الکمالات عالم ہیں۔ ایام تلمذ و حاضری میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کی سعادتِ شفقت و امتیاز حاصل فرمائی متعدد حج بطمانیت ادا کئے۔ دارالعلوم دیوبند کی مدرسی وطبابت اور اپنا مطب اور اہل شہر کا معالجہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے والد ماجد کے اموال و جائداد کا انتظام و تکفل سب آپ ہی کرتے ہیں اور مشغلۂ سیر و شکار بھی ہاتھ سے نہیں جاتا ادام اللہ فیوضہم۔

چہارم۔ مولوی حافظ محمد محسن صاحب۔ حضرت مولانا اُن کو سب سے چھوٹا بھائی ہونے کی وجہ سے نہایت عزیز رکھتے تھے اور بزرگانہ و پدرانہ شفقت اور ضروری نصائح فرماتے تھے ان کو بھی حضرت مولانا سے غایت درجہ کی الفت و عقیدت تھی۔ اسیری کے زمانہ میں حضرت کو یاد کرکے زار زار روتے تھے۔ اکثر عمر میں مشغلۂ ملازمت رہا۔ سلمہم اللہ تعالیٰ۔

ان سب حضرات کی والدہ ماجدہ دیوبند کے ایک معزز شیخ پیر علی بخش صاحب کی صاحبزادی تھیں اور نہایت سخی اور خداترس منتظم بی بی، ان کی حسن نیت سے گھر میں ہر طرف خیر و برکت کا ظہور تھا۔ مال و عزت کے علاوہ جیسی قابلِ رشک اولاد خدا تعالےٰ نے حضرت مولانا کے والدین کو عطا فرمائی تھی، ایسی دنیا میں شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ دونوں صاحبزادیاں نہایت عفیفہ، صالحہ دیندار منتظمہ۔ چاروں صاحبزادے عالم، صالح، دین و دنیا کے اعتبار سے معزز، اور پھر ان سب میں مولانا جیسا فخرِ اسلام و مسلمین، چودھویں صدی کا اشہر مشاہیر، خاتم المحدثین جوہر یکتا۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

والدین کو اولاد سے محبت ہوتی ہے مگر حضرت فرماتے تھے کہ میری والدہ کو مجھ سے اس قدر محبت تھی کہ اب کوئی کتنی ہی محبت کرے اُن کے مقابلہ میں قدر نہیں ہوتی۔ میں

اپنے درس و تدریس میں مشغول رہتا۔ گھر میں کھانا پک جاتا سب کھا لیتے لیکن میری والدہ کسی قدر آٹا بچا کر میری منتظر رہتیں۔ گرمی کے دوپہر میں جب بارہ بجے میں جاتا فوراً خود تازہ روٹی پکا کر کھلاتیں۔ ان مخدومہ کا انتقال سنہ ۱۳۰۱ھ میں حضرت کے والد ماجد سے تیئیس برس پہلے ہو گیا تھا۔

ان کی وفات کے روز ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ حضرت کے والد ماجد کی پنشن کا عرصہ سے انتظام ہو رہا تھا۔ پنشن کا باضابطہ حکم ان مخیرہ بی بی کے انتقال سے نصف گھنٹہ بعد پہنچا۔ صاحبزادوں سے والد ماجد نے فرمایا کہ "تمہاری والدہ کی وفات سے نصف رزق کم ہو گیا۔"

پیدائش

حضرت مولانا ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں بمقام بریلی (جبکہ آپ کے والد ماجد بوجہ ملازمت مع اہل و عیال وہاں مقیم تھے) عالمِ ظہور میں تشریف لائے۔ والد ماجد نے بطرز شائستہ اظہار مسرت کیا، اور محمود حسن نام رکھا۔ اور تاریخی نام بعض ظریف علماء نے ولدِ ذوالفقار علی بتایا۔ حسب دستور شرفائے ہند والدہ کی آغوش شفقت میں پرورش پائی۔ لیکن دودھ اکثر ایک مرضعہ دیوبند کی رہنے والی کا پیا۔ چھ سال کی عمر میں یہ صاحب طالع سعید بچہ جو آگے چل کر محدث یگانہ، استاذ العلماء ہونے والا تھا۔ الف۔ با۔ پڑھنے بیٹھا۔ سیرۃً و صورۃً نہایت مقدس اور بہت معمر بزرگ میاں جی منگلوری صاحب سے قرآن مجید کا اکثر حصہ پڑھا اور کسی قدر میاں جی مولوی عبد اللطیف صاحب سے اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی انہیں سے پڑھیں۔ اس کے بعد فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی کتب عربی اپنے معزز چچا اور مشہور استاذ مولوی مہتاب علی صاحب سے تحصیل فرمائی۔ مولانا کے ہم عمر لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی مولانا کی طبعی صلاحیت ظاہر و ہویدا تھی۔ کوچہ گردی اور رزیل کھیلوں سے ہمیشہ اجتناب رہا ہے۔ البتہ سیر و شکار سے ایک مناسبت اور دلی شوق تھا۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد

حضرت مولانا کی عمر پندرہ سال کی تھی اور ابھی آپ قدوری اور تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دیوبند میں خدا تعالیٰ کے مقبول اور سراپا اخلاص بندوں کی تجویز سے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو ایک عربی مدرسہ کا اجراء ہوا اور مولانا ملا محمود صاحب دیوبندی (ایک بزرگ عالم جو اکثر علمائے دیوبند کے استاد ہیں) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کی تجویز سے پندرہ روپے ماہوار مشاہرہ پر مدرس مقرر ہوئے اور دیوبند کی مشہور مسجد چھتہ میں (جو ہمیشہ سے بزرگانِ دین کی قیام گاہ رہی ہے) تعلیم عربی شروع ہوئی۔

سبحان اللہ کیا مبارک ساعت تھی اور کیسے متبرک حضرات تھے کہ ان کی معمولی آواز پر پہلے ہی سال بنارس اور پنجاب اور کابل تک کے طلبہ جمع ہوگئے۔ اکیس طالب علموں کی جمعیت پر مدرسہ کا اجراء ہوا تھا اور اخیر سال اور وقت امتحان تک اٹھہتر آدمیوں کا اجتماع ہوگیا، اور حق تعالیٰ کی عنایت اور ربانیوں کی حسنِ نیت سے رفتہ رفتہ وہ مختصر مکتب عظیم الشان دارالعلوم ہوگیا۔ اطراف واکناف عالم کے لوگ کھنچ کر آگئے اور احادیث نبویہ اور علوم اسلامیہ کے چشمے جاری ہوگئے۔ والحمد للہ علیٰ ذلک۔

اس موجودہ زمانہ کی طرح اس وقت جابجا عربی مدارس جاری نہ تھے اور مدرسہ جاری کرنا ایک ایسا اہم و دشوار کام سمجھا جاتا تھا جس کا کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا اور اس کا جاری رہنا ایک امرِ محال نظر آتا تھا، چونکہ معتقد علیہ بے لوث بزرگوں اور مشہور مقتدا حضرات کی تجویز تھی اور اہلِ شہر نیک نیت و صاحب دین تھے سب نے امید سے بڑھ کر اعانت فرمائی اور رفتہ رفتہ اطلاعِ عام ہوئی۔ مالی امداد اور طلبہ کا رجوع یوماً فیوماً زائد ہوا۔ کارکن حضرات کی ہمت بندھی اور کام بحسنِ اسلوب جاری رہا۔

جب طلبہ کی کثرت ہوئی اور مسجد اور اس کے حجروں میں درس و تدریس و قیام طلبہ کی گنجائش دشوار ہوگئی تو ایک مکان متصل مسجد قاضی کرایہ پر لیا گیا، اور ۱۲۹۱ھ کے آخر میں مدرسہ کے لئے تعمیر مکان کی تجویز ہو کر انتظام و اہتمام اور چندہ شروع ہوا۔

اور ۱۲۹۳ء میں مبارک ہاتھوں سے وسیع پیمانہ پر بنیاد رکھی گئی اور بتدریج ترقی ہو کر بفضلہ تعالیٰ آج ایک اسلامی یادگار اور مسلمانوں کے لئے قابلِ فخر عمارت موجود ہے بزرگوں کی برکت سے مدرسہ میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی - مدرسین عربی میں اضافہ کیا گیا اور فارسی وقرآن شریف کا بھی مستقل مدرس رکھ کر انتظام کیا گیا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی ابن مولانا مملوک علی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جو اجمیر میں سو روپیہ مشاہرہ پر مدرس رہ چکے تھے اور پھر بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو چکے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے ارشاد سے اس خدمت کو ایک اسلامی خدمت سمجھ کر اواخر ۱۲۸۳ھ میں تشریف لائے اور نہایت قلیل مشاہرہ بیس روپے (کچھ عرصہ کے بعد تیس روپیہ) پر صدر مدرس قرار پائے - (مولانا موصوف ایک جامع العلوم و الفنون صاحب قوت قدسیہ بزرگ مشاہیر زمانہ میں سے تھے - آپ کے وجود باوجود سے مدرسہ دیوبند میں ایک روحِ تازہ آگئی، اور مدرسہ اور طلبہ کو قابل یادگار فیوض و برکات حاصل ہوئے ۱۳۰۲ھ میں مرض ہیضہ اپنے وطن نانوتہ ضلع سہارنپور میں درجہ شہادت حاصل فرمایا (رحمۃ اللہ علیہ)

ہمارے حضرت مولانا اجرائے مدرسہ کے بعد مدرسہ کے سابقین اوّلین طلبہ میں داخل ہوئے ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنز الدقائق، میبذی، مختصر معانی وغیرہ پڑھ کر سالانہ امتحان دیا اور آئندہ سال ہدایہ، مشکوٰۃ شریف، مقامات وغیرہ میں امتحان دئے - ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ استاذ حجۃ اللہ البالغہ مولانا محمد قاسم صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) سے شروع کی - مولانا ممدوح میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے - پھر مطبع دہلی منتقل ہو گیا تو مولانا ممدوح بھی دہلی مقیم ہوئے اور کبھی کبھی دیوبند اور اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لیجاکر مقیم رہتے - حضرت مولانا نے ان سب مقامات میں اکثر اپنے باکمال استاد کے ساتھ رہ کر دل وجان سے قابلِ رشک خدمت کر کے سعادت حاصل کی اور سفر و حضر میں سلسلۂ درس جاری رکھ کر استاد کی شفقت اور اپنی ذکاوت سے بکمالِ

تحقیق کتابیں پڑھیں۔

مولانا کی خدمت میں سبق پڑھنا کچھ آسان کام نہ تھا عبارت میں غلطی کرنا یا ترجمہ سمجھنے کے خیال سے ٹھہرنا تو گویا گناہ کبیرہ تھا۔ اس قسم کے امور اور بے موقع سوال سے مولانا مکدّر ہو جاتے اور سبق کا لطف ہی جاتا رہتا۔ جو شخص ذہین و مستعد ہوتا اور اصل کتاب کو پہلے سے سمجھا ہُوا ہوتا، وُہ مولانا کے مضامین سمجھنے کی اُمید کر سکتا تھا۔ اچھے اچھے ذی استعداد مولوی اس شرط پر شریک کئے جاتے تھے کہ صرف سُنتے رہیں، عبارت پڑھنے یا کچھ دریافت کرنے کا حق نہ ہوگا۔ لوگ خُوشی سے قبُول کرتے اور حاضر ہوتے۔

مولانا کا طرز ہی جُدا تھا حدیث ہو یا منطق، کلام ہو یا معانی، ہر فن کے متعلق عجیب و غریب تحقیقات بیان فرماتے جس سے ہر مسئلہ کی انتہائی تحقیق اور اختلافات کی تطبیق بدیہی اور مشاہدہ کے طور پر ہو جاتی تھی۔ اور اس قسم کے مضامین بیان فرماتے کہ نہ کسی کے خیال میں آتے تھے نہ کسی نے سُنے۔

حضرت کو قدرتی طور پر سعادتِ ازلی سے مولانا کے مضامین سے خاص مناسبت تھی اور اسی کے ساتھ طبع سلیم، ذہن رسا، حافظہ قوی، یہ سب وجوہ مزید شفقت کا باعث تھیں اور سب سے بڑھ کر مولانا کی بصیرت اور نور فراست جس سے نظر آ رہا تھا کہ یہی شخص کمالاتِ قاسمی کا آئینہ ہوگا اور علوم انبیا کا وارث۔

اسی طرح رفتہ رفتہ ۱۲۸۹ھ تک حضرت نے تمام صحاحِ ستّہ اور دیگر فنون کی اعلیٰ کتابیں مولانا کی خدمت میں ختم فرمائیں اور اسی زمانہ میں باوقاتِ مختلفہ ادب کی بعض کتب اپنے والد ماجد سے اور حساب وغیرہ دیگر فنون کی کتابیں مدرسہ میں پڑھ کر علوم عقلیہ و نقلیہ میں اعلیٰ استعداد حاصل کر کے فارغ التحصیل ہو گئے اور بطور معین المدرسین درس دینے لگے۔

۱۹ ذی قعدہ سنہ ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ کے جلسہ دستار بندی اور اہل اسلام کے مجمع عام میں (بہمراہی مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ و مولانا عبد الحق صاحب پوُری سلمہ وغیرہ) سند فراغ اور دستارِ فضیلت اکابر علماء اور خیارِ عباد اللہ کے دستِ حق پرست سے عطا ہوئی۔

تعلیم و تدریس، خدمتِ علم، واشاعتِ حدیث

حضرت مولانا تحصیل علوم سے فراغت پانے سے پہلے ہی ۸۹،۸۸ ۱۲ھ میں معین المدرسین کی حیثیت سے مختلف کتب کی تعلیم دے رہے تھے اور فراغ تحصیل کے بعد تو باقاعدہ مدرسین کی فہرست میں شمار ہونے لگے تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں جبکہ حضرت مولانا کے علاوہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اوّل اور مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس دوم اور مولانا ملاّ محمود صاحب مدرس سوم کارِ تعلیم کر رہے تھے۔ روزافزوں ترقی اور کثرت کارِ تعلیم کی وجہ سے دارالعلوم کے درجۂ عربی میں ایک چہارم مدرس تنخواہ دار کی ضرورت اور وسعت منتظمین دارالعلوم نے محسوس کی۔ چند ذی استعداد طلبہ جو اسی زمانہ میں فارغ التحصیل ہوئے تھے، ان با اخلاص منتظمین کے پیش نظر تھے پہلے اور بعض طلبہ کو منتخب کرنے کا ارادہ ہوا جو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں محنت اور شوق کے اعتبار سے مولانا سے بھی فائق نظر آتے تھے لیکن اس زمانہ کے مقدس مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جن کا سینہ نورِ معرفت سے معمور تھا اپنی فراستِ صادقہ سے نظرِ انتخاب حضرت مولانا پر ڈالی، اور مولانا کے والد ماجد سے ذکر کیا۔

آپ کے والد ماجد (رحمہم اللہ تعالیٰ) کو چونکہ خدا تعالیٰ نے وسعت اموال عطا فرمائی تھی اور طبیعت نہایت شریف و غیور واقع ہوئی تھی۔ اس لئے یہ گوارا نہ ہوتا تھا کہ ان کے فرزند مدرسہ سے کچھ معاوضہ لے کر خدمت کریں۔ لیکن دوسرے بزرگان مدرسہ کو اسی میں بہت سے مصالح پیش نظر تھے اس لئے ان سب بزرگوں کے ادب کو ملحوظ رکھ کر خاموش ہوئے اور حضرت مولانا ۱۲۹۲ھ میں بمشاہرہ پندرہ روپے ماہوار مدرس مقرر ہوئے۔

مولانا اگرچہ درجہ چہارم کے مدرس تھے اور خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ "ابتداء میں قطبی

اور فدوزی پڑھا لینے کو بھی غنیمت سمجھتا تھا ۔ لیکن طلبہ پہلے ہی سے آپ سے بڑی کتابیں پڑھ رہے تھے اور اب رفتہ رفتہ آپ کی علمی استعداد اور خدا داد ذہانت ظاہر ہونے لگی اور اُوپر کے درجہ کی کتابیں بھی حسب موقعہ آپ کے درس میں آنے لگیں چنانچہ ۱۲۹۳ھ میں آپ صحاح ستہ کی نہایت مشکل اور اہم کتاب ترمذی شریف اور مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ وغیرہ نو کتابوں کے اسباق روزانہ بلے تکلف پڑھایا کرتے تھے اور ۱۲۹۵ھ میں نو صحاح ستہ کی دیگر کتب کے علاوہ سب سے بڑی اور افضل کتاب اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف بھی آپ نے پڑھائی۔

حج بیت اللہ کو روانگی

حضرت کے باضابطہ تقرر کو ابھی تیسرا ہی سال تھا کہ شوال ۱۲۹۴ھ میں بزرگانِ ہندوستان کے قافلے نے بیت اللہ کا قصد کیا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ جیسے بقول مقبول حضرات سالار قافلہ ہوں تو قافلہ کی کیفیت کا کیا پوچھنا ۔ صدہا دیندار مسلمان مفلس و تونگر ہمراہ ہو گئے ۔ حضرت مولینا محمد مظہر صاحب (جن کے نام پر سہارنپور کا اسلامیہ مدرسہ مظاہر علوم مشہور ہے) ان کے بھائی مولانا محمد منیر۔ مولانا محمد حسین صاحب متوفی الہ آبادی اور بہت منتخب بزرگانِ دین شریکِ قافلہ تھے اور مدرسہ دیوبند تو گویا بالکل خالی ہو گیا۔ اس کے دونوں سرپرست تو سالار قافلہ ہی تھے ۔ مہتمم صاحب یعنی حضرت مولینا رفیع الدین صاحب اور مدرس اوّل حضرت مولانا محمد یعقوب بھی تشریف لے گئے اور فخر اکابر حضرت مولانا بھی زیارت حرمین کے شوق اور خدمت اُستاد کی آرزو میں ہمراہ ہوئے اور ہندوستان سے ایسا مقدس مجمع اور مشہور و معروف قافلہ روانہ ہوا کہ اس کی نظیر نہ گزشتہ زمانہ میں مل سکتی ہے نہ آئندہ اُمید ہے جس اسٹیشن پر گاڑی پہنچتی شوقِ زیارت میں اہل اسلام کا ہجوم نظر آتا ۔ جتنی دیر گاڑی ٹھہرتی مصافحہ اور دست بوسی کی عزّت حاصل ہوتی رہتی ۔

بمبئی پہنچ کر تقریباً بیس روز جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔ پھر سب قافلہ جہاز میں سوار ہو کر تیرہ روز میں بخیریت جدّہ پہنچ گیا۔ وہاں سے اونٹ کی سواری پر مکّہ معظّمہ پہنچ کر طواف و زیارت سے مشرف ہوئے اور شیخ العرب و العجم مرشد العلماء حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (قدس سرہٗ) کے دیدارِ پُرانوار کی سعادت حاصل فرمائی اور بعد فراغت احکام حج مدینہ منورہ کا قصد فرمایا اور خُدا تعالیٰ کی عنایت سے بیس روز کا قیام نصیب ہُوا۔

استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ مہاجر مدنی تشریف فرما تھے سب حضرات ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جناب ممدوح بھی کمال شفقت اور گوناگوں عنایت فرماتے۔ اور باوجُود انتہائی کم گوئی کے باخلاق و عنایات حسب درجات و مراتب گفتگو فرماتے۔ مگر ہمارے حضرت کا کمال دیکھیئے کہ استاذ (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی موجودگی میں شاہ صاحب سے اجازت و سند حدیث لینا خلاف نیاز مندی سمجھا۔ لیکن واپسی کے قریب جب حضرت استاذ ہی نے تحریک فرمائی تو حضرت شاہ صاحب نے بکمال بشاشت ہمارے مولانا کو سندِ حدیث عنایت فرمائی۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر ایک ماہ قیام ہُوا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی استدعاءِ خفیّہ پر شیخ العرب والعجم نے ہمارے حضرت مولانا کو نہ صرف شرفِ بیعت عطا فرمایا بلکہ خلافت و اجازتِ بیعت سے بھی ممتاز کیا۔ بعض بزرگوں کے بیان سے معلوم ہُوا کہ اخیر زمانہ میں اجازت نامہ تحریر فرما کر ہندوستان روانہ فرما دیا تھا۔ لیکن ان امور میں باہم تعارض نہیں۔ جب بعض رفقاء کو مصارف کی دشواری ہونے لگی تو باشارۂ حضرت شیخ العرب والعجم سب نے ارادۂ واپسی فرمایا اور جدّہ پہنچ کر کلفتِ انتظار سے بچنے کے لئے جلد ایک جہاز میں سوار ہو گئے جس میں مسافر کثیر اور جگہ نہایت قلیل اور تنگ تھی باوجود باہمی مروّت و ایثار کے سب کو نہایت دقّت اور تکلیف پیش آئی۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کو مقامات مقدسہ اور اپنے

بزرگوں کی جدائی کی کلفت اور خانہ کعبہ کے ادب واحترام کی وجہ سے دور تک پا پیادہ چلنے کی تکلیف سے ہدہ[1] پہنچ کر بخار ہو گیا اور پھر جہاز کی تنگی اور کشمکش سے اس پر اضافہ ہوا۔ یعنی سوار ہونے کے تیسرے دن مولانا ممدوح کو بخار و دورۂ صفرا پیش آیا اور رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھا کہ سب مایوس ہو گئے چونکہ جہاز میں وبا تھی۔ دو تین آدمی روزانہ نذر اجل ہو جاتے تھے اسلئے اور زیادہ خطرہ تھا۔ نہ دوا تھی نہ علاج نہ جائے راحت و سکون۔ تاہم حضرت مولانا نے خوب حق خدمت ادا کیا۔ شدت مرض میں تمام تمام رات بیدار رہے۔ عدن پہنچے تو لیموں خریدے کہیں سے کنین کہیں سے گلاب دستیاب کر کے کھلایا پلایا۔ مولانا کو کسی قدر افاقہ ہوا۔ تو قافلہ کی جان میں جان آئی۔ چودھویں روز جہاز بمبئی پہنچا۔ دو ایک روز قیام کر کے حضرت مولانا اپنے استاذ اور پیر و مرشد کو ان کے وطن قصبۂ نانوتہ میں پہنچا کر ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں دیوبند واپس آتے۔

مدرسہ میں حضرت مولانا کی جگہ تقریباً چھ ماہ تک مولانا عبد العلی صاحب نے کام کیا اور واپسیٔ سفر کے بعد حضرت مولانا بدستور سابق درس و تدریس میں مصروف ہو گئے اور چونکہ کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دیوبند ہی قیام فرمالیا اس لئے استفادۂ کمالات استاذ کے لئے حضرت مولانا کی دلچسپی مشاغل علمیہ میں اور بھی زیادہ ہو گئی۔

اس زمانہ میں حضرت مولانا دن رات محنت شاقہ میں مصروف رہتے۔ نو نو اور دس دس اسباق مطالعہ اور محنت[2] سے پڑھاتے۔ اپنی کتاب "ایضاح الادلہ" تحریر

---

[1] جدہ اور مکہ معظمہ کا درمیانی پڑاؤ ہے بعض اس کو ہدّہ کہتے ہیں۔

[2] اسی سال کے اخیر میں حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ تحصیل علم کے لئے دیوبند تشریف لائے اور منجملہ اسباق کے ملاحسن اور معانی حضرت مولانا کے متعلق ہوئے اور اخیر زمانۂ تحصیل تک ہدایہ، آخیرین، حمد اللہ، میر زاہد، ملا جلال میر زاہد رسالہ اور چند کتب حدیث حضرت سے پڑھی ۱۲۔

فرماتے، اور حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو سُنا کر صلہ خوشنودی و تحسین حاصل فرماتے، اور شب کا بہت سا حصہ علاوہ کتب بینی کے عبادت و درود و وظائف میں گذارتے۔

حضرت مولانا ضعیف الجثہ تھے لیکن قوی الہمت ہونے کے علاوہ حق تعالیٰ نے آپ کے قویٰ بھی نہایت مضبوط بنائے تھے کہ اس قدر محنت برداشت کرنے کے بعد ہشاش بشاش رہتے اور استاذ معظم کی خدمت میں بھی قصور نہ ہوتا جو واپسی حج کے بعد اکثر مریض رہتے تھے۔

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کی وفات

حضرت مولانا اپنے ان مشاغل حسنہ میں جن کو وہ ذخیرۂ آخرت سمجھتے تھے نہایت محویت کے ساتھ مشغول تھے کہ ناگاہ ۱۲۹۷ھ میں واقعۂ ہائلہ اور صدمۂ جانفرسا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کی وفات کا پیش آیا۔ مولانا ممدوح واپسی سفرِ حج میں مریض ہوکر صحتیاب ہوگئے تھے لیکن کھانسی کی شکایت رہ گئی تھی اور کبھی کبھی تنفس کا دورہ ہوجاتا تھا۔ ۱۲۹۷ھ میں ضیق النفس کے یہ دَورے کئی مرتبہ پڑے جن سے جناب ممدوح ضعیف ہوگئے سہارنپور میں آپ کے استاد مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری (رحمۃ اللہ علیہ) کو اوّل فالج ہُوا تھا اور پھر بخار اور ضعف میں مبتلا تھے مولانا ان کی عیادت کے لئے سہارنپور تشریف لے گئے اور ان کے ارشاد سے چودہ روز وہاں قیام فرمایا وہیں مولانا کو تنفس کا شدید دورہ واقع ہُوا اور ساتھ ہی ذات الجنب بھی۔

دیوبند سے خدام خبر سنکر سراسیمہ و پریشان ہوکر رہ گئے اور مولانا کو ریل میں لے آئے، تکلیف زیادہ تھی۔ فصد وغیرہ، مختلف علاج ہوئے کچھ صحت کی صورت ہوگئی مگر چونکہ ضعف بدرجہ غایت تھا۔ اس لئے پھر حرارت شدید ہوگئی جس میں کبھی کبھی غفلت ہوجاتی تھی، سہ شنبہ کے روز تشنج کی کیفیت پیدا ہوئی اور گفتگو

بالکل موقوف ہوگئی۔ پنجشنبہ (۴ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ) کو دو پہر تک یہی کیفیت رہی۔ بعد نماز ظہر بلا کسی خاص کرب اور بے چینی کے یکایک روح مبارک پرواز کرگئی۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

شہر اور مدرسہ میں عموماً اور حضرت کے خدام وتلامذہ پر خصوصاً ایک قیامت برپا ہوگئی جس کا بیان دشوار اور باعث طول ہے طریق تسلیم و رضا وصبر وشکر کرکے غسل وکفن میں تعجیل کی گئی۔ حضرت کے جاں نثار خادم شیخ دیوبند حکیم مشتاق احمد صاحب رئیس نے شہر سے باہر مگر مدرسہ سے قریب ایک قطعہ اپنی مملوک زمین کا اسی وقت وقف کیا (جو آج کل مرقد علما۔ وطلبا وجوارِ صالحین بنا ہوا ہے) اور بعد نماز مغرب راضی بقضا ہوکر عظیم الشان اسلامی مجمع نے اس خزانۂ علوم وکمالات کو سپرد خاک کیا۔

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کی وفات

تیسرے دن بروز شنبہ سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث (قدس سرہٗ) نے بھی وفات پائی اور صرف ایک دن کے فاصلہ سے زمانہ کے دو بہترین محدثوں سے دنیا خالی ہوگئی، اور طبقۂ صلحا اور اہل علم پر غم پر غم اور صدمہ پر صدمہ پڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

ان حضرات کی وفات پر بہت لوگوں نے مرثیے کہے، تاریخیں لکھیں ایک صاحب نے "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا دَائِمًا"، مادۂ تاریخ نکالا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے "کیا چراغ گُل ہوا" اور "مصیبت پر آئی مصیبت" سے تاریخ نکالی۔ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی مدرسہ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہم کے والد ماجد خاقانی ہند مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدیم رکن مدرسہ نے ایک دلگداز طویل مرثیہ نظم فرمایا جس کے چار شعر یہ ہیں ؎

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدیٰ کی رحلت کا	کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر در و نہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا	مثالِ خم فلک جام واژگونہ ہے

کچھ اِک زمین ہی نہیں رنگ زرد اس غم سے　　لباس چرخ بھی ماتم میں نیلگوں نہ ہے

سنِ وفات کہے فضل نے زروئے الم

وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے

اور حسان الہند مولانا ذوالفقار علی صاحب نے اس واقعہ ناجعہ میں بزبان عربی اس طرح اظہارِ درد کیا ؎

یاقاسم الخیر مَن للعلم والدین　　اذا ارتحلت وارشادٍ وتلقین

یاقاسم الخیر من للطارقین ومن　　للضارعین ومکروب ومحزون

یاقاسم الخیر اسمع من لکربتنا　　یاقاصم الصیر قل من للمساکین

من للمدارس من للوعظ من لهدیً　　من للنکات وتوضیح وتبیین

من للشریعة اومن للطریقة او　　من للحقیقة اذا رسیت فی الطین

رحلت عنا ولم یوجد عدیلك فی ال　　علوم والفضل من عرب الی صین

یاعین جودی بدمعٍ غیر منقطعٍ　　علی الذی جلَّ من مدحٍ وتابین

بحر العلوم امام الکون اکرمه　　مبارك الاسم والزیتون والتین

لقد مضیٰ صاحبی من فی مصیبته　　برئتُ من ذکرا سلاءٍ وتسکین

من لی بصدرٍ عن الاحزان منقطع　　من لی بقلبٍ بصبرٍ غیر مقرون

وهون البینَ اِنّی لاحقٌ بکمٗ　　اذا رتحلتم وان اُحیی الی حین

سقی الالٰه ضریحاً انت ساکنهٗ

ویرحم الله من یمد دبتامین

شیخ الہند پر حضرت نانوتویؒ کی وفات کا اثر

مخدوم استاذ کی وفات کے حادثہ نے حضرت مولانا کو بالکل پژمردہ کر دیا تعلیم و تعلم سے دل سرد ہو گیا۔ رنج تو تھا ہی اس کے ساتھ یہ خیال بھی دلنشین ہو گیا تھا جس کو کبھی خود ہی اظہار فرمایا کرتے تھے۔ کہ ہمارے مشاغل علمی اور درس و تدریس صرف اس

لئے تھے کہ کچھ استعداد و قابلیت پیدا ہو جائے اور حضرت کے مضامین و ارشادات کو سمجھنے لگیں۔ اب کہ حضرت ہی رخصت ہو گئے۔ اس قیل و قال اور بے نتیجہ اشغال سے کیا فائدہ۔ فکر معاش نے ایسا ہی تنگ کیا تو گھاس کھود کر بسر کر لیں گے۔"

حضرت مولانا نے مدرسہ آنا بھی چھوڑ دیا اور اپنے مکان میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی۔ حضرت اس عزم پر مضبوطی سے قائم تھے، مگر حق تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ سے احادیث نبوی کی نشر و اشاعت اور علوم دینیہ کی خدمت اور فیوض قاسمیہ کی افادت مقدر فرمائی تھی۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ (قدس سرہٗ) کو خود بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا صدمہ کچھ کم نہ تھا۔ کیونکہ آپ سے زیادہ مولانا کا قدر شناس کون ہو سکتا ہے لیکن حوادث و نوازل کے وقت اہل عزم و ثبات خود بھی سنبھلتے ہیں اور دوسروں کو بھی سنبھالتے ہیں اور حق تعالیٰ کے علم میں جو امر مقدر ہوتا ہے باوجود ظاہری نامساعدت کے اس کے لئے ایسے ہی اسباب پیدا کر دیتا ہے۔

مولانا نے ایک دو مرتبہ سمجھایا اور تیسری مرتبہ اپنے ساتھ مدرسہ میں لے آئے۔ زاویہ نشینی اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں جو کچھ فرق ہے وہ حضرت بھی خوب سمجھے ہوئے تھے مگر دوسری حالت کا غلبہ تفرید و تجرد کے فوائد کو ترجیح دیتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ کے ارشاد نے الہام ربانی اور لطیفۂ غیبی کا کام دیا۔ بزرگوں کی عظمت اور ان کے اوامر کی وقعت حضرت کے قلب میں ہمیشہ بدرجۂ کامل رہی ہے۔ مولانا ممدوح کے ارشاد کی تعلیم کی اور بچشم گریاں درس جاری فرما دیا۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے دوسرے شاگرد مولانا سید احمد حسین صاحب امروہی (رحمۃ اللہ علیہ) بھی ترکِ تدریس میں حضرت مولانا کے ہم خیال اور شریکِ حال تھے ایک ماہ تک مغموم و محزون اور شغل تعلیم سے کنارہ کش رہے لیکن اہل دیوبند کے اصرار خصوصاً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے ارشاد سے مجبور ہو کر بدستور سابق مراد آباد کی مسجد شاہی کے مدرسہ کی مدرسی میں مشغول ہو گئے۔

حضرت مولانا نے رفتہ رفتہ سرگرمی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں خدمتِ تعلیم کو

انجام دینا شروع کیا۔ درس و تدریس کی مصروفیت کے ساتھ عبادتِ الٰہی کا شغل بھی جاری تھا۔ عشاء کے بعد بہت دیر تک کتب بینی کرنا اور پھر تھوڑی دیر آرام کر کے اپنے مولیٰ کی عبادت اور بطرز مسنون ادائے تہجد میں مشغول ہونا اور بعد تہجد کے طلبہ کی ایک جماعت کو سبق پڑھانا اور پھر صلوٰۃ الفجر کے بعد سے تمام دن تعلیم میں مصروف رہنا اس زمانہ میں آپ کا معمول تھا۔

حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نانوتوی کی وفات

ربیع الاول ۱۳۰۲ھ میں دارالعلوم کو حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب مدرس اوّل کی وفات کا سخت صدمہ پیش آیا۔ مولانا ممدوحؒ خود بھی ایک نمونۂ سلف، جامع العلوم، صاحب شریعت و طریقت بزرگ تھے، اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ہمعصر اور جانشین سمجھے جاتے تھے مدرسہ کے سرپرست اگرچہ مولانا رشید احمد صاحب قرار پائے تھے۔

مگر چونکہ آپ کا قیام اپنے وطن گنگوہ میں تھا۔ اس لئے ہر معاملہ میں شریک حال نہ رہ سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوبؒ صاحب کی ذات بابرکات سے کُلّی و جزوی ہر قسم کے امور میں نہایت قوی اعانت پہنچتی تھی اور ہر قسم کے فیوض و برکات سے مدرسہ متمتع ہوتا رہتا تھا ادھر یہ کہ تمام علما، عصر مولانا کے والد ماجد مولینا مملوک علی صاحبؒ کے خوشہ چین اور شاگرد تھے ایسے قوی الاثر جامع الصفات عالم کے سایہ سے محروم ہو جانا دارالعلوم کے لئے کوئی معمولی صدمہ نہ تھا، لیکن سوائے صبر و تسلیم چارۂ کار کچھ نہ تھا۔

اس حادثہ کے بعد مولانا سید احمد صاحب دہلوی جو فنون ریاضیہ میں خصوصیت کے ساتھ امام کہلانے کے مستحق تھے۔ بمشاہرہ چالیس روپیہ مدرس اوّل مقرر ہوئے مولانا ملا محمودؒ صاحب دیوبندی پینتیس روپیہ پر مدرس دوم اور حضرت مولانا تیس روپیہ مشاہرہ پر مدرس سوم اور مولینا عبدالعلی صاحب مدرس چہارم۔

ملا محمود رح کی وفات

اسی تغیر سے تقریباً دو ہی سال کے بعد دارالعلوم کے سب سے قدیم اور بافیض عالم ملا محمود صاحب کی وفات ہوگئی اور حضرت مولانا انہیں کے مشاہرہ پہ مدرس دوم ہوگئے۔ ترقی مدارج اور اضافہ مشاہرہ سے حضرت مولانا کے کار تعلیم پہ کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا حضرت بخلوص و للہیت تمام علوم کی کتابیں پڑھا رہے تھے اور طلبہ نہایت گرویدگی کے ساتھ دن رات میں جب موقع ملتا تھا۔ حضرت کے فیوض حاصل کرتے رہتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں صدر مدرس کی حیثیت سے تقرر

۱۳۰۵ھ میں مولانا سید احمد صاحب مدرس اول اپنی ذاتی ضروریات کے خیال اور بعض مصالح سے بڑی تنخواہ پر بھوپال تشریف لے گئے۔ تعلیم تو حضرت پہلے ہی سے بڑی جماعتوں کو دے رہے تھے اور جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اب سے بارہ سال پہلے ۱۲۹۲ھ ۱۲۹۵ھ سے کتب صحاح و بخاری شریف و دیگر علوم کی انتہائی درسیات پڑھا رہے تھے۔ اب آپ مولانا سید احمد صاحب کے مشاہرہ پہ باتفاق آراء اکابر و اصاغر مدرس اول نامزد ہوئے۔ اس وقت سے آخر عمر یعنی ۱۳۳۹ھ تک تینتیس ۳۳ سال حضرت مولانا صدر مدرس رہے اور جو کچھ ترقی آپ کی ذات بابرکات سے مدرسہ کو ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے مولانا کو کبھی ترتیب درجات اور مقدار مشاہرات پر نظر نہیں ہوئی اور جیسا کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہے وہ ہمیشہ دارالعلوم کی خدمت کو خدا تعالیٰ کا کام اور دینی فرض سمجھ کر بجا لاتے رہے مشاہرہ قبول فرماتے تھے۔ مگر بضرورت اور بکراہت، اگر وہ متاع دنیا کی طلب فرماتے تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرت کو سر آنکھوں پہ بٹھلاتے اور صدہا روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت

میں پیش کرتے لیکن آپ نے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے استاذ قدس سرہٗ کے لگائے ہوئے باغ دارالعلوم دیوبند کی سرسبزی و شادابی کو مطمح نظر رکھا اور اسی دینی خدمت میں عمر تمام کر دی۔ دارالعلوم دیوبند کے مخالفوں نے بدنیتی سے موقع بموقع دل میں رنجش ڈال کر علیحدگی پر آمادہ کرنا چاہا مگر ناکامیاب رہے۔ پیرجی عبدالرزاق صاحب گنگوہی مہتمم مدارس اسلامیہ دہلی نے محبت اور حسن نیت سے کوئی تحریک کا موقع نہ چھوڑا مگر دل میں یہ حسرت ہی لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ حضرت دہلی قیام فرما کر فیوض جاری فرمائیں اور بجا طور پر شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کی نیابت کا حق ادا فرمائیں۔

سنہ ۱۳۱۲ھ میں جب بوجہ گرانی دیگر مدرسین کے مشاہروں میں اضافہ ہوا تو بحکم مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ آپ کا مشاہرہ پچاس روپیہ ہو گیا۔ آپ نے خاموشی سے قبول فرما لیا۔ دو مرتبہ استاذ شفیق کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں "محمود حسن کب تک مشاہرہ لیتے رہو گے"۔ دونوں مرتبہ پورا عزم مشاہرہ چھوڑ دینے کا فرمایا۔ لیکن حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ادب سے مجبور رہتے، اجازت نہ دی، بلکہ ہنس کر فرمایا کہ "نہیں، اُن کو کہنے دو، ہرگز نہ چھوڑو"۔ مگر جب حضرت مولانا ممدوح کی وفات ہو گئی اور ماتحت مدرسین کے اضافہ کے ساتھ آپ کے چھہتر روپیہ مقرر ہوئے تو آپ نے اضافہ بالکل قبول نہ فرمایا، اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہرہ لینا بالکل بند کر دیا۔ پھر بھی اسی پابندی اور دلسوزی سے درس دیتے رہے۔

حضرات منتظمین کی جانفشانی اور تدابیر حسنہ اور مدافعت اعداء کو بھول جانا کفران نعمت ہے اور مناسب مواقع پر اس کا مفصل اظہار واجب و لازم۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت مولانا کی معنوی برکت کے ساتھ ظاہری مستعدی و تندہی و دلسوزی نے بھی مدرسہ کے لئے باران رحمت کا کام کیا اور مدرسۂ دیوبند کو ایک عظیم الشان دارالعلوم کی حیثیت تک پہنچا دیا۔ صبح کی نماز ادا فرما کر درس کے لئے آ جاتے کبھی پیشاب یا وضو کے لئے درمیان میں اُٹھتے تو مضائقہ نہیں ورنہ متصل درس دیتے ہوئے گیارہ بارہ

بج جاتے تھے اور ظہر کے بعد پھر یہی مشغلہ موجود تھا۔

حضرت مولانا تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، منطق، معانی کی کتب محنت اور شوق سے بے تکلف پڑھاتے تھے اور جیسا کہ پہلے تحریر ہوا ہے ابتداء میں تو بہت ہی زیادہ مشغولیت و مشقت برداشت فرماتے تھے مگر آخر میں بھی ۱۳۲۰ھ تک پانچ چھ گھنٹہ روزانہ درس دیتے تھے۔ اس زمانہ کے بعد کچھ بوجہ ضعف و امراض کے اور نیز اس لئے کہ حضرت کے ممتاز تلامذہ مولانا انور شاہ صاحبؒ، مولانا حسین احمد صاحبؒ، مولانا شبیر احمد صاحبؒ مدرسہ میں موجود تھے آپ حسب ضرورت روزانہ دو یا تین گھنٹہ درس دیتے تھے۔ اور ترمذی شریف و بخاری شریف تقریباً ساڑھے نو ماہ میں بہ طمانیت تمام کرا دیتے تھے۔

شیخ الہندؒ کا فیض

حضرت نے ۱۲۸۹ھ سے بحیثیت معین المدرسین دارالعلوم میں کار تعلیم شروع فرما دیا تھا۔ اور ۱۲۹۲ھ میں آپ باقاعدہ مدرس ہو گئے تھے اس لحاظ سے حضرت نے چوالیس سال کامل خدمتِ تعلیم میں بسر فرمائے اور ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۳۳ھ تک تو اڑتیس سال کامل علی الاتصال حضرت نے علم دین کی اشاعت فرمائی۔ اس درمیان میں حضرت نے سوائے معمولی چند روزہ سفروں کے نہ کوئی طویل سفر فرمایا نہ اور کوئی ایسا شغل پیش آیا۔ نہ کوئی ایسا مرض لاحق ہوا جس سے کار تعلیم میں دو چار ماہ کا طویل حرج واقع ہوتا۔ یہ نصف صدی کا زمانہ کچھ کم نہیں ہے۔ ہندوستان میں کیا ان آخری قرنوں میں دنیا میں ایسے بہت کم علماء شمار ہو سکتے ہیں۔ جنہوں نے اس قدر طویل زمانہ افادۂ تلامذہ اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں گزارا ہو۔

حضرت سے چونکہ خدا تعالیٰ کو یہ علمی کام لینا تھا اور فیوض جاری کرانے منظور تھے اس لئے ظاہری مختصر قد و قامت اور ضعیف بدن کے ساتھ اندرونی قویٰ نہایت مضبوط بنائے تھے۔ باوجود خدمت تعلیم میں اس قدر محنت کرنے کے اور باوصف شب بیداری

اور ذکر اللہ کے نہ ضعفِ دماغ کی شکایت رہتی تھی نہ ضعف بصر کا خلل۔ نہ دواؤں کے محتاج تھے نہ مقوّیات کے خواہاں معمولی سادہ غذا استعمال فرماتے تھے اور وہ بھی نہایت قلیل۔ اسی عرصہ میں تمام ہندوستان میں آپ کے علوم و کمال خصوصاً فن حدیث کے تبحّر اور مہارت کی دُنیا میں شہرت ہو گئی تھی اور جابجا آپ کے فیوض پھیل گئے تھے۔ ہر نواح میں آپ کے شاگرد یا شاگردوں سے فیض یافتہ عالم باعثِ اشاعت علوم و موجب ہدایت خلق اللہ بن گئے۔

دارالعلوم دیوبند میں ایک دو قدیم بزرگوں کے سوا تمام مدرس آپ کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں اور ہندوستان کی کوئی قابل اعتماد علمی درسگاہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں آپ کے بلاواسطہ یا بواسطہ شاگرد مسند درس پر متمکن نہ ہوں۔

کابل قندھار، بلخ، بخارا، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور یمن تک کے لوگ آپکے فیوض سے مالامال ہو کر گئے۔ مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری ایک باخدا عالم نمونۂ اتقیائے سلف اور مصداق علی دین العجائز نے مدینہ منورہ جاکر درس جاری فرمایا۔ ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مولانا صدیق احمد صاحب اسی مقدس دارالہجرت میں مخصوص طور پر اپنے مکان پر اور مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں اشاعت علم کرنے لگے اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا حسین احمد صاحب کا حلقۂ درس خاص مسجد نبوی میں سید العرب والعجم کے روضۂ منورہ کے سامنے ایسی عظمت و برکت سے جاری ہوا کہ بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ کے حلقے مختصر رہ گئے اور ہشرفاء مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولاد مولانا موصوف کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے لگے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

حضرت نے تمام عمر چٹائی پر بیٹھ کر درس دیا ہے اخیر میں مرض بواسیر کا عارضہ ہوا تو بعض مخلصین نے کمانی دار گدّہ بنوا کر رکھدیا تھا۔ اس پر بضرورت بیٹھتے تھے مگر کسی قدر گرانی و کراہت محسوس کر کے۔

حلقۂ درس کی خصوصیات

مولانا کا حلقۂ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا۔ دُوسرے مدارس کے فراغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالب علم نہایت مؤدب طریق سے حاضرِ خدمت رہتے اور حضرت کمال عظمت و وقار سے درس دیتے۔ اِدھر اُدھر کی فضول باتوں کا ذکر تک نہ تھا۔ دُوسروں کی تحقیر اپنی تعریف کا نام ونشان نہ تھا۔ ہنسی مذاق اور تفریح طبع یا جملے ذاتی حالات کا بیان بالکل مفقود۔ خطاب بالکل عام ہوتا تھا کسی کی خصوصیّت نہ تھی۔ کم سواد طالب علم قرأت کرنے سے خود ڈرتے تھے اور بے موقع سوال کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ مستعد طالب علم بار بار اور طرح طرح سے اپنے شکوک وشبہات پیش کرتے تھے۔ اس طرح کہ حلقۂ درس بالکل مجلس مناظرہ بن جاتی تھی۔ کبھی حضرت کے الزامی جواب طالب علم کو ساکت کر دیتے تھے اور کبھی جامع مانع تقریر شفاءٌ لما فی الصدور کا کام دیتی تھی۔ الزامی جواب میں ملکۂ تام تھا دو چار دفعہ اسی طرح ٹالتے رہتے۔ بہت رد و بدل کے ساتھ تحقیق شروع فرماتے اور اس خوبی اور قوتِ استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرح صدر ہو جاتا۔

بہت سے ذی استعداد ذہین وفطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اپنے شکوک وشبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی و مضامین عالیہ سنکر سرِ نیاز خم کرکے معترف ہوتے کہ یہ علم کسبی نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دُنیا میں نہیں ہے۔

حلقۂ درس دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ تحدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر۔ اور صحابہ وتابعین فقہاء ومجتہدین کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھی نہ منہ میں کف آتا تھا۔ نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی

بناتے تھے۔ نہایت سبک اور سہل الفاظ با محاورہ اردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دریا امنڈا آرہا ہے یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان ضعیف الجثہ مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا اور بار ہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا۔ مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز نہ ہیں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی لیکن ہزارہا سننے والے موجود ہیں کہ جب صدر درسگاہ نودرہ میں تقریر فرماتے تو (باوجود درجۂ قرآن مجید و مکتب فارسی کے بچوں کے شور وغل کے) مدرسہ کے دروازہ تک قابلِ فہم آواز آتی تھی۔

لہجہ میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا۔ چہرہ بنالینا یا آنسو بھر لانا حضرت کا کام نہ تھا لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا۔ بات دل نشین ہوجاتی تھی اور سننے والا یہی سمجھ کر اٹھتا تھا کہ جو فرمارہے ہیں حق ہے اس لئے بہت سے لوگ جو دور ہی دور سے دشمنوں کے افتراء کئے ہوئے عقائد فاسدہ سن کر بدعقیدہ ہوجاتے تھے اپنی اولاد و عزیزوں کے دیوبند آکر تحصیلِ علم کرنے میں اسی لئے مانع ہوتے تھے کہ یہ بھی اسی رنگ میں رنگے جائیں گے۔

استاد رحمۃ اللہ علیہ کے حقوق و دقائق نقل فرماتے اور اپنی تحقیقاتِ عجیبہ اور مضامینِ عالیہ سناتے مگر مفسرین و محدثین شراح و مصنفین کا ادب اس درجہ ملحوظ رکھتے تھے کہ کہیں شائبہ تنقیص بھی نہ آنے پاتا۔

مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ (رحمہم اللہ) بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل فرماتے۔ لیکن جب امام ابو حنیفہؒ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرہ پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجہ میں جوش پیدا ہوجاتا۔ دلیل پر دلیل شاہد پر شاہد۔ قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے تقریر کیا ہی نہ تھی، اور اس خوبی سے مذہب امام اعظمؒ کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع، اور

منصف المزاج لوٹ جاتے تھے ۔ دُور دُور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدعا ثابت فرماتے کہ بات دل میں اُترتی تھی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے ۔

بایں ہمہ ائمہ اسلام کا ادب واحترام ، اوران کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک جزو لاینفک ہوگیا تھا ۔ خود بھی ایسی ہی تقریریں فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ " مذاہب مجتہدین حق میں ہیں اور سب مستدل بالکتاب والسنۃ ۔ ان کی تنقیص موجب بدبختی اور سوء ادب باعث خسران "

بیشک حضرت رحمۃ اللہ مَن عَمِلَ بِمَا یَعلَم اَتَاہُ اللّٰہُ عِلمَ مَا لَم یَعلَم کے مصداق اوراس شعر کے محمل تھے ۔

بینی اندر خود علوم انبیا ۔۔۔ بے کتاب وبے معید واوستا

اس کے ساتھ ہی آپ نے نہایت محنت شاقہ اُٹھا کر اور بقول شخصے دودِ چراغ کھا کر کتب بینی اور مطالعہ کا نہایت زیادہ اہتمام فرمایا تھا خصوصاً شروح احادیث بکمال غور وفہم مطالعہ فرمائی اور بعض کو کئی مرتبہ دیکھنے کی نوبت آئی ایک مرتبہ فرمایا کہ ذرا عینی اُٹھا لاؤ ۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت بخاری کی شرح یا ہدایہ کی ۔ فرمایا اس کو تو کئی مرتبہ دیکھ چکا ، ہدایہ کی شرح لے آؤ ۔

لیکن حضرت صرف شراح کی تعلیم کے احاطہ میں محصور نہ تھے ، بلکہ وہ مضامین عجیب انہیں شروح وحواشی کے مطالعہ سے آپ کے ذہن مصفی میں آتے تھے جو دیدہ تھے نہ شنیدہ ۔ حضرت نے شروح احادیث کا عطر نکال کر رکھدیا ہے اور ہمارے فقہاء وشراح کے مجمل دلائل کو اس شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ باید وشاید ۔ محدثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں سے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص تعلق تھا ۔

امام بخاری رحؒ کے علوم اللہ تعالیٰ نے آپ پر کھول دیئے تھے یہاں تک کہ نظر بندی مالٹا کی یکسوئی میں آپ نے خود بخود اس داعیۂ الٰہی سے مجبور ہو کر تراجم بخاری کے

متعلق تحریرات لکھنی شروع فرمائی تھی۔ بخاری کے متعلق کوئی شخص کچھ سوال کرتا تو خوش ہو جاتے اور بیان فرمانا شروع کر دیتے۔

امام مسلمؒ نے جو اپنی کتاب کے خطبہ میں امام بخاریؒ پر تعریض کر کے گرفت کی ہے اس پر فرمایا کرتے تھے کہ جب ملاقات ہوئی تو بخاری کے خادم و عقیدت مند ہو گئے کاش اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور امام بخاریؒ کی ملاقات ہو جاتی تو اپنے سب اعتراض واپس لے لیتے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے لئے حق تعالےٰ نے حضرت کو شرح صدر کر دیا تھا۔ اسی کا اثر طلبہ پر پڑتا تھا بمقتضائے آنچہ از دل خیزد در دل ریزد۔ وُہ دقیق فرق اور وُہ لطائف و رموز سناتے تھے کہ طالب علم بے ساختہ سبحان اللہ کہہ اُٹھتے۔ اگر امام صاحب کے مناقب بیان فرمانے لگتے تو ایک کے بعد دوسرا، دُوسرے کے بعد تیسرا بیان فرماتے چلے جاتے تھے۔ سلسلۂ کلام ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ مالٹا سے واپسی کے بعد ایک روز حسبِ عادت عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھے مجمع تھا۔ امام صاحب کا ذکر آگیا۔ پھر کیا تھا لطائف، دقائق، حالات، واقعات بیان ہونے لگے۔ اور جب تک مغرب کی اذان نہ ہو گئی سلسلہ ختم ہی نہ ہوا۔

سِلسلۂ اسناد

حضرت مولانا کا طرز تحدیث اور جمع بین اقوال الفقہا و الاحادیث بالکل وہی تھا جو ہندوستان کے نامی گرامی علمی خاندان حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (قدس سرہما) کا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اقوال کو نہایت اعتبار و اعتماد کے ساتھ نقل فرماتے اور نہایت ادب سے نام لیتے۔ آپ کی سندِ حدیث کا سلسلہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی پر منتہی ہوتا ہے آپ کے کمال تبحر پر نظر فرما کر اگرچہ مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہما نے بقاعدہ محدثین آپ کو اجازت حدیث

عطا فرمائی تھی لیکن درس و تدریس اور قرأت و تحدیث کے لحاظ سے آپ کی سندِ حدیث دو طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تک اور ان کے اساتذہ کرام کے ذریعہ سے محدثین مؤلفین کتب اور جناب سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

اوّل :- عن مولانا الشیخ محمد قاسم ، عن مولانا الشیخ عبد الغنی - عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق - عن مولانا الشاہ عبد العزیز - عن مولانا الشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ثانی :- عن مولانا الشیخ احمد علی السہارنفوری ، عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق ، عن مولانا عبد العزیز - عن مولانا الشاہ ولی اللہ ، قدس اللہ اسرارھم۔

حضرت مولانا کے بلاواسطہ فارغ التحصیل و عالم شاگرد چالیس سال میں کم درجہ اوسط پچیس سالانہ رکھنے کے بعد ایک ہزار ہوتے ہیں[1] اور معمولی شاگردوں اور بعض کتب پڑھ کر چلے جانے والوں اور بالواسطہ شاگردوں کی تو کچھ انتہا ہی نہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور سرپرست حضرات اور منتظمین میں چونکہ خلوص و تقدس بدرجہ کمال موجود تھا اس لئے ابتدا ہی سے روز افزوں ترقی کے مدارج طے کر رہا تھا اور ان کی ظاہری و باطنی توجہ کے آثار و برکات اس میں جلوہ نما ہو رہے تھے اور اسی کا نتیجہ اس کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ دیگر اکابر کے بعد حضرت مولانا اس کی صدر مدرسی کے لئے تجویز کئے گئے پھر آپ کی علمیت و شہرت و عظمت اور شب و روز کی محنت اور ایثار و خلوص اور باطنی ہمت کی وجہ سے جو شہرت و عظمت دارالعلوم کو حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے اور گویا آپ ہی کے فیوض نے اس کو بجا طور پر دارالعلوم کا لقب دلوایا ہے اس کے منتظمین نے جب بڑے بڑے خطرناک فتنوں میں سے اس کو

---

[1] حضرت نے ۴۴ سال درس دیا مگر ہم نے محض اندازہ کے لئے صرف ۴۰ سال کا اوسط نکالا - ابتدا میں فارغ التحصیل طلبہ بارہ ، چودہ ، پندرہ بیس سالانہ ہوتے تھے اور آخر میں تیس اور پھر پچاس ساٹھ تک نوبت پہنچی تھی - کم درجہ اوسط سالانہ پچیس رکھا ہے اور قیامت تک جو شاگرد پڑھتے رہیں گے ان کی تعداد و انتہا تو کچھ معلوم ہی نہیں - ۱۲

سلامت بچا کر نکالا اور شدید طوفانوں میں سے اِسے ساحلِ نجات پر لگایا تو مولانا ان کے پشت پناہ تھے اور جب اپنی حسن سعی سے اِس کو مدارج ترقی پر پہنچایا تو حضرت ان کے دست راست تھے۔

حضرت کو دارالعلوم سے اس قدر گہرا تعلق رہا ہے کہ شاید ہی کسی کو نصیب ہو۔ حضرت کے والد ماجد اس کے ابتدائی بانیوں اور اوّلین سرپرست ممبروں میں تھے حضرت کبھی اس کے سابقین بہترین طلبہ میں تھے کبھی معین کہلاتے تھے کبھی مدرس سوم وچہارم نظر آتے تھے کبھی مدرس دوم سے صدر مدرسی کی مسند پر ممتاز دکھلائی دیتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ کبھی ممبر مشورہ اور کبھی اعلیٰ سرپرست تسلیم کئے جاتے تھے۔

ہر حادث کی انتہا ہے اور ہر شے کو فنا۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد حضرت کے روحانی سرپرست ہونے کا نمبر آیا اور رخصت ہونے کا زمانہ قریب پہنچا یعنی اسی طرح دارالعلوم کی مسلسل خدمت کرتے ہوئے آپ نے بخاری شریف اخیر تک پڑھا کر حسبِ معمول ماہ رجب ۱۳۳۲ھ میں ختم کرائی۔ چونکہ ارادہ باوجود اخفا کے مشہور ہو چکا تھا دُعا میں معمول سے زیادہ آدمی شریک ہوئے کہ دیکھئے پھر کبھی حضرت کا حلقۂ درس دیکھنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، اور آئندہ اس برکت کے حصول کا موقع ملتا ہے یا نہیں۔

اس وقت حقیقی علم کس کو تھا مگر درحقیقت دُعا کے بعد جب حضرت درسگاہ سے اُٹھے تو چالیس سال کے بعد دارالعلوم[1] کی خدمت تعلیم وتعلیم ختم کر کے اُٹھے۔ پھر نہ کبھی درسگاہ نے آپ کی تلقین وتعلیم کی آواز سُنی اور نہ کبھی درس دینے کے لئے وہاں آپ کا قدم آیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ط

---

[1] دارالعلوم کی خدمت کے بعد درگاہ بے نہایت کی عنایت سے حضرت کا قدمِ ترقی اور بلند ہوا اور چھ ماہ شہر مبارک مدینۃ الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بخاری کا درس دیا اس کے بعد خاص بلد امین اور حرم رب العالمین میں یہی فیض جاری ہوا۔ سبحان من لا انتہاء بفضلہ۔

عزمِ سفر و روانگی بہ قصد زیارت حرمین شریفین

زیارت حرمین شریفین کیلئے دوسری بار روانگی

انسان کا ایمان جس قدر کامل ہوتا ہے اسی قدر شعائر اللہ اور آثار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و تعلق ہوتا ہے جیسا کہ پہلے مفصل گزر چکا ہے حضرت مولانا ۱۲۹۴ھ میں اپنے استاد مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما کی ہمراہ حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ مطہرہ سے مشرف ہو آئے تھے مگر بوجہ کمالِ ایمان ایک قوی تعلق قلبی اِن مقامات سے لگا ہوا تھا جو بار بار محرک ہو جاتا تھا پہلے بھی کئی مرتبہ قصد ہوا اور ۱۳۰۸ھ میں بھی (جبکہ آپ کے مرشد زادے مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہما حج کے لئے تشریف لے گئے تھے) آپ نے پورا قصد فرمالیا تھا لیکن مصالح مدرسہ کو پیش نظر رکھ کر حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ نے اجازت نہ دی تو آپ نے قصد ملتوی فرمایا۔

ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۳ھ میں پھر مولانا کا قصد سفر آہستہ آہستہ مشہور ہوا مگر چونکہ حضرت نے کوئی خاص اطلاع نہیں فرمائی تھی۔ اس لئے مختلف لوگوں نے اپنے قیاس سے مختلف توجیہات شروع کیں۔ چونکہ جنگ یورپ شروع ہو گئی تھی اور اپنی ہستی کو خطرہ میں دیکھ کر ترک بھی جرمنی کے ہمراہ شریک جنگ ہو گئے تھے اس لئے بہت لوگوں نے اندازہ لگایا کہ ترکوں کی امداد کے لئے جاتے ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ غیر اسلامی سلطنت اور خلاف شرع قوانین سے گھبرا کر قریب ترین اسلامی سلطنت کابل کی طرف قصد فرما رہے ہیں

اور یہ قیاسات و خیالات کچھ آج نئے نہیں تھے۔ سنہ ۱۲۹۴ھ میں بھی جب علماء ہندوستان کا مشہور قافلہ جنگ روم و روس کے زمانہ میں روانہ ہوا تو لوگوں نے

خود بخود ایسی ہی توجیہات شروع کر دی تھیں حضرت کے متعلق اس غلط فہمی میں تو ہر شخص مبتلا تھا کہ "حضرت ہجرت کر کے دائمی طور سے ہندوستان سے رخصت ہو رہے ہیں" اور یہی خیال زیادہ قلق اور صدمہ کا باعث تھا۔ کوئی اعلان و اطلاع حضرت کی طرف سے نہ تھی بلکہ دور دراز کے لوگوں کی تکلیف سفر وغیرہ کے خیال سے ایک درجہ اخفا کا تھا پھر بھی حضرت کی مقبولیت اور احساس کلفت مفارقت نے دور دور خبر پہنچا دی اور ماہ رمضان میں کسی قدر کم اور شوال میں ہر چہار طرف سے بہت زیادہ مہمانوں کی آمد رہی اور روانگی کے قریب تو بہت ہی کثرت ہو گئی

حضرت کے لئے میرسامان وہی ذات برحق تھی جو ہمیشہ متوکلین کی متکفل ہوا کرتی ہے اور ظاہری سامان کی درستی میں خدام مصروف تھے حضرت نے اپنے اہل وعیال اور متعلقین و متوسلین کو عامۃً اور فرداً فرداً ضروری اور مناسب نصائح فرمائی اور دارالعلوم کے متعلق ضروری اور خاص معاملات کو حضرات منتظمین کے ساتھ مل کر طے فرمایا اور مفید ہدایات فرمائی اور اپنے متعلق اسباق کا خود انتظام فرما دیا۔

اور چونکہ آپ کی عدم موجودگی سے نظامِ تعلیم بلکہ دیگر حیثیات پر بھی قوی اثر پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے ۲۹ رشوال کو خاص روانگی کے دن بعد ظہر اپنی قدیم درسگاہ نودرہ میں دارالعلوم کے تمام منتظمین، مدرسین، ملازمین و طلبہ کو جمع فرمایا، اور مناسب تمہید کے بعد بہت تصریح کے ساتھ فرمایا کہ میرا ارادہ صرف زیارت حرمین شریفین کا ہے۔ یہ بتلا دینا تو مشکل ہے کہ کتنی مدت میں واپس ہوں گا۔ مگر انشاء اللہ ضرور اور حتی الوسع جلد واپس ہوں گا" اور مدرسہ کے قدیم بزرگوں اور مقدس بانیوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ "مدرسہ کا کام خدا تعالیٰ کا کام ہے اس کی امانت سمجھ کر ہر شخص کو کوشش کے ساتھ اس کو انجام دینا چاہیئے" اور ہر صغیر و کبیر کے مناسب نصائح اور وصایا فرما کر دعا پر اس جلسہ کو ختم کیا۔

حضرت کی اس تقریر سے جیسے دارالعلوم کے متعلقین کی ہمت قوی ہو گئی اسی طرح حضرت کے وعدۂ تشریف آوری سے عام قلوب کی پریشانی اور مایوسی زائل ہو کر

واپسی کی اُمید سے طمانیت و مسرّت حاصل ہوگئی۔ اور ہر شخص جو اپنی رائے وقیاس سے حضرت کے متعلق احکام تجویز کر رہا تھا ان کی گنجائش نہ رہی اور اس تقریر کے بعد دہلی کے اسٹیشن پر عام مجمع میں بھی لوگوں کے دریافت کرنے پر حضرت نے صاف فرمایا کہ " نہیں بھائی ہجرت کا قصد نہیں ہے۔ البتہ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو کسی قدر قیام کا خیال ہے۔ جس کی نسبت کچھ پوری تعیین نہیں ہوسکتی۔ خدا جانے آئندہ کیا پیش آئے۔

تشریف لے جانے کے دن صدہا مہمان باہر کے موجود تھے اور تمام شہر میں روانگی کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ مغرب کے بعد ہی سے آپ کے مکان پر لوگوں کا اژدہام ہو گیا۔ عشا کی نماز کے بعد حضرت مولانا مکان سے رخصت ہوئے اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہم کے مکان پر جا کر اپنی روحانی والدۂ محترمہ یعنی حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار اہلیہ محترمہ سے طالب دعا ہو کر آخری رخصت حاصل کی، اور ان کی تاکید پر مکرر وعدۂ واپسی فرمایا اور پھر دار العلوم میں تشریف لے جا کر وہاں سے عظیم الشان مجمع کے ہمراہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے گاڑی میں دیر تھی اسٹیشن کی مسجد میں تشریف فرما ہوئے مصافحے اور رخصت شروع ہوئی یہاں تک کہ گیارہ بجے گاڑی آئی۔ حضرت سوار ہوئے اور اکثر متعلقین دار العلوم اور بعض اہل شہر اور حضرت کے عزیز و اقربا دہلی تک ہمراہ روانہ ہوئے۔ چار بجے گاڑی دہلی پہنچی اور صبح کی نماز باجماعت بہ عظمت و شان پلیٹ فارم پر ادا ہوئی۔ حضرت مولانا بہ سواری موٹر ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر چند منٹ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو صدہا مشتاق زیارت باشندگانِ دہلی اسٹیشن پر جمع ہو چکے تھے۔ ہر شخص بہ گریہ و زاری حضرت سے معانقہ و مصافحہ کر کے رخصت ہوتا تھا اور حضرت باوجودیکہ رقت طاری تھی سب کو تسلی

---

[1] افسوس ہے کہ ان بزرگ مخدومہ یعنی والدہ ماجدہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی وفات، حضرت مولانا کی تشریف آوری سے اڑھائی سال پہلے ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ میں ہو گئی۔ اور حضرت مولانا کو حالت اسیری میں اطلاع پہنچ کر نہایت غم و الم اور صدمہ ہوا۔

دیتے تھے۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد بھی لوگ بار بار دست بوسی کے لئے جدوجہد کرتے رہے آخر سات بجکر بیس منٹ پر گاڑی روانہ ہوئی اور ہندوستان کے افضل المسلمین کو ارض عرب کی طرف لے چلی۔ حضرت گاڑی کے دروازہ پر کھڑے ہوئے اشاروں سے سلام و دعا فرماتے رہے۔ گاڑی نظر سے پوشیدہ ہوجانے کے بعد سب لوگ اس مقدس سایہ کے سر سے جدا ہوجانے پر افسوس وحسرت کرتے ہوئے متفرق ہوگئے۔

راستہ میں حضرت نے رتلام میں مولانا محمد عبدالحق صاحب کی فرمائش سے مختصر قیام فرمایا (جو قدیم زمانہ میں عرصہ تک حضرت مولانا کے ہم سبق رہے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے تیار کردہ بہترین علماء میں ہیں۔ بالفعل دارالعلوم کے ممبر ہیں اور ریاست میں معزز عہدہ پر مقرر ہیں) اور پھر سورت میں بعض خدام کی استدعا منظور فرماکر دو تین روز قیام فرمایا۔ پھر وہاں سے بمبئی ایسے مناسب وقت پر پہنچے کہ جہاز کی روانگی میں دو ہی روز کی دیر تھی۔

بمبئی کے قیام میں دوسرے روز جمعہ واقع ہوا تو حضرت مولانا جامع مسجد میں نماز کے لئے تشریف لے گئے۔ کوکنی قوم کے خطیب صاحب جو شافعی المذہب اور نہایت دیندار بزرگ عالم ہیں، بعد نماز مصافحہ کے لئے بڑھے اور لوگوں سے کہا کہ ہندوستان کے محدث مولانا محمود حسن صاحب یہی ہیں۔ پھر کیا تھا مصافحہ اور دست بوسی کے ہجوم سے حضرت کو نکلنا دشوار ہوگیا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت کی شہرت صرف نظر بندی سے ہوئی ہے وہ اپنی غلطی کا یہاں سے اندازہ کرلیں۔

حضرت کے طرز عمل کے متعلق اس وقت تک گورنمنٹ کو کوئی اشتباہ نہ تھا اور آپ کا سفر ایک معمولی مذہبی سفر حج سمجھا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے حضرت کی روانگی اور بمبئی پہنچنے کے بعد روانگی جہاز تک کوئی غیر معمولی تفتیش و جستجو نہیں ہوئی اور نہ کسی قسم کے خاص سوال وجواب کی نوبت آئی۔

حضرت مولانا کی معیت کی سعادت حاصل کرنے اور زیارت حرمین سے مشرف ہونے کے خیال سے مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب دام فضلہم اور مولانا محمد سہول صاحب

ساکن بھاگل پور اور مولانا حبیب الرحمن صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی مطلوب الرحمن صاحب وغیرہ چند حضرات پہلے سے بمبئی پہنچ گئے تھے اور ٹکٹ خرید کر حضرت کی تشریف آوری کے منتظر تھے اور مولوی عزیر گل صاحب اور مولوی وحید احمد صاحب (جن کا تذکرہ آپ حضرت کے رفقاء اسیری میں ملاحظہ کریں گے) اور حاجی خان محمد صاحب جن کا مکہ معظمہ میں انتقال ہوگیا اور حضرت کے خادم و مرید حاجی محبوب خاں صاحب اور مولوی سید ہادی حسن صاحب خانجہانپوری دیوبند ہی سے تمام سفر حج میں ہمراہ تھے۔

بمبئی میں پاسپورٹ (پروانۂ راہداری) حاصل کرنے کے وقت حضرت اور آپ کے رفقاء سے کچھ زیادہ تحقیقات و سوالات نہیں کئے گئے۔ دیگر حجاج کی طرح معمولی امور دریافت کرکے پاسپورٹ دے دیا گیا اور شنبہ کے روز مع اپنے تمام رفقاء کے حضرت جہاز پر سوار ہوگئے۔ ظہر کے بعد جہاز نے لنگر اٹھایا اور حضرت شیخ الہند کو حرمین کی طرف لے چلا، اور ہندوستان نے بزبان حال کہا ؎

کردہ عزم سفر فضل خدا یار تو باد
ہمت اہل نظر قافلہ سالار تو باد

حج بیت اللہ

جہاز میں بفضلہ تعالیٰ اکثر رفقاء اور حضرت تندرست رہے اور اپنے معمولات کے پابند۔ پنجگانہ نمازیں نہایت اہتمام اور پابندی سے باجماعت ادا ہوتی تھیں۔ نماز اکثر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اور مولانا محمد سہول صاحب پڑھاتے تھے اور تمام خدام حضرت کے سایۂ شفقت میں بہ لطف و مسرت سفر کرتے ہوئے ساتویں روز عدن پہنچ گئے۔ حضرت اور آپ کے رفقاء نے یہیں سے خطوط ہندوستان کو ارسال کئے۔ عدن سے روانہ ہوکر جب میقات اہل ہند یعنی یلملم کے مقابل ہونے کا وقت قریب آیا تو غسل کرکے احرام باندھا۔ حضرت مولانا اور بعض رفقاء نے اعلیٰ اتباع سنت اور عالی ہمتی سے قران کے احرام کی مشقت کا التزام کیا۔ اور باقی حضرات نے

سہولت و یُسر پر عمل کر کے تمتع کا احرام باندھا۔ عدن سے پانچویں بلکہ چوتھے ہی روز جدہ پہنچ گئے۔ وہاں پانچ روز قرنطینہ کے لئے ٹھہرنا پڑا اور چھٹے روز مکہ معظمہ کیطرف روانہ ہوگئے وہاں پہنچکر باب العمرہ کے متصل ایک رباط میں مقیم ہوئے اور زیارت و طواف بیت اللہ سے تمناتے دلی پوری فرمائی۔ افسوس ہے کہ اسی قیام میں آپ کے مسکین خادم مولوی حاجی خان محمد صاحب قبض اور نفخ البطن میں مبتلا ہوئے اور شدید تکلیف کے بعد ہفتم ذی الحجہ کو انتقال فرمایا۔ اور جنت المعلےٰ کے خوش نصیب خفتگان لحد میں شامل ہوکر درجات اعلیٰ حاصل کئے۔

ہشتم ذی الحجہ کو لاشریک لك لبیك کہتے ہوئے منا کی طرف چلے اور باطمینان قلب مناسکِ حج ادا کرنے شروع کئے سب حضرات نے برعایتِ سنن و مستحبات حج سے فراغت حاصل کرکے شکرِ خدا ادا کیا۔

مدینہ منوّرہ کی جانب روانگی

بعد فراغتِ حج مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب اپنے بعض ترددات یا اختتام رخصت کی وجہ سے حضرت سے اجازت لے کر مکہ معظمہ ہی سے ہندوستان واپس آگئے اور حضرت مولانا و دیگر رفقاء ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ کو جدہ ہوکر سلطانی قدیم راستے کے سوا دوسرے راستے سے جو آجکل کچھ سہل سمجھا جاتا ہے راہیٔ مدینہ منورہ ہوئے اور اونٹوں کی سواری پر وہ مبارک منزلیں بصد شوق و ذوق طے کرنے لگے۔ مولانا کے مطوف سید امین عالم صاحب نے (جو ایک شریف الطبع خوش خلق مردم شناس مطوف ہیں) اپنے شتربانوں کے سردار کو حضرت مولانا اور آپ کے رُفقا کی معیت کے لئے منتخب کیا تھا کہ حضرت کی راحت رسانی کی نہایت تاکید فرمائی تھی۔ اس شخص نے بہت زیادہ شرافت و آدمیت سے معاملہ کیا اور ہر طرح آرام پہنچایا۔ حضرت مولانا کے اُونٹوں سے اتر کر پنجوقتہ نماز با جماعت ادا فرمانے کے لئے اونٹوں کو روک لیتا، اور اپنے ایک دو ساتھیوں کو ہمراہ لے کر بندوق لئے ہوئے حفاظت کرتا رہتا تھا۔

مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب کی انتظامی قابلیت و دلچسپی اور حضرت مولانا کی شفقت نے آپ کو امیر جماعت مقرر کرا دیا تھا آپ کی وجہ سے تمام ضروریں موقع بہ موقع اور تمام انتظامات نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاتے تھے اور حضرت مولانا کی برکت اور سب رفقا کے اہل علم وہم مشرب اور متحد المذاق ہونے کی وجہ سے بہ راحت فرصت سفر پورا کر کے بارہ روز کے بعد مدینہ طیبہ پہنچے۔

مدینہ منورہ میں حضرت کے سب سے فائق جانباز خادم اور بہترین شاگرد مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدرس حرم شریف نبوی صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے بڑے بھائی مولینا سید احمد صاحب مہاجر حضرت کی تشریف آوری کے منتظر تھے اور ان کے بھتیجے مولوی وحید احمد حضرت کے رفقاء میں حاضر خدمت تھے۔ مدینہ منورہ کے صاحب وسعت اور شائقین حضرات جو ہمیشہ سانڈنیوں کی سواری پر حج کو جا کر سب سے پہلے مدینہ منورہ واپس آجاتے ہیں، وہ حضرت مولانا سے مکہ معظمہ میں مل چکے تھے۔ نیز بذریعہ خطوط مکہ معظمہ سے روانگی کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اس لئے ماہ محرم کی ابتدائی تاریخوں میں جن میں قافلہ کی آمد آمد تھی مولانا حسین احمد صاحب کی ہمراہ ایک بڑی جماعت اہل علم وفضل اور آپ کے تلامذہ اور معززان مدینہ منورہ کی شہر سے باہر مولانا کے استقبال کو بیر عروہ تک (جو کہ شہر پناہ کے دروازے باب العنبریہ سے تقریباً دو ڈھائی میل ہے) نکلا کرتی تھی۔ اور طعام اور چاء وغیرہ کا وہیں انتظام کر کے انتظار کرتی اور مایوسی کے بعد واپس ہو جاتی، اور جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت اہل مدینہ کے انتظار کا نقشہ پیش نظر ہو جاتا تھا۔

مدینہ منورہ حاضری اور قیام

بالآخر ۶ محرم روز دوشنبہ کو تقریباً دس بجے حضرت مولانا کا قافلہ بیر عروہ پر پہنچا۔ حسب دستور روزانہ استقبال کرنے والوں کی جماعت حاضر تھی اور پھر خبر سن کر مدینہ منورہ کے اہل فضل وکمال جوق در جوق نکل پڑے۔ مولانا حسین احمد کے مایۂ ناز محترم

شیخ کا شایانِ شان استقبال ہوا۔ اور شیخ کی آنکھیں اپنے اخص التلامذہ کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوئیں۔

مولانا حسین احمد صاحب کا مکان جس کو ان کے والد ماجد کی جدّت پسند طبیعت نے مصارف کثیر برداشت کر کے شب و روز کے اہتمام سے عرصہ دراز میں نہایت آرام دہ صورت میں تیار کیا تھا۔ خارج باب المجیدی واقع تھا۔ خاص اہتمام سے مہمانوں کے لئے مردانہ مکان زنانہ مکان سے ملحق و متصل بنائے گئے تھے۔ یہ گویا حضرت کا اپنا گھر تھا اس کے سوا دوسری جگہ کیسے ٹھہر سکتے تھے۔ سب لے وہیں قیام فرمایا اور اس دارالمہاجرین میں اپنے محترم شیخ کو اپنا مہمان بنانے کی ایک دیرینہ آرزو جو مولانا حسین احمد صاحب کے قلب میں تھی آج پوری ہوئی۔ اہل شہر ائمہ و خطبا و رؤسا میں دھوم مچ گئی کہ ہندوستان کے آفتاب علم نے بارگاہ نبوت کی خاکروبی کا قصد کر کے عتبۂ عالیہ کی جبہہ سائی کی ہے تمام دن لوگ قدمبوسی کے لئے حاضر ہوتے رہے اور مکان کے بہترین وسیع کمرے میں جو اسی کے لئے مزین کیا گیا تھا زیارت سے مشرف ہوتے رہے اور تین چار روز تک یہی با رونق سلسلہ جاری رہا۔

حضرت کو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے مبارک دارالہجرۃ کی اقامت اور روضۂ اطہر کی زیارت سے روحانی فوائد حاصل ہوئے ایسے ہی اس معزز خاندان کی مخلصانہ خدمت سے جسمانی راحت و آرام نصیب ہوا۔

مولانا محمد سہول صاحب۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہم چند روز مدینہ منورہ حاضر رہ کر بوجہ اپنے تعلقات اور ضرورتوں کے حضرت مولانا کے ارشاد سے ہندوستان واپس چلے آئے اور حضرت مقیم رہے۔

خود حضرت کی خداداد عظمت و شہرت کچھ کم نہ تھی اور حضرت کے متعارف و شناسا بہت لوگ حرمین محترمین کے جوار میں موجود تھے۔ اس پہ مولانا حسین احمد صاحب جیسے مشہور شیخ کے استاد ہونے کی حیثیت طرّہ ہو گئی اور تمام مدینہ منورہ کے اہل علم و صلاح حضرات کی خدمت میں آ کر فیوض و برکات سے مستفیض ہونے لگے۔ خود مولینا

حسین احمد صاحب اور ان کے شاگردوں اور مدینہ منورہ کے بعض مدرسین کے اصرار سے حضرت نے بخاری شریف کا درس دینا قبول فرمایا۔ لیکن بوجہ کسر نفسی و غایت احترام حضورِ نبوّت مآب حرم محترم میں مسندِ درس پر بیٹھنا پسند نہ فرمایا بلکہ موصوف کے مکان ہی پر بعد نمازِ ظہر تا عصر حلقۂ درس قرار پایا۔ مولانا حسین احمد صاحب کے فیض یافتہ لوگوں کے سوا مدینہ منورہ کے معزز و معتبر شائقین علوم برغبت و شوق شریک ہو کر خوشہ چینی کرنے لگے اور رفتہ رفتہ مجمع اس قدر بڑھ گیا کہ مکان میں جگہ ملنی دشوار ہوتی تھی۔

ذاتِ اقدس صاحب الوحی والمعجزات کا قرب تھا سینۂ مصفّٰی درجاتِ عروج طے کر کے نور حاصل کر رہا تھا اور حضرت پر فیوض نامتناہی کی بارش ہو رہی تھی جو درجہ بدرجہ حسبِ استعداد حاضرین و سامعین تک پہنچتی تھی۔ حضرت بلند آواز سے عربی میں تقریر کرتے اور ایسے اعلیٰ مضامین بیان فرماتے جو دیدہ تھے نہ شنیدہ۔ مولانا حسین احمد صاحب کے شاگرد اور دوسرے اہلِ علم جب مولانا موصوف کو حضرت کے سامنے ایک معمولی طالبعلم کی طرح حلقہ میں مؤدب بیٹھے ہوئے دیکھتے تھے تعجب کرتے تھے کہ بیشک وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ۔

بہت سے اہلِ علم نے حصولِ شرف و علوِ اسناد کے خیال سے حسبِ قاعدہ اسلاف اوائل کتب سنا کر حدیث شریف کی سند و اجازت حاصل کی اور تقریباً پانچ ماہ تک ایک عجیب پر لطف علمی مجمع قائم رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے محض تکمیل درجات کے لئے حضرت کو یہاں پہنچایا تھا۔ اس لئے زیادہ عرصہ تک یہ روحانی فیوض کی مجلس برقرار نہ رہ سکی یعنی حضرت نے ارادۂ واپسی فرمایا۔

حضرت مولانا مدینہ منورہ میں چھ ماہ سے کچھ کم مقیم رہے اگرچہ آپ جیسے کامل الایمان حضرات کو (جو حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ مَالِهٖ وَوَلَدِهٖ کے مصداق ہیں) قربِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدہ ہونا کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بعض مجبوریاں ایسی پیش آئیں کہ بجز واپسی کے کوئی چارہ نظر نہ آیا چونکہ جنگ کا زمانہ تھا۔ اس لئے معمولی طریقے سے زیارت کے لئے حاضر ہو کر واپس ہو جانے

والوں کے بعد جو لوگ مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے ترکی پولیس نے خفیہ طور سے ان کی نگرانی اور تفتیش شروع کر دی جو لوگ اس کی تحقیقات میں مشتبہ ثابت ہوئے، وہ نظر بند ہو کر ملک شام کی طرف روانہ کئے گئے اور اختتام جنگ تک نظر بند رہے۔

بعض فاسد العقیدہ بدعتی فتنہ انگیز جو مولانا حسین احمد صاحب کی اشاعتِ سنّت اور اظہارِ حق سے جلتے تھے مگر ان کے علم و فضل اور اقتدار فی القلوب اور عظمت حقانیت کے سامنے سرنگوں ہو رہے تھے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھے اور پولیس کمشنر فخری آفندی کو اپنی دروغ بافی سے بدظن کر دیا کہ یہ ہندوستانی مشاہیر علما انگریزوں کے خفیہ جاسوس اور سی آئی ڈی ہیں ورنہ ایسے پُرآشوب زمانہ میں یہاں قیام کرنا چہ معنے وارد۔ چنانچہ اسی زمانے میں حضرت مولانا نے حاضریٔ بیت المقدس اور زیارت مزارات انبیا و صلحاء کی نیت سے ملک شام کی طرف سفر کرنا چاہا تو کمشنر مانع ہُوا بلکہ اس وجہ سے اشتباہ زیادہ پیدا ہو گیا۔ اور خیالات میں بہت تغیر آ گیا۔ چونکہ عموماً مدینہ منورہ کے عہدے دار اور بڑے بڑے رؤسا اور علماء و خطباء اور آئمہ و اہل صلاح وغیرہ ان حضرات کے معتقد اور جاں نثار تھے اس لئے خود دست درازی کرنے سے ڈرتا تھا۔ لیکن اپنی ضدی طبیعت اور دشمنوں کی ترغیب سے ایذا رسانی پہ آمادہ تھا لہٰذا ان بزرگوں کے حالات و واقعات کی مثل مرتب کر کے حاکم اعلیٰ کے پاس شام روانہ کی اور حکم کا منتظر رہا۔

انور پاشا اور جمال پاشا کی مدینہ منوّرہ میں حاضری

حسن اتفاق سے انہیں ایام میں ترکی سلطنت کے وزیر جنگ انور پاشا اور وزیر بحریہ جمال پاشا اور بہت سے معزز سرداروں اور جرنیلوں کے مدینہ منورہ تشریف لانے کی خبریں پہنچی۔ ارکان سلطنت باضابطہ انتظام میں مصروف ہوئے اور اہل شہر اپنی خوشی سے آرائش و زیبائش میں مشغول ہو گئے۔ جمعہ کے روز دس بجے ان معزز سرداروں کی اسپیشل ٹرین مدینہ منورہ پہنچی۔ اسٹیشن پر بہت بڑا ہجوم تھا اور حکومت کے باقاعدہ انتظام کے علاوہ اہل شہر نے جو انتظامات بفرطِ محبت و عقیدت کئے تھے وہ بھی قابلِ دید

تھے اور جس طرز سے جلوس نکالا وہ بے مثل تھا۔ چار کی دعوت اور ایڈریس پیش ہونے کے بعد اسٹیشن کے دروازے پر فٹن وغیرہ سواریاں پیش کی گئی لیکن انور پاشا نے بکمالِ ایمانی وعظمتِ نبویؐ سوار ہونے سے انکار کیا اور پا پیادہ بارگاہ نبوت کی طرف روانہ ہوئے۔ اہل تصوف کے جس قدر مختلف حلقے مدینہ منورہ میں تھے۔ سب کے سب علیٰحدہ علیٰحدہ مع اپنے مریدوں کے بڑی بڑی آٹھ جماعتوں میں تقسیم ہوکر ہر جماعت اپنے زرّیں جھنڈے لئے ہوئے ذکر اللہ کرتے ہوتے اور اشعار مدحیہ و دعائیہ پڑھتے ہوئے آگے آگے جاتے تھے۔ اُن کے بعد حرم محترم نبویؐ کے مختلف خدّاموں کی جماعتیں تھیں مثلاً حرم شریف کے ڈیڑھ سو مؤذنوں کی جماعت علیٰحدہ۔ اماموں اور خطیبوں کی علیٰحدہ حُجرۂ مطہرہ نبویہ کے خاص خدام خواجہ سراؤں کی علیٰحدہ حرم شریف کے جاروب کشوں کی علیٰحدہ تھی۔ سب کے سب درجہ بدرجہ یکے بعد دیگرے حمد و صلوٰۃ دُعا و ثنا پڑھتے ہوئے اپنے منصب کے خاص لباس پہنے ہوئے چل رہے تھے۔ ان جماعتوں کے بعد جناب انور پاشا اور جناب جمال پاشا ادب و احترام حضورِ نبوی کو ملحوظ رکھ کر غلامانہ طریق سے نظریں نیچی کئے ہوئے نہایت ادب و احترام سے برابر برابر چل رہے تھے ان کے پیچھے ان کے رفقاء اور حکام اور ان کے بعد اہل شہر، اور دائیں بائیں ترکی فوج کی مکمل اور باسازو سامان قطاریں خراماں خراماں جا رہی تھیں۔ چار طرف در و دیوار اور راستوں اور مکانوں پر خلقت کا ہجوم تھا۔ جب یہ مجمع باب السلام تک پہنچا اور دست بستہ حرم نبویؐ میں داخل ہوا اور مزوّر نے داخلے کی دعائیں پڑھانی شروع کی ہیں تو دونوں وزیر بیقراری سے زار و قطار آنسو بہا رہے تھے اور بادشاہِ دوجہاں کے سامنے غلامانہ نیاز سے سر جھکاتے ہوئے شیخ الحرم کی تعلیم کے مطابق صلوٰۃ و سلام کے مراسم و آداب پورے کر رہے تھے۔

زیارت کے بعد سب حضرات مسجد مُبارک میں بیٹھ گئے اور خطبہ اور نماز جمعہ کے بعد معزز مہمان اپنی جائے قیام پر چلے گئے (جہاں میونسپلٹی کی طرف سے قیام و طعام اور راحت کا پورا انتظام کیا گیا تھا) اور کھانا کھا کر آرام فرمایا، اور بوقت عصر و مغرب

نماز باجماعت مسجد نبوی میں ادا فرما کر اپنی قیامگاہ پر جا ٹھہرے۔ شب کو جناب مفتی مامون کے پاس (جو مدینہ منورہ کے مفتی اور شیخ العلماء ہیں) انور پاشا کا یہ حکم پہنچا کہ چونکہ ہمارے پاس اتنا کافی وقت نہیں کہ تمام علماء مدینہ کے حلقۂ درس میں حاضر ہو کر ان کی تقریروں سے مشرف ہوں، اس لئے مناسب ہے کہ صبح کو بعد اشراق علماء شہر مسجد نبوی میں جمع ہو جائیں اور اپنی تقریروں سے محظوظ فرمائیں۔

انور پاشا سے ملاقات

جناب مفتی صاحب موصوف چونکہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی مہاجر رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے ان کو اپنی جماعت سے خاص تعلق تھا اور ہر طرح چاہتے تھے کہ ان برگزیدہ بزرگانِ ہند کو کوئی کلفت پیش نہ آوے اور مخالفین اور حکام پولیس کی طرف سے کوئی گزند نہ پہنچے۔ اس لئے جناب مفتی صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب سے فرمایا کہ جناب انور پاشا کی تجویز فرمودہ مجلس العلماء میں اگر یہ حضرات بھی تشریف لاویں تو نہایت مناسب ہے تاکہ ہر دو معزز وزیروں سے ان مقدس حضرات کا تعارف کرانے کا مجھ کو موقع مل جائے اور مخالفین کے کذب وافتراء اور الزامات کی تردید کی عمدہ تدبیر ہاتھ آئے بلکہ حاسدین اور ضرر پہنچانے والوں کی کمر ہمت ٹوٹ جائے۔ یہ تدبیر نہایت مناسب اور مصالح وقت کے اعتبار سے نہایت ضروری تھی۔ لہٰذا مولانا حسین احمد صاحب کے عرض کرنے پر دونوں حضرات بوقتِ مقررہ مجلس میں تشریف لائے اور تینوں حضرات نہایت احترام سے صفِ اول میں جناب مفتی صاحب ممدوح کی دائیں جانب بٹھلائے گئے اول حضرت مولانا، پھر مولانا خلیل احمد صاحب، پھر مولانا حسین احمد صاحب۔ جب مجلس نہایت باقاعدہ طور سے رونق کے ساتھ پُر ہو گئی اور معزز وزیران و مہمان تشریف لے آئے تو جناب شیخ العلماء یعنی مفتی صاحب ممدوح سے تقریر کی خواہش کی۔

آپ نے تھوڑی دیر نہایت مناسب و معقول تقریر فرمائی۔ ان کے بعد انور پاشا

نے حضرت مولانا سے تقریر کی استدعا کی۔ حضرت نے انکار فرمایا تو مولانا خلیل احمد صاحب سے درخواست کی مگر دونوں حضرات نے اپنے ضعف اور آواز کی کمزوری نیز اہل لسان نہ ہونے کا عذر فرمایا۔

اب مولانا حسین احمد صاحب کی باری آئی۔ آپ نے فرمائش تقریر کو مناسب شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور کھڑے ہو کر اپنی بے تکلف اور فصیح و بلیغ عربی تقریر سے اہل لسان کو محو حیرت کر دیا اور بہت عرصہ تک اپنے عالمانہ و فاضلانہ مضامین سے حاضرین اور علماء و فضلاء کو محظوظ کرتے رہے جس سے معزز مہمان نہایت مسرور ہوئے۔ ان کے بعد دوسرے علماء نے حسب استعداد مناسب وقت تقریریں کیں۔

چونکہ مجمع نہایت عظیم تھا اور فرصت قلیل اور وزیروں کی روانگی کا وقت بہت قریب، اس لئے اختتام جلسہ کے وقت صرف اتنا موقع مل سکا کہ جناب مفتی صاحب موصوف اور حضرت شیخ الحرم صاحب نے ہر دو وزیران عالی مرتبہ سے حضرت مولانا اور مولانا خلیل احمد صاحب کا مناسب توصیف کے ساتھ تعارف کرا دیا۔ باہم مصافحہ ہوا اور نہایت خندہ پیشانی سے مزاج پرسی کی نوبت آئی۔ اس کے بعد سب حضرات اٹھے اور وزیر صاحبان اپنی قیامگاہ پر چلے گئے۔ چونکہ دونوں حضرات سے تعارف ہو گیا تھا لہٰذا کھانا کھانے کے وقت قلیل فرصت اور مناسب موقع پا کر جناب مفتی صاحب اور دیگر نیک خیال احباب نے وزیر صاحبان سے یہ عرض کر دیا کہ پولیس ایسے مقدس حضرات کی ایذا رسانی کا قصد رکھتی ہے۔ حالانکہ حرمین شریفین کو ہر ملک کے دیندار مسلمان اپنا ماوا و ملجا سمجھ کر بہ نیت حصول و برکات و ثواب مذہبی حیثیت سے آتے ہیں۔

اس مخلصانہ سفارش اور کلمہ حق سے نہ صرف ان حضرات کے متعلق دشمنوں کی ریشہ دوانیاں اور پولیس کی کارروائیاں بیکار ہو گئیں، بلکہ تمام معتکفین و زائرین حرمین شریفین کو پناہ مل گئی یعنی جناب جمال پاشا نے شام پہنچ کر ایک مخصوص حکم حکام حرمین کے نام بھیج دیا کہ حرمین شریفین میں مخالف و متحارب سلطنتوں کی رعایا کے

ساتھ بھی وہی[1] معاملہ کیا جائے جو اپنی رعایا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

جناب انور پاشا نے اہل مدینہ اور خادمانِ حرم نبوی اور علماء وغیرہ کے لئے پانچہزار پونڈ تقسیم کرنے کے واسطے ایک جماعت منتظمہ کے سپرد کئے جس کے افسر حضرت شیخ الحرم تھے۔ بڑے بڑے علماء کو پانچ پانچ پونڈ دیئے گئے اور دوسرے لوگوں کو حسب استحقاق کم و بیش۔ ہمارے حضرت مولانا اور مولانا خلیل احمد صاحب اور مولینا حسین احمد صاحب کے لئے پانچ پانچ پونڈ بھیجے گئے۔ پہلے دو بزرگوں نے بایں عذر انکار کر دیا کہ ہم اہل حاجت نہیں ہیں۔ کافی خرچ موجود ہے۔ مگر جب منتظمین کی طرف سے یہ کہا گیا کہ یہ شاہی ہدیہ ہے خیرات نہیں ہے، تو دونوں بزرگوں نے بھی قبول فرما لیا اور اپنے سعادتمند فرزند مولانا حسین احمد صاحب کو بطور شیرینی دے دیا۔

جناب انور پاشا نے پانچہزار پونڈ مکۃ معظمہ کے مستحقین کے لئے بھی روانہ فرمائے تھے لیکن شریف صاحب کے دلِ بے رحم نے اس مالِ مفت کا سب سے زیادہ مستحق اپنے خزانے کو سمجھا۔ جناب کمال پاشا نے لوگوں کی مسکنت اور حاجت ملاحظہ فرما کر شام سے بارہ ریل گاڑیاں گندم سے بھر کر مدینہ منورہ میں تقسیم کرنے کے لئے روانہ فرمائی یہاں بدقسمتی سے اس زمانہ میں شریف صاحب کے نور چشم منتظم تھے جو سلطنت ترکیہ کے بڑے وفادار اور خیر خواہ بنے ہوئے تھے ان کی عنایت سے بہت کچھ فوج میں تقسیم ہو گیا اور کچھ ان کے خوشامدی لوگوں میں۔ اہل مدینہ کو کچھ بہت قلیل پہنچا۔

ان واقعات کے بعد اگرچہ بظاہر کچھ اطمینان ہو گیا تھا لیکن پولیس کمشنر کو چونکہ ایک قسم کی پرخاش ہو گئی تھی اور ان کے مزید اعزاز و احترام کے واقعات سے اس کی آتشِ حسد بھڑک گئی تھی اس لئے اس سے دور رہنا مقتضائے دانشمندی معلوم ہوا۔ ادھر رمضان المبارک کا زمانہ قریب تھا اور مکۃ معظمہ میں یہ متبرک ایام گزارنے کی آرزو اور

---

[1] یعنی خواہ مخواہ بنظر اشتباہ دیکھ کر حیران نہ کیا جائے البتہ اگر صریح طور پر جرم معلوم ہو جائے تو باقاعدہ سزا دی جائے۔ یہ وہ زمانہ جنگ تھا جبکہ تمام سلطنتوں نے غیر ملکی لوگوں پر نگرانی و نظر بندی قائم کر رکھی تھی اس سے اعلیٰ احکام ترکیہ کی فراخ حوصلگی اور رواداری اور غایت تعظیم حرمین شریفین ثابت ہوتی ہے۔ ۱۲

دوبارہ حج کرنے کا اشتیاق تھا۔ لہٰذا عنقریب ہی جو قافلہ مدینہ منورہ سے روانہ ہونے والا تھا اسی میں واپسی کا قصد کر لیا گیا کہ مُبادا پھر راستے بند ہو جائیں کیونکہ شریف صاحب کی ترکوں سے مخالفت و عدم اطاعت کی خبریں روزانہ پہنچتی رہتی تھیں اور باہمی جنگ و جدال شروع ہونے کا احتمال تھا اور ایک خاص وجہ اس قدر عجلت کی یہ بھی ہوئی کہ بدویوں کے ایک نہایت معتبر و معتمد شیخ اور رئیس القوافل معروف بہ شیخ دفیدع جو شاذ و نادر ہی کسی خوش نصیب قافلہ کے ہمراہ جاتے تھے، مکہ معظمہ کی طرف سفر کرنے والے تھے جن کی معیت بفضلہ تعالیٰ امن و سلامت کے مرادف تھی اور جن کا رعب راستے کے خطروں سے حفظ و امان کی پوری ضمانت۔

مولوی عزیز گل صاحب تو ابتدا سے انتہا تک پوری رفاقت کا قصد کر کے گئے تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب اور خود ان کے بھتیجے مولوی وحید احمد صاحب اور منشی محمد حسین صاحب فیض آبادی مہاجر راحت رسانی کے لئے مکہ معظمہ تک ساتھ رہنے کے قصد سے بلکہ اگر حضرت پھر واپسی مدینہ منورہ کا قصد فرمائیں تو پھر لانے کے لئے ہمراہ ہوئے اور ۱۲ جمادی الثانیہ ۱۳۳۴ھ کو مدینہ منورہ سے بصد حسرت با چشم گریاں و دل بریاں روانہ ہو کر حضرت مولانا ایک مختصر قافلہ میں جس میں شیخ دفیدع کی سواری کے اونٹ کے علاوہ صرف سات ہی اونٹ تھے اپنے جاں نثار خدام کی رفاقت اور شیخ دفیدع کی معیت سے براحت و حفاظت تمام سفر کرتے ہوئے جدہ ہو کر اخیر ماہ جمادی الثانی میں مکہ معظمہ پہنچ گئے اور قریب باب العمرہ ایک مکان کرایہ پر لے کر مقیم ہوئے۔

طائف کو روانگی

مکہ معظمہ سے تین منزل مقام طائف ہے بہت بلند زمین پر واقع ہے اور اپنی سرسبزی و شادابی میں مشہور اور ایک سرد مقام ہے گرمیوں میں یہاں کا موسم نہایت عمدہ رہتا ہے جن ایام میں مکہ معظمہ میں گرمی کی وجہ سے رات کو بھی آرام میسر نہیں ہوتا یہاں لوگ ہلکی رضائی اوڑھ کر سوتے ہیں۔ جابجا باغات ہیں ہر قسم کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔ انگور،

انجیر، انار، آڑو، لیچی وغیرہ وغیرہ جملہ سرد ملکوں کے میوے نہایت کثرت سے بہت عمدہ پیدا ہوتے ہیں۔ بارش خوب ہوتی ہے اور جا بجا نہریں اور میٹھے کنوئیں بکثرت موجود ہیں۔ ترکی کے گورنر اور بڑے درجہ کے حکام گرمیوں کے زمانہ میں طائف ہی میں رہتے ہیں اور بہت سے اہل مکہ جو گرمی برداشت نہیں کر سکتے طائف ہی چلے جاتے ہیں مکہ معظمہ میں چونکہ اس وقت گرمی شدید تھی اور ایام حج میں تقریباً پانچ ماہ باقی تھے۔ نیز طائف میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مزارات بھی ہیں جن کی زیارت کے لئے بہت سے حجاج وغیرہ جایا کرتے تھے حضرت مولانا نے بھی قصد فرمایا کہ اس وقت طائف چلے جائیں اور رمضان المبارک سے پہلے حرم محترم میں واپس آجائیں۔

حضرت مولانا اور مولوی عزیر گل صاحب اور مولوی وحید احمد صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب اپنے مطوف سید ابن عاصم صاحب کی معیت میں ۲۰ رجب کو روانہ ہو کر تیسرے روز طائف پہنچے اور شہر پناہ سے باہر محلہ سُلامی کے ایک سرسبز و شاداب باغیچہ میں جس کو تبیلہ کہتے تھے (جس کے کرایہ کا انتظام مطوف صاحب نے پہلے سے کر لیا تھا) فروکش ہو کر، بالائی حصہ میں مطوف صاحب مع متعلقین اور نیچے حضرت مولانا مع تینوں رفیقوں کے رہنے لگے۔

معمولی افواہیں تو مدینہ منورہ ہی میں سن رہے تھے مکہ معظمہ آئے تو دیکھا کہ عجیب عجیب چیزیں اہل شہر اور بدویوں میں مشہور ہیں۔ کہیں سنتے تھے کہ شریف صاحب انگریزوں سے مل گئے ہیں۔ بغاوت اور بدعملی ہونے والی ہے کہیں مشہور ہوتا کہ شریف صاحب کے نام انگریزوں کا پیام آیا ہے کہ ترکوں کو حجاز سے نکال دو ورنہ تمہاری جگہ تمہارے بہنوئی شریف علی سابق شریف مکہ کو بحال کر کے تمہاری جگہ مقرر کر دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

شریفِ مکّہ کی بغاوت اور غدّاری

معمولی افواہیں تو مدینہ منورہ ہی میں سُن رہے تھے مکّہ معظّمہ میں پہنچ کر شریف کے برطانیہ سے ساز باز کر لینے اور ترکوں سے بغاوت کا قصد رکھنے کی عام شہرت دیکھی اور بہت جلد بدعملی کے ہو جانے کا منتظر اور خائف پایا اور بہت دوستوں نے یہ بھی سمجھایا کہ طائف جا کر بہت جلد واپس آجانا ایسا نہ ہو کہ خطرہ میں پڑ جاؤ۔ لیکن چونکہ ظاہر میں کچھ آثار نہ تھے۔ اس لئے یقین نہ آتا تھا۔ مگر طائف پہنچکر چند ہی روز گذرے تھے کہ شہرت یافتہ افواہیں اور خبروں کا ظہور ہو گیا۔ اور شریف صاحب نے شرافت کو بالائے طاق رکھ کر پانچسو برس کی خادم حرمین شریفین ترکی سلطنت کے مقابلہ میں دشمنانِ اسلام کی اعانت سے ابتدائے ماہ شعبان ۱۳۳۴ھ میں علم بغاوت بلند کر کے مکّہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ اور جدّہ اور ینبوع پر فوج کشی کر کے جنگ و جدال جاری کر دیا اور ۱۱ شعبان کو قبل از صبح صادق اپنے بیٹے عبداللہ بیگ کی زیر کمان طائف پر بھی ہر طرف سے حملہ اور چڑھائی کرا دی اور محاصرہ کر لیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۸ھ میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے بت پرست کفار کو طائف میں محصور کیا تھا آج تیرہ سو چھبیس ۱۳۲۶ سال کے بعد اہل بیت ہی کے ایک سعادت مند فرزند (شریف صاحب کے بیٹے عبداللہ گورنر افواج) نے جمعیۃ اسلامیہ کو پراگندہ کر کے اعدائے دین کو خوش کرنے کے لئے فرزندانِ توحید اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والے اپنے مسلمان بھائیوں پر نہایت شدید محاصرہ کیا اور ہر طرف سے اعانت کے دروازے اور رسد کے راستے اور آب و دانہ بند کر دیا۔

چونکہ جنگ کی وجہ سے ترکی فوج جابجا اتحادیوں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں مصروف تھی اس لئے تمام حجاز میں صرف چار ہزار فوج رہ گئی تھی اور طائف میں صرف آٹھ سو مسلح سپاہی تھے اور کسی قدر غیر مسلح لوگ، اور وہ بھی نہ پہلے سے خبردار جنگ کے لئے مستعد و تیار۔ ان کے مقابلہ میں شریف صاحب کی عربی فوج کے بدّو نہایت

کثیر تعداد میں عُمدہ عُمدہ قیمتی انگریزی رائفلیں لئے ہُوئے اور سامان جنگ نہایت کثیر اور اعانت کے لئے باقاعدہ مصری فوج کے اُمیدوار تھے۔ تاہم ترکوں نے داد جوانمردی دی اور حسب قواعد جنگ چار طرف مورچے بناکر دشمن کے حملوں کا جواب دیا اور بدوی فوج کو نقصان کثیر پہنچایا اور جب ہجوم کرکے آئے ناکام واپس کر دیا۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی اور جانبین سے دن رات گولیاں چلتی رہیں اور ترکی فوج اپنے مورچوں سے توپ کے گولے بھی دُشمنوں کے مجمع پر برساتی رہی۔ اس کے بعد شریف صاحب کی مدد کے لئے وُہ مصری فوجیں آگئیں جو جدّہ فتح ہونے کے بعد وہاں مقیم ہوئی تھیں اور جن کی مدد سے مکّہ معظّمہ اور اس کا قلعہ گولہ باری کرکے فتح کیا گیا تھا۔ اس فوج نے طائف کے گرد آٹھ جگہ اپنی توپیں نصب کرکے طائف کے قلعہ اور فوجی قیام گاہ پر گولہ باری شروع کی۔ ترکوں کی طرف سے بھی بقدر وسعت اس کا جواب دیا جاتا تھا۔ اسی طرح رمضان ختم ہوگیا اور عید کے روز بھی شریف صاحب کو رحم نہ آیا۔ بلکہ جس طرح ہمیشہ دوپہر تک گولہ باری ہوتی تھی عید کو بھی ہوئی۔

طائف اپنی سرسبزی میں مشہور ہے مگر ایک مختصر قصبہ ہے جس کے متعلّقات و دیہات پر بھی طائف کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ مواضعات و قطعات چونکہ محاصرین کے قبضہ میں آگئے تھے اس لئے جو غلّہ اور ترکاری اور میوے وغیرہ خاص قصبے میں آتے تھے ایّام جنگ میں اُن کا آنا بند ہوگیا اور یہاں سے باہر نکلنے کے راستے بھی مسدود ہوگئے۔ شہر میں سخت گرانی اور قحط ہوگیا۔ ایک آنہ والی روٹی کی قیمت آٹھ آنے ہوگئی۔ اور شریف کے لوگوں نے اُوپر کی جانب سے نہر کو بند کرکے قصبہ کو نمونۂ کربلا بنا دیا۔ اگر فوجی قیام گاہ کا کنواں موجود نہ ہوتا تو اہل شہر کو بالکل پانی میسّر نہ ہوتا اور پیاس سے مرجاتے۔

شہر میں جو کچھ غلّہ تھا وُہ ختم ہوگیا اور آمد بالکل بند اہل شہر اور فوج کے پاس غلّہ کا ایک دانہ[۱] نہ رہا۔ کھانے کے قابل کوئی چیز نہ رہی۔ ضعیف مسلمان عاجز آگئے اور ہیچ

---

[۱] آفرین ہے ترکوں پر کہ فاقہ پر فاقہ کرکے چھ ماہ تک باغی فوج کا مقابلہ کیا اور جب تک ہاتھوں میں دم رہا دشمنوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے ۱۲۔

اُٹھے۔ ہر طرف سے راہ فرار بند تھی بہت سے آدمیوں نے فاقہ کی شدّت سے عاجز آکر بھاگنا چاہا۔ بہت کم کامیاب ہوئے اور اکثروں نے جانبین کی افواج کے مقابلہ و مقاتلہ کی زد میں آکر جان شیریں ہاتھ سے دی۔

ہمارے بزرگوں کی جماعت پر بھی ہر قسم کی تکالیف آئیں اور شدت و سختیاں اُٹھائیں جو کچھ نقد پاس تھا باوجود کفایت شعاری کے سب خرچ ہوگیا۔ ایک مخلص ہندی تاجر نے کچھ چاول دیدیئے تھے کچھ روز اُن پر گذران ہوا چونکہ شکر نایاب تھی کبھی شہد ڈال کر مقدار قلیل پکا لیتے اور اکثر مرتبہ صرف نمک ڈال کر چاول ابال لیتے۔ کبھی شہد سے شیریں کرکے چاء پکاتے اور اسی پر قناعت کرتے۔ اسی قید و محاصرہ اور عسرت میں رمضان کا مُبارک مہینہ گذُرا ؎

تیس دِن خوب رہا فاقہ کشی کا پردہ
آگئی عید جو روزے رمضان کے آئے

اگرچہ جوع و عطش کی تکالیف نے بے انتہا لذائذ روحانی اور نورانیت معنوی کا اضافہ کیا لیکن حرم کعبہ میں رمضان المبارک کی بہار لوٹنے کی آرزو اور تازہ آب زمزم سے روزہ افطار کرنے کی تمنا اور خانہ کعبہ کے سامنے تراویح پڑھنے کا ارمان سب دل میں رہ گئے ؏

اے بسا آرزُو کہ خاک شُدہ

مُصیبت اور بدامنی کی وجہ سے مساجد میں تراویح وغیرہ کا بھی کچھ انتظام نہ تھا وہاں سب سے زیادہ بارونق بڑی مسجد حضرت ابن عباس رضؓ کی مسجد ہے اس میں بھی صرف چند مسلمان آکر اَلَمْ تَرَ کَیْفَ سے تراویح پڑھتے تھے، باقی لوگ ہر وقت چلنے والی اور سروں پر سے گذرنے والی گولیوں کے خوف سے اپنے مکانوں پر نماز پڑھتے تھے۔ لیکن ایک روز بعد مغرب کے نوافل وغیرہ میں مشغول تھے کہ مسجد کے قریب جو ترکوں کا مورچہ تھا اس پر بدوؤں نے ہجوم کیا اور مسجد کی چھت اور میناروں پر جو ترکی دستہ تھا اس نے اور مورچہ کے سپاہیوں نے جواب دینا شروع کیا طرفین میں نہایت زور

سے گولی چلی اور عرصہ تک گولیوں اور گولوں کی بارش ہوتی رہی۔ چونکہ مسجد میں بھی گولیاں بس رہی تھیں اس لئے اُس روز تراویح نہیں ہو سکی۔ جو لوگ مسجد میں پہلے سے موجود تھے۔ وُہ ایک محفوظ گوشۂ مسجد میں بیٹھ رہے اور صرف عشا کی فرض نماز چند آدمیوں نے مل کر جماعت سے ادا کی۔ اس کے بعد دوستوں کے سمجھانے اور سید امین صاحب کے اصرار سے قیامگاہ کے متصل اور قریب مسجد میں پنجوقتہ نماز اور تراویح با جماعت پڑھنے لگے چونکہ اب تک مولانا حسین احمد صاحب نے قرآن مجید حفظ نہیں کیا تھا اس لئے تراویح اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ سے ادا کی جاتی اور اس کے بعد حضرت مولانا اور رفقا مسجد ہی میں نوافل و ذکر اللہ میں مصروف رہتے اور سحر کے قریب واپس آکر چاول وغیرہ پکا کر سنتِ سحر کی برکت حاصل فرماتے۔ بہر حال اسی طرح روزے رکھے نمازیں پڑھیں شب بیداری کی اور ماہ صیام قید محاصرہ میں ختم ہو گیا۔ بقول مولانا حسرت سہ

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

عید کے بعد جب قحط اور گرانی کی شدت ہوئی اور اہل شہر بھوک کے مرنے لگے تو حکام کے پاس جا کر شکایت کی کہ غلہ سب ختم ہو چکا شیر دار حیوانات اور سواری کے جانور سب ذبح ہو کر ختم ہو گئے۔ اب کھانے کی کوئی چیز باقی نہیں رہی اور لوگ فاقہ سے مرے جاتے ہیں۔ اب کوئی صورت نجات کی بتانا ہے۔ حکام نے کہا کہ جو لوگ باہر جانا چاہیں ان کو جانے کی اجازت دی جائے گی۔ ہماری طرف سے کوئی مزاحمت و نقصان نہیں ہوگا۔ شریف کی محاصر فوج اگر نقصان پہنچائے تو ہم ذمہ دار نہیں۔ چونکہ طائف میں بھی بھوک کی وجہ سے موت نظر آرہی تھی اس لئے لوگوں نے اجازت کو غنیمت سمجھا اور آئندہ خطرات کی پرواہ نہ کی اور روانگی شروع ہو گئی۔ صبح کو آٹھ بجے سے بارہ بجے تک روانگی اور اجازت کا انتظام رہتا ہر شخص کو اجازت نامہ کا فارم جس میں اس کا اور اس کے اہل وعیال کا نام درج ہوتا تھا۔ دیا جاتا تھا۔ اور اپنے ضروری اسباب کے ساتھ باب ابن عباس سے رخصت کر دیا جاتا تھا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد بعض خوش

قسمت کسی طرح جان سلامت لے کر مکّہ معظّمہ کی طرف پہنچ جاتے تھے اور بعض بیچارے راستے ہی میں شریف کے بدّوؤں کی بندوقوں کا شکار ہو جاتے۔

حضرت اور آپ کے صابر رفقاء نے نہایت صبر سے کام لیا اور دو ماہ سے زائد تکالیف برداشت کرتے رہے لیکن آخرکار انسان تھے طاقت ختم ہوگئی سعی نہ کرنا اور بے دست و پا بن کر جان دینا خلافِ مرضی مولا تھا۔ جب اور لوگ نکلنے لگے تو انہوں نے بھی ارادہ کرلیا اور ۶ رشوال ۱۳۳۴ھ کو باب ابن عباس پر آئے۔ اکثر لوگ اس طائفہ صالحین سے واقف اور ان کے قدر شناس تھے۔ اس لئے محصور ترکوں نے بہت آسانی سے باقاعدہ اجازت دے دی لیکن خطرۂ جان سے مطلع کر کے ڈرایا کیونکہ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد گولوں کے ٹکڑے ٹوٹ کر چار طرف بکھر جاتے تھے مگر چونکہ ٹھہرنے میں بھی موت کا سامنا تھا اس لئے تن بہ تقدیر نکل کھڑے ہوئے اور مختلف راستوں سے گزر کر گولیوں سے بچتے ہوئے حافظِ حقیقی کی حفاظت میں شریف کی فوج کے صدر مقام میں پہنچ گئے جہاں ان کے بیٹے عبداللہ بیگ بدوؤں کی فوج کی کمانداری پر مقیم تھا اور مصری فوج بھی وہیں خیمے لگائے ہوئے تھی عثمان آفندی ایک افسر مولانا حسین احمد صاحب کے قدر دان تھے اور خود عبداللہ بیگ بھی ان کے فضل و کمال سے ناواقف نہ تھا۔ توقیر و تعظیم سے ٹھہرایا۔ حضرت سے بغایت تعظیم پیش آیا۔ سب جماعت کی نہایت مدارات کی۔ قیام کے لئے ایک خاص خیمہ نصب کرایا اور مہمانداری کے لئے دُنبہ ذبح کرنے کا حکم دیا (جس کو عرب میں مہمان کا نہایت اعزاز و اکرام سمجھا جاتا ہے) اور کچھ انجیر وغیرہ میوے بھیجے اور ایک اشرفی نذر کی اور خود کہہ کر رات کو بھی وہیں ٹھہرایا اور علی الصبح اپنے پاس سے کرایہ دے کر ایک اونٹ کا انتظام کر دیا اور مناسب توشہ ہمراہ کر کے بہ سلامت و عافیت مکہ کی طرف رخصت کر دیا چونکہ اسباب بھی ساتھ تھا اور حضرت مولانا نہایت ضعیف تھے تین دن تک پہاڑی راستہ قطع کرنا نہایت دشوار تھا اس لئے اس اونٹ کا مل جانا نہایت غنیمت معلوم ہوا اور یہ چاروں اہل خیر خدا کا شکر کرتے ہوئے اس شدید مہلکہ اور محاصرہ سے نجات پا کر دسویں شوال کو علی الصبح غلاف کعبہ کے سایہ میں پہنچ گئے۔

گرفتاری سے پہلے کے بعض واقعات
اور
سلسلۂ تفتیش و تحقیقات

مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی واپسی اور گرفتاری

یہاں ایک درمیانی واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ (جیسا ابھی مفصل معلوم ہُوا ہے) جب حضرت مولانا ماہ رجب میں مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آئے اسی وقت مولانا خلیل احمد صاحب مدرس اوّل مدرسہ اسلامیہ سہارنپور نے بھی (جو حضرت مولانا سے چند روز قبل ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے اور گزشتہ حج اور مدینہ منورہ کے قیام میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ شریک تھے) مدینہ منورہ سے واپس آکر مکہ معظمہ میں قیام کیا۔ حضرت مولانا چند روز قیام کے ارادہ سے طائف تشریف لے گئے اور حصار کی وجہ سے رمضان المبارک میں باوجود صد حسرت و آرزو مکہ معظمہ واپس آنے سے مجبور رہے ۔ مولانا خلیل احمد صاحب نے جنگ و جدال کی وجہ سے مکہ معظمہ کی بدامنی اور گرانی کی وجہ سے پریشان ہو کر اور اپنی بعض ضرورتوں سے دُوسرے حج سے پہلے ہی بماہ شوال واپسئ ہندوستان کا ارادہ فرمایا اور یہ خیال کہ خُدا جانے حضرت مولانا کب طائف سے نجات پائیں اور مکہ معظمہ پہنچیں یہ ہندوستان جانے والے جہاز کی خبر سن کر جدہ تشریف لے گئے وہاں معلوم ہُوا کہ جہاز میں دیر ہے اس لئے انتظار میں ایک ماہ جدہ میں مقیم رہے ۔ جب جہاز آیا تو مع متعلقین و ہمراہیاں سوار ہو کر بماہ ذیقعدہ بمبئی پہنچ گئے ۔

اہل ہندوستان کو مکہ معظّمہ کے پورے حالات اور مولانا کی ضروریات کا علم نہ تھا اس قدر قرب زمانۂ حج میں واپسی سے نہایت تعجّب ہوا تاہم معتقد و متوسل لوگ بمبئی اور دہلی استقبال کے لئے حاضر ہوئے مگر وہ یہ سُنکر حیران رہ گئے کہ مولانا صاحب گورنمنٹ کی جانب سے بمبئی میں روک لئے گئے اور دو تین روز میں معمولی اظہارات و بیانات لے کر سرکاری نگرانی میں نینی تال پہنچا دیئے گئے اور وہاں بعزت و احترام ٹھہرائے گئے۔

ضلع مظفّر نگر کے ایک معزز مولوی سیّد ہادی حسن صاحب بھی جن کا نام آپ نے حضرت کے ابتدائی ساتھیوں میں پڑھا ہے جہاز کے انتظار میں جدّہ آگئے تھے اور اتفّاق سے واپسی ہندوستان کے وقت اسی جہاز میں مولانا سہارنپوری کے ہمراہ ہو گئے تھے۔ بمبئی سے مولانا کے ساتھ یہ بھی نینی تال روانہ کئے گئے۔

ان حضرات کا قیام نینی تال میں طویل ہوا، اور مولانا صاحب سے متعدد مرتبہ تفصیل و تشریح کے ساتھ بیانات و اظہارات لئے گئے اور مختلف طرز سے سوالات کئے گئے (اہل ہند ان سوالات و جوابات اور بیانات سے بالکل ناواقف ہیں، البتہ یہ معلوم ہے کہ مالٹا میں یہ سب مجموعہ حضرت شیخ الہند کے پیش نظر کر دیا گیا تھا، مگر ان کی عالی ظرفی نے اس کو راز سے آگے نہ بڑھنے دیا) جس قدر قیام کو طول ہوتا جاتا تھا ہندوستان کے دیندار طبقے میں تشویش بڑھتی جاتی تھی۔ اہل اسلام عموماً اور مولانا صاحب کے خدام و مخلصین خصوصاً مضطرب تھے۔ لیکن کسی آئینی یا غیر آئینی طریقہ سے ناراضی کا اظہار نہیں کیا گیا اور بے موقع خاموشی اور صبر کے ساتھ بیٹھے تھے۔

حضرت شیخ الہند کے بعد ہندوستان میں تقدّس و مقبولیت میں مولانا صاحب ہی کا درجہ سمجھا جاتا ہے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ ارشد ہونے کے علاوہ مولانا صاحب سے دارالعلوم دیوبند کو اور بھی بہت سے قابل احترام تعلقات ہیں (جن کی طویل تفصیل ہے) لہٰذا دارالعلوم دیوبند کے متعلقین کی کلفت کو محسوس کر کے اور عام اہل اسلام کے اضطراب کو دیکھ کر مولانا حافظ

محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم مدظلہم خاموش نہ رہ سکے اور چند معزز علماء کو بصورت وفد لے کر تکلیف سفر برداشت کرتے ہوئے نینی تال پہنچے اور لفٹنٹ گورنر صاحب کی خدمت میں باریاب ہوئے۔

اس وفد کے پہنچنے کے دوسرے ہی روز مولانا صاحب بعزت واحترام بالکل آزادی سے نینی تال سے رخصت کر دیئے گئے اور سب اراکین وفد مولانا کے ساتھ ہی واپس آئے۔ دیوبند میں اسٹیشن پر علماء و طلباء نے شاندار استقبال کیا اور عظیم الشان مجمع کے ساتھ دارالعلوم میں تشریف لائے دعا فرمائی اور دوسری گاڑی سے سہارنپور تشریف لے گئے۔

مولانا ممدوح کی بلا شرط رہائی پر اہل اسلام کو عموماً اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین علمائے دیوبند وغیرہ کو خصوصاً نہایت مسرت ہوئی۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت مولانا ایک مقبول عالم دین اور مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ راشد ہیں اور یقین ہے کہ آپ کے منہ سے کلمۃ الحق کے سوا کچھ نہ نکلا ہوگا لیکن خدا جانتا ہے کیا صورت پیش آئی۔ افسران تفتیش نے آپ کے بیان سے کچھ غلط معنے استنباط کر لئے جس کے بعد بطور نتیجہ اور ثمرات کے متواتر تحقیقات اور متعدد حضرات کے اظہار و بیانات لینے کی نوبت آئی۔ اور مکہ معظمہ میں حضرت کی گرفتاری کا واقعہ پیش آیا۔ یا اتفاقیہ طور پر مولانا کے بیان کے بعد گورنمنٹ نے دوسرے لوگوں کے بھی اظہار و بیان لینا مناسب سمجھا اور حضرت شیخ الہند کو نظر بند کرنے کا قیامت تک فراموش نہ ہونے والا الزام اپنے سر لیا۔

بہر حال تحقیقات کا سلسلہ نہایت اہتمام سے شروع ہوا۔ نینی تال میں سید ہادی حسن صاحب سے تشدد کے ساتھ بیان لئے گئے۔ ان کی نسبت گورنمنٹ کو مخبری کی گئی تھی کہ حضرت مولانا نے جمال پاشا اور انور پاشا سے اہل ہند کو بھڑکانے کے لئے تحریرات اور عہد و میثاق لے کر ایک صندوق کے تختوں میں چھپا کر ان کی معرفت ہندوستان روانہ کئے ہیں۔ اسی شبہ پر ان کی عدم موجودگی میں ان کے مکان پر

تحقیقات کے لئے گارد اور دوڑ چڑھ گئی (اس لئے کہ اُنہوں نے اپنا تمام اسباب بمبئی سے اپنے مکان پر بھیجدیا تھا) ۔ اور جس صندوق کا پتہ دیاگیا تھا اس کے ہر ہر تختہ کو توڑکر اور چیر کر دیکھا مگر اس باطل خبر کا کچھ ثبوت نہ ملا اور کاغذات کا ایک پرچہ بھی نہ نکلا جب موجود ہی نہیں تھا تو نکلتا کہاں سے ۔ سیّد صاحب عرصہ تک نظر بند و پریشان رہ کر مولانا سہارنپوری کی واپسی کے بعد کہیں بدشواری نجات پاکر تکلیف اُٹھاتے ہوئے واپس ہوئے اور حضرت مولانا سہارنپوری ابھی نینی تال سے واپس بھی نہیں ہوئے تھے کہ مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب (جو حضرت کے ہمراہ جاکر صرف حج بیت اللہ کرکے واپس آگئے ہیں) اپنی ملازمت لکھنؤ سے نینی تال طلب کئے گئے اور اظہارات و سوالات کے بعد جلد ہی رخصت کر دیئے گئے ۔

حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) کے داماد مولوی محمد حنیف صاحب اور خادم خاص مولوی محمد جلیل صاحب علیحدہ علیحدہ الہ آباد وغیرہ سے بلائے گئے اور طرح طرح کے سوالات کے جواب اور اظہار لئے گئے اور سوالات کے جواب میں آزمائے گئے ۔ دیوبند میں حضرت مولانا کی اہلیہ صاحبہ محترمہ اور برادر صاحبان اور دارالعلوم دیوبند کے بعض متعلقین اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہم سے افسران تحقیق نے خود آکر بہت سے سوال وجواب کئے حکیم عبدالرزاق صاحب دہلوی ۔ مولانا سیّد مرتضیٰ حسن صاحب ، مولانا محمد سہول صاحب اور بہت سے لوگوں کے اظہار مختلف مقامات پر ہوئے ۔

عجب تشویش کا زمانہ تھا حضرت مولانا کے متعلقین و متوسلین خائف و ہراساں رہتے تھے کیونکہ محکمہ تفتیش کا تشدد جوش پر تھا اور ذرا ذرا سے تعلقات پر اظہار و نظر بندی کی نوبت آتی تھی ۔ مولوی حمداللہ صاحب پانی پتی (جو ہندوستان میں حضرت کے ترجمۂ قرآن مجید کے کاتب تھے) گرفتار ہوئے بیانات لئے گئے تکلیفیں اُٹھائیں ، اور عرصہ دراز تک نظر بند رہ کر حضرت کی تشریف آوری سے کچھ پہلے رہا ہوئے ۔ کئی جگہ خانہ تلاشیاں بھی ہوئیں مگر کسی جگہ بھی کوئی ذرا سی بھی مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی ۔

حضرت مولانا کے عزیزیہ بھانجے مولوی مسعود احمد صاحب جن کا دُوسرے حج کے بیان میں عنقریب ذکر آتا ہے ۔ حج ادا کرنے کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب سے چالیس

روز تک پیچھے ہندوستان پہنچے تو ان کو بمبئی میں روک کر شبا شب الٰہ آباد پہنچایا گیا اور عرصہ دراز تک زیرِ حراست رکھ کر اور بار بار مفصل و مشرح بیانات لے کر ایذا رسانی اور تشدّد کے بعد رہا کئے گئے۔

ہندوستان میں ذو لعقدہ ۱۳۳۴ھ سے لے کر ایک سال بلکہ کچھ زائد عرصہ تک یہ سلسلے جاری رہے (ان کی تفصیل سے نہ کچھ فائدہ ہے نہ دلچسپی اس لئے اختصار و اجمال پر اکتفا کیا گیا) اب انہیں ایام میں حرم محترم میں حضرت مولانا کو جو حالات پیش آئے ان کو ملاحظہ کیجئے اور ان تحقیقات کے نتائج میں گرفتاری اور نظر بندی کے قیامت تک فراموش نہ ہونے والے واقعات و تکالیف کی تفصیل سنئے۔

حرم محترم سے گرفتاری اور نظر بندی اور قاہرہ کی قید تنہائی

طائف کے حصار سے نجات پاکر مکہ معظمہ پہنچے تو حضرت مولانا کو معلوم ہوا کہ مولانا سہارنپوری[۱] نے ہندوستان کا قصد کر دیا ہے اور انتظارِ جہاز جدہ میں مقیم ہیں۔ طبعی مروّت اور دینی محبّت سے رفقاء و خدام کو ہمراہ لے کر ملاقات کے لئے جدّہ تشریف لے گئے۔ مولینا مع متعلقین رامپور کی رباط کے بالائی طبقہ میں فروکش تھے وہیں حضرت نے درمیانے درجہ میں قیام فرمایا۔ اور جہاز میں دیر ہو جانے کی وجہ سے پندرہ روز قیام کرنا پڑا اور جب تک مولانا ممدوح اور ان کے ہمراہی جہاز پر سوار ہو کر بطرف ہندوستان روانہ نہ ہو گئے بکمالِ اخلاق تکلیف برداشت کر کے جدّہ ہی میں مقیم رہے اور رخصت کرنے کے لئے جہاز تک تشریف لے گئے۔

---

[۱] حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رح

شیخ الہندؒ کا مکہ معظمہ میں قیام

مکہ معظمہ واپس آکر خاموشی سے اپنی جماعت کے ہمراہ دینی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ طلبہ کے اصرار پر مولانا حسین احمد نے حرم شریف میں حدیث وغیرہ کی بعض کتابوں کا درس جاری فرما دیا۔ مغرب کے بعد حرم شریف میں حضرت کے خدام و متعارف حضرات آکر خدمت میں بیٹھتے۔ علمی بحثیں اور دینی باتیں ہوتی رہتیں۔ دن کو حضرت اپنے مکان اقامت میں بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔ یہاں چونکہ بعض لوگ ہندی تھے اور اکثر حاضرین اردو سمجھنے والے تھے اس لئے اردو میں تقریر فرماتے تھے۔

مکہ معظمہ میں بھی اگرچہ گرانی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اور ضروریات زندگی میسر نہ ہونے سے ساکنان حرم خداوندی نہایت تکالیف برداشت کر رہے تھے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا۔ گو نہایت گراں قیمت دینی پڑتی تھی۔ گرانی کی تکالیف برداشت کر کے حرم کعبہ کے فیوض حاصل کرتے ہوئے ایام حج قریب آجانے پر ان حضرات نے ادائے حج کا تہیہ فرمایا انہیں ایام میں حضرت کے داماد اور بھانجے قاضی مسعود احمد صاحب ہندوستان سے پہنچ گئے جن کو حضرت کی اہلیہ صاحبہ محترمہ اور حکیم عبدالرزاق صاحب دہلوی نے حضرت کے مصارف کی اعانت کے لئے روپیہ دے کر بھیجا تھا کیونکہ ہمراہ لایا ہوا روپیہ اس وقت تک تقریباً سب خرچ ہو چکا تھا۔ قاضی صاحب اور اس وقت آنے والے دیگر حجاج کی زبانی معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کی نظریں حضرت مولینا پر بہت سخت پڑ رہی ہیں اور بدظنی کے ساتھ آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے جو آگبوٹ ہندوستان پہنچتا ہے اس پر حضرت مولانا کی تفتیش کی جاتی ہے اور مولانا سہارنپوری گرفتار کر کے نینی تال روانہ کر دیئے گئے۔

حضرت نے جو حج کے بعد ہندوستان کا قصد فرما رکھا تھا ان حالات کو سن کر دل سے نکال دیا۔ حج کو چھوڑ کر جانے کا تو پہلے سے بھی خیال نہ تھا۔ اس لئے

اسی کے انتظام میں مصروف ہو گئے ۔

سب حضرات نے باقاعدہ احرام باندھ کر مناسک حج ادا فرمانے شروع کئے اور بعافیت تمام ضروریات و مستحبات سے فراغت پائی ۔ شریف صاحب اور ترکوں کی جنگ کی وجہ سے مدینہ منورہ کا راستہ نہایت خطرناک بلکہ ناقابل گذر ہو رہا تھا ۔ قافلوں کی آمد و رفت کی کوئی امید نہ تھی ۔ اس لئے مولوی مسعود احمد صاحب بعد ادائے حج وعمرہ اخیر ماہ ذی الحجہ ہندوستان واپس ہو گئے اور حضرت مولانا اور باقی رفقا مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے ۔

مولوی مسعود احمد صاحب پر گورنمنٹ کو شبہ ہو گیا تھا کہ یہ کسی سازش کے لئے کوئی تحریر وغیرہ ہندوستان سے لے کر روانہ ہوئے ہیں ۔ یا حضرت مولانا کے پاس سے کوئی چیز لانا منظور ہے ۔ اس لئے روانگی کے بعد عدن پہنچنے پر ان کی سخت تلاشی لی گئی مگر کوئی چیز برآمد نہ ہوئی اسی طرح واپسی میں جہاز پر آکر بہاء الدین انسپکٹر خفیہ نے ان کا تمام اسباب دیکھ ڈالا لیکن اپنے مقصد میں ناکامیاب رہا ۔ بایں ہمہ صفائی ان کو بمبئی سے زیر حراست کر کے الٰہ آباد بھیجا گیا ۔

شریف مکہ کے حق میں فتویٰ لینے کی مہم

اور

شیخ الہند کا اس سے انکار

ہندوستان میں شریف کی بغاوت کی خبریں پہنچیں ان کی طرف سے عام بدظنی پھیل رہی تھی اور اخبارات میں اس پر بڑی بحث ہو رہی تھی علمائے حقانی کے فتوے شریف صاحب کے فعل کو قابلِ ملامت قرار دیتے تھے اور بعض لوگ گورنمنٹ برطانیہ کی ناراضی کے اندیشہ سے خاموشی حق پوشی یا مصلحت اندیشی کو ترجیح دے رہے تھے ۔

انہیں ایام میں اورنگ آباد دکن کے رہنے والے ایک شخص خان بہادر مبارک علی ہندوستان سے روانہ ہوکر زمانۂ حج میں مکہ معظمہ پہنچے۔ نہایت لسّان آدمی تھے۔ خوب لن ترانیاں ہانکتے تھے۔ ہر مجلس میں ترکوں کی مذمت کرتے تھے اور شریف صاحب کی مدح سرائی۔ شریف صاحب کے دربار میں یہ کہہ کر رسوخ حاصل کیا کہ میں گورنمنٹ ہند کا فرستادہ آیا ہوں تاکہ حجازکے اصول معلوم کرکے واقعی باتیں ہندوستان میں ظاہر کروں کیونکہ وہاں اس وقت شریف صاحب کی طرف سے عام بدظنی پھیل رہی ہے علما ان کو باغی کہتے ہیں اور شریف صاحب کی اعانت کا الزام دیکر اخبارات و مجالس حکومت برطانیہ پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

اس مقصد کے لئے ایک استفتا اور اعلان کا مرتب ہونا ضروری بتلایا جس میں ترکوں کے عیوب ظاہر کئے جائیں اور ان کی حکومت کی برائیاں بیان کرکے ان کے مستحق خلافت و حکومت ہونے کی پُر زور تردید کی جائے اور موجودہ انقلاب کے فوائد اور حکومت عربی کے محاسن ذکر کئے جائیں۔ شریف صاحب اور ان کے ماتحتوں کی اعانت سے اسی مضمون کا مفصل محضر اور فتویٰ تیار کرلیا گیا اور مبالغہ آمیز واقعات کی بنا پر ترکوں کو ملحد اور کافر ثابت کرکے شریف صاحب کی خودسری اور عدم اطاعت کو حق بجانب ثابت کیا گیا اور مکہ معظمہ کے ان علماء نے جو صاحب عزت و جاہ سمجھے جاتے تھے اور دربار شریفی میں دخل رکھتے تھے اپنی غلط فہمی یا خوف سے اس پر مہر و دستخط کردیئے۔

یہ تحریر مرتب ہوکر جب سرکاری خان بہادر کے پاس پہنچی تو کہا کہ ان علماء کی تصدیق سے کچھ فائدہ نہیں ہے ہندوستان میں کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ ان کی تصدیق سے کون تسلیم کرے گا۔ البتہ اگر حضرت مولانا محمود صاحب، علمائے ہند میں ایک مشہور و مسلّم عالم ہیں۔ ان کے اور دیگر علمائے ہند کے دستخط و مواہیر ہوجائیں تو تحریر مفید ہوسکتی ہے۔ شریف صاحب کے دار المشورہ میں اس رائے کو سب نے پسند کیا اور مکہ معظمہ کے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج نے نقیب العلماء کی معرفت

اس تحریر کو حضرت مولانا کے پاس بھیجا۔ محرم ۱۳۳۵ء کی آخری تاریخیں تھیں جب عصر کے بعد وہ اس کو لے کر مولانا کی خدمت میں مکان پر پہنچا جہاں آپ مقیم تھے اور بخاری شریف کا درس دیتے تھے تحریر کا عنوان دیکھ کر حضرت مولانا اور مولوی حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ اس کی پیشانی پر جب یہ لکھا ہے کہ "من علما المکۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی" تو جو شخص نہ علماء مکہ میں سے ہو نہ اس نے کبھی حرم شریف میں درس دیا ہو اس پر کچھ لکھنے یا تصدیق کرنے کا کیسے استحقاق رکھ سکتا ہے۔ مولینا حسین احمد صاحب نے اپنے سابق تعارف کے اعتماد پر نقیب صاحب کو خوب سمجھا دیا کہ تم شیخ الاسلام سے صرف یہی وجہ ظاہر کرنا اور کہہ دینا کہ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا ہے کہ اس کا عنوان اہل مکہ اور مدرسین کے ساتھ خاص ہے میں ایک آفاقی اور پردیسی شخص ہوں مجھے حق نہیں کہ اس پر کچھ لکھوں "۔ اگر وہاں سے پھر اصرار ہوا تو ہم دوسری وجوہ ظاہر کریں گے کہ اس تحریر میں مطلقاً قوم ترک کی تکفیر کی گئی ہے۔ حالانکہ تکفیر مسلم کے متعلق احادیث میں جو کچھ وعید اور کتب فقہ میں جس قدر احتیاط کا حکم ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور سلطان عبدالحمید خاں کے معزول کرنے اور تخت سے علیحدہ کر دینے پر ترکوں کی تکفیر کی ہے حالانکہ محض اس فعل سے شرعاً ہرگز کفر ثابت نہیں ہوتا اور سلاطین آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا ہے جو خلاف نصوص شرعیہ ہے نیز موجودہ انقلاب اور ترک اطاعت خلیفہ کو مستحسن قرار دیا ہے حالانکہ یہ شرعاً مذموم و قبیح ہے۔ یہ سب کچھ سمجھا کہ نقیب العلماء کو مکرر تاکید کر دی گئی کہ ان وجوہ کو ابھی ظاہر نہ کرنا۔

یہاں سے ناکامیاب ہو کر نقیب العلماء اسی وقت واپس ہو گئے اور پھر نہ کوئی جواب لاتے نہ دوبارہ تحریر لائے۔ لیکن تمام شہر میں یہ مشہور ہو گیا کہ حضرت مولانا ہندی نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے اور خان بہادر اور ان کے معین و مددگار سید احمد دوکاندار مکہ اور قاری عبدالحق ہندوستانی بہت رنجیدہ اور برافروختہ ہوئے اور دل میں غیظ و غضب چھپائے رہے۔ مکہ معظمہ میں جو چند دین دار حقانی عالم

تھے وہ پہلے سے نہایت خوفزدہ اور متردد ہو رہے تھے کہ دیکھئے کیا پیش آوے وُہ فتویٰ ضرور ہمارے پاس آوے گا۔ اگر تصدیق کرتے ہیں تو دین و دیانت کی خیر نہیں اور اگر انکار کرتے ہیں تو حرم محترم کی اقامت و مجاورت ہاتھ سے جاتی ہے اور جان کا خطرہ ہے حضرت مولانا کا وجود اِن کے لئے رحمت ہو گیا۔ اِدھر تو انکار کے لئے معقول عذر ہاتھ آ گیا۔ دوسرے حضرت کے ثبات و استقلال سے ان میں بھی قوت ایمانی کو جوش ہوا اور انکار کی ہمّت بندھی اور بڑی بات یہ ہے کہ حضرت کے انکار کے بعد اس تحریر کو پیش کرنے والے کچھ ایسے ہمت شکستہ ہو گئے کہ اور کسی عالم کے سامنے پیش ہی نہ کیا۔ بہت سے دیندار بزرگ عالم ہندوستانی وغیرہ حضرت کی برکت سے خلجان سے بچ گئے۔

شیخ الاسلام صاحب کو خُدا جانے خود تنبہ ہوا یا نقیب العلماء نے ہمارے بزرگوں کی بیان کردہ وجوہ ظاہر کر دیں بہرحال اُنھوں نے عبارت سابقہ کو بالکل بدل کر ایسی تحریر مرتب کی کہ ترکوں کے تکفیر کی بحث اور ذکر اس میں نہ رہا۔ تاہم حضرت مولانا یا کسی دُوسرے عالم کے پاس دوبارہ نہیں بھیجا بلکہ صرف پہلے دستخط کرنے والے علماء سے اس جدید تحریر پہ دستخط و مہریں کرا کر خان بہادر کے حوالے کیں اور اسی کی نقل مکۂ معظمہ کے اخبار "القبلہ" میں شائع کر دی۔ خان بہادر اور ان کے حواریوں کی محنت برباد ہونے سے شریف صاحب نہایت غضب ناک ہوئے لیکن کوئی تدبیر اختیار میں نہ تھی۔ گورنمنٹ برطانیہ کا رعب قلب میں اس درجہ تھا کہ حضرت اور آپ کے رفقاء کو برطانوی رعایا ہونے کی وجہ سے کسی زجر و توبیخ اور ایذا رسانی کا قصد کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ خیر خواہوں نے حضرت سے عرض بھی کیا کہ مبادا شریف آپ کو کوئی اذیت پہنچائے مگر آپ نے فرمایا کہ مذہبی حیثیت سے تحریر کی تصدیق کی گنجائش نہیں جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہو گا پیش آئے گا۔ پھر بھی ظاہری تدبیر سے غافل نہ تھے۔ چاہتے تھے کہ کسی طرح مخفی طور سے شریف کی حدود اختیارات سے باہر کہیں چلے جائیں لیکن چونکہ کئی آدمی تھے اور اسباب بھی ہمراہ تھا اس لئے کوئی صورت نہیں نکلتی تھی

خان بہادر نواس تحریک کو لے کر ہندوستان واپس آ گئے اور غالباً ناکافی اور بیہودہ سمجھا جانے کی وجہ سے ہندوستان میں اس کی اشاعت ملتوی رہی۔ مگر شریف صاحب کی نظر میں یہ طائفۂ اہل حق خار نظر آتا تھا اور اپنی ناکامی کے غیظ میں بیٹھے دانت پیس رہے تھے کہ سوء اتفاق سے انہیں ایام میں ان حضرات کی طرف سے بدظنی پیدا کرنے والا ایک اور واقعہ پیش آ گیا۔

بدظنی پیدا کرنے کا ایک اور واقعہ

مولانا حسین احمد صاحب مکہ معظمہ کے مشہور و معزز ہندوستانی تاجر حاجی عبد الجبار صاحب کی دوکان پر تشریف رکھتے تھے۔ واللہ اعلم اتفاقیہ یا اپنی خفیہ مصالح سے اسی وقت سید احمد دوکاندار صاحب (جن کی دوکان پر جلد سازی کا کام ہوتا تھا اور خفیہ خبر رسانی کی وجہ سے شریف صاحب کے دربار تک رسائی ہو گئی تھی اور فتوے پر دستخط نہ کرنے کے جرم میں حضرت اور ان کے رفقاء سے کینہ رکھتے تھے) تاجر صاحب کی فرمائشی جلد تیار کرا کر دینے کے لئے آئے۔ تاجر صاحب نے جلد کو پسند کیا، لیکن انگریزی طرز کی جلد ہونے سے کچھ خوش نہ ہوئے۔ سید احمد دوکاندار نے کہا کہ چونکہ دونوں طرز مروج ہیں اس لئے اتفاقیہ ایسی تیار ہو گئی۔ مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ "دیکھئے کس قدر انگریزیت پھیلتی جاتی ہے پہلے تو یہ حالت نہ تھی"۔

سید احمد صاحب تو پہلے ہی سے جوش عداوت سے بے قابو ہو رہے تھے۔ "دیوانہ را ہوئے بس است۔" اب کہاں تاب تھی ریشہ دوانی کے لئے ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اور اس واقعہ کو خوب رنگین کر کے شریف صاحب تک پہنچایا کہ ہندی عالم کے رفقاء میں سے مولوی حسین احمد لوگوں میں عربی حکومت کی طرف سے خیالات فاسدہ اور نفرت کی اشاعت کرتے ہیں اور بدامنی پھیلانے کے لئے اس قسم کے الفاظ کہتے ہیں کہ "اب تو خانۂ خدا بھی انگریزیت کے اثر سے محفوظ نہیں رہا مکہ معظمہ میں ہر طرف انگریزی ہی انگریزی پھیل گئی"۔

شریف مکہ کی ناراضگی

خان بہادر کے استغناء کا مشہور اور حضرت رسالہ واقعہ دیکھ کر اور طالب دنیا مفتری لوگوں کی تراشی ہوئی تہمتیں سُن کر شریف صاحب ان حضرات سے بد دِل ہو ہی رہے تھے اس واقعہ نے رنجش اور کینہ میں اور اضافہ کر دیا۔ انتقام کی تدبیریں بے صبری کے ساتھ سوچ رہے تھے کہ غیب سے ایک سامان پیدا ہو گیا۔ یعنی سرکار برطانیہ نے حضرت مولانا کو اپنا مجرم سمجھ کر مع رفقا طلب کر لیا۔ اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں، اب کیا تھا، شریف صاحب کو ایذا دہی اور اخراج کا ایک موقع مل گیا۔ اور خدا تعالےٰ راضی ہوں یا ناراض اپنے پشت پناہوں کو خوشنود کرنے کا زرین موقعہ ہاتھ آیا۔

اس کی صورت یہ ہوئی کہ شریف صاحب جدّہ میں سرکار انگریزی کے معتمد افسر کرنیل ولسن سے ملنے گئے جو معاملات جنگ کا منتظم تھا۔ اسی کی وساطت سے جدّہ ہی میں حضرت مولانا کے متعلق سرکار برطانیہ کی طلبی معلوم ہوئی۔ شریف صاحب نے مکہ معظمہ واپس آنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ جدّہ ہی سے بذریعہ ٹیلیفون مکہ معظمہ میں شیخ الاسلام اور اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ "ہندی عالم اور ان کے رفقاء جدّہ بھیج کر افسران برطانیہ کی حفاظت میں دے دیئے جائیں"۔

شریف صاحب کی عدالت کے افسروں نے یہ حکم شیخ المطوفین کی وساطت سے حضرت کے پاس پہنچایا کہ "چونکہ گورنمنٹ برطانیہ نے جس کی تم رعایا ہو آپ کو ہم سے طلب کیا ہے لہٰذا آپ مع رفقاء کے چلنے کے لئے تیار ہو جائیں اور جس قدر سواریوں کی ضرورت ہو ہم کو بتلا دیں تاکہ انتظام کیا جائے"۔

صلحاء کی یہ جماعت جس کو اپنی یکسوئی اور تشغل فی العبادت اور زہد عن الدنیا اور اظہار حق کے سوا اپنا کوئی قصور ہی معلوم نہ تھا اس حکم کو سُنکر حیران رہ گئی اور حضرت کے مخلصین و خدام ہی نہیں بلکہ مکہ معظمہ کے تمام مسلمان سوائے چند کینہ پسند

لوگوں کے اس خبر سے بے چین ہو گئے مگر کیا کر سکتے تھے۔

شیخ الہندؒ کی شیخ الاسلام مکّہ سے گفتگو

حضرت مولانا کے رفقاء اور سیّد امین عاصم صاحب مطوف کے باہمی مشورے سے یہ رائے ہوئی ہم سب کو شریف صاحب کے دارالحکومت حمیدیہ میں جہاں حکام کا مرکز ہے شیخ الاسلام کے پاس چل کر گفت وشنید کرنی چاہیئے۔ وہاں پہنچ کر سید صاحب نے ان سب حضرات کو نیچے بٹھلا دیا اور خود جاکر شیخ الاسلام سے گفتگو کی۔ شیخ الاسلام نے فتویٰ کی تصدیق سے انکار کرنے کا جرم پیش کیا تو سید صاحب نے فرمایا کہ وہ سب حضرات نیچے موجود ہیں ان میں سے مولانا حسین احمد، عربی زبان میں آپ کو اصلیّت وحقیقت سمجھا سکتے ہیں ان کو بلا لیجئے۔

مولانا کو بلایا گیا تو حضرت سے اجازت لے کر اوپر گئے اور شیخ الاسلام کے ہر ایک سوال والزام کا سچّا اور صحیح جواب ایسے طرز سے دیا کہ شیخ الاسلام کو تسلیم کرنا پڑا۔ دستخطوں کے انکار کے جواب میں فرمایا کہ آپ نقیب العلماء سے دریافت فرمالیجئے۔ حضرت مولانا نے عذر فرمایا تھا کہ تحریر کا عنوان ہے "نحن علماء مکۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم المکّی" اور میں نہ مکّہ معظمہ کا عالم ہوں نہ مسجد الحرام میں پڑھاتا ہوں اس لئے اس پر دستخط کرنے کا مستحق نہیں۔ چنانچہ نقیب صاحب نے تصدیق کی کہ یہی عذر فرمایا تھا جدّہ کی روانگی کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں، کہ شریف کی واپسی تک اس حکم کی تعمیل ملتوی رکھی جائے تاکہ ہم اس معاملہ کے متعلق ان کی خدمت میں عرض ومعروض کرسکیں۔ کل کو وہ خود آجائیں گے۔ اگر خدانخواستہ راضی نہ ہوئے تو ہم لوگ تعمیل ارشاد کے لئے تیار ہیں۔

شیخ الاسلام نے کہا کہ یہ تو ہمارے حکم کی نافرمانی ہے۔ مولانا نے کہا کہ یہ استرحام ہے (یعنی رحم کی درخواست) اور بادشاہ سے بھی ہوسکتا ہے اور وزیر سے بھی۔ یہ سُنکر شیخ الاسلام اس معاملہ میں ذرا نرم ہوئے اور دوسرے الزامات کا ذکر کرنے لگے۔

شیخ الاسلام:۔ تمہارے شیخ سیاسی مجالس منعقد کرتے ہیں ؟
مولانا:۔ جناب کو غلط خبر پہنچائی گئی ہے مکان پہ بخاری شریف پڑھاتے ہیں اس کے پڑھنے اور سننے کے لئے لوگ جمع ہوجاتے ہیں کوئی سیاسی مجلس نہیں ہوتی۔
شیخ الاسلام:۔ سبق سے پہلے یا اس کے بعد کوئی سیاسی تذکرہ نہیں ہوتا ؟
مولینا:۔ ہاں کبھی بعد درس کے بعض ان امور کا جو اخباروں میں مذکور ہوتے ہیں ذکر ہو جاتا ہے جن کا تعلق آپ کے داخلی احکام و نظام سے نہیں ہوتا بلکہ امور خارجیہ سے۔
شیخ الاسلام:۔ کیا مغرب کے بعد بھی سیاسی مجلس نہیں ہوتی ؟
مولینا:۔ مغرب کے بعد بہت دیر تک حضرت نوافل پڑھتے رہتے ہیں اس کے بعد ہم چند خدام حضرت کے پاس رہتے ہیں نہ کوئی مجلس ہوتی ہے نہ امور سیاست کا تذکرہ۔
شیخ الاسلام:۔ آپ نے حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی کی دکان پر یہ کہا کہ یہاں پر سب امور و احکام انگریزی ہوگئے ہیں ؟
مولینا:۔ سب امور کو نہیں کہا بلکہ ایک شخص کتاب کی جلد افرنجی باندھ کر لائے تھے۔ میں نے کہا کہ افسوس سب چیزیں افرنجی پسند ہونے لگیں اور کسی کی طرف اشارہ نہ تھا۔
مولینا:۔ آپ ہر چیز کی تصدیق کیسے فرما لیتے ہیں ؟
شیخ الاسلام:۔ یہی لوگ خبر لانے والے ہیں۔ ان کی تصدیق نہ کریں تو فرشتے تو آنے سے رہے۔

اسی طرح اس مفصل ملاقات میں مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی قوت استدلال فصیح بیان سے اس جماعت کا بے قصور ہونا واضح کر دیا اور اخیر میں شیخ الاسلام نے ایک روز کی مہلت دے دی کہ کل شریف صاحب آجائیں تو خود گفتگو کر لینا۔ وہاں سے خوش ہو کر یہ سب حضرات واپس ہوگئے اور مولانا حسین احمد صاحب اپنی گفتگو کا حال راستے میں حضرت مولانا سے ذکر کرتے ہوئے چلے آتے۔

اس ملاقات کے بعد کچھ اطمینان نہیں ہوا تھا اور شریف صاحب سے بھی کچھ قوی امید شرافت کی نہیں تھی۔ اس لئے کبھی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ رات کو کسی طرف خفیہ نکل چلیں اور ان کے ہاتھ سے نجات پائیں۔ مگر چونکہ یہ امر بھی خالی از دشواری و صعوبت نہ تھا اس لئے حافظ عبدالجبار صاحب ناہر دہلوی کی اس رائے کو پسند کیا گیا کہ شیخ الاسلام سے حضرت کی صفائی ہو جائے اگر وہ مطمئن ہو گئے تو وہ شریف سے بھی خود کہہ سنکر رضا مند کر لیں گے۔ چنانچہ حاجی صاحب موصوف نے چند معزز حضرات کی معرفت شیخ الاسلام سے اس معاملہ میں گفتگو کرائی اور حالت کو امید افزا دیکھ کر مولانا حسین احمد صاحب کو شیخ الاسلام کی دست بوسی اور طلب معافی پر آمادہ کیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ دست بوسی تو آسان ہے حضرت کی راحت کے لئے مجھ کو شیخ الاسلام کی پا بوسی سے بھی عار نہیں اور آمادہ ہو گئے اور اسی روز مغرب کے بعد پہلے حاجی صاحب وغیرہ معزز حضرات خود شیخ الاسلام کے پاس پہنچے اور تھوڑی سی گفتگو کے بعد بعد آدمی بھیج کر مولانا حسین احمد کو بلا لیا۔ مولوی صاحب نے آکر شیخ الاسلام کے ہاتھ چومے اور معافی طلب کر کے ادب سے بیٹھ گئے۔ قہوہ کی تواضع ہوئی سب احباب قہوہ پی کر تھوڑی بیٹھ کر چلے آئے اور مطمئن ہو گئے کہ معاملہ رفت و گزشت ہو گیا اور گرفتاری کی خبر پر بالفعل جو سامان بہ عجلت تمام اپنے شیخ کو پوشیدہ طور پر کسی طرف پہنچا دینے کا کر رکھا تھا اس کو باطمینانِ خاطر روانہ ہونے کے خیال سے ملتوی کر دیا۔

یہ واقعات ہونے کے بعد رات کو کسی وقت شریف صاحب بھی مکہ معظمہ واپس آ گئے اور شیخ الاسلام نے صبح کو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حسبِ وعدہ مناسب سفارش کے ساتھ اس معاملہ کو پیش کیا اور کہا کہ وہ لوگ رات کو حاضر ہو کر معافی کے طلبگار ہوتے تھے اس لئے ان کو چھوڑ دیا گیا اور دیگر افسران حکومت نے بھی عرض حال کیا تو شریف صاحب نے شیخ الاسلام کی ایک نہ سنی اور نہایت برافروختہ ہو کر اپنے ماتحتوں کو اس تاخیر اور کوتاہی پر نہایت سرزنش کی کہ اب تک کیوں روانہ

نہیں کیا۔ فوراً روانہ کر دو۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شریف مکہ سے ملاقات اور شریف مکّہ کی دھمکی

مولانا حسین احمد صاحب کے علم وفضل سے شریف صاحب واقف تھے اور کسی قدر تعارف ذاتی بھی حاصل تھا۔ بعض خطوط بھی ہمراہ تھے کہ شاید بوقت ضرورت نافع ہوں۔ مولانا موصوف خود تشریف لے گئے۔ غم وغصّہ سے سینہ بھرا ہوا تھا۔ محترم اور بے قصور شیخ کی ہمدردی سینہ میں موجزن تھی۔ شریف صاحب سے باادب مگر بفصاحت وقوتِ استدلال تیزی سے گفتگو کر کے حضرت کی برائت اور شریف صاحب کے اس فعل کی نامعقولیت ثابت کی۔ شریف صاحب پہلے ہی سے ان کے اثر ووجاہت سے متردّد رہتے تھے اور دشمنوں کی افترا پردازیوں سے کان بھرے ہوئے تھے۔ جلد ساز کا بیان بھی فراموش نہ ہُوا تھا۔ اس ملاقات سے اور زیادہ خائف ہو گئے اور چشم دید جرأت وہمّت اور خداداد فصاحت سے نہایت متاثر ہوئے اور مولانا حسین احمد صاحب سے تہدید آمیز لہجہ میں کہا کہ "میں آپ کو سمجھوں گا"۔

مولانا حسین احمد صاحب کے بعد دہلی وغیرہ کے معزز تاجروں کا ایک وفد شریف صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ (جس کے ارکان کو حضرت کی عظمت و بے قصوری اور اپنی شخصیت ووقعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کامیابی کی پوری توقع تھی) اور بڑی مسرت ومستعدی سے شریف صاحب کی خدمت میں باریاب ہُوا اور عرض کیا حضرت مولانا ہندی ایک گوشہ نشین تارک الدُنیا خدا پرست متبحر عالم ہیں۔ دنیاوی امور فتنۂ وفساد اور معاملات سیاسی میں کبھی ملوث نہیں ہوئے ان کو بلا قصور گرفتار کر کے اعدائے اسلام کے کیوں سپرد کیا جاتا ہے اگر بالفرض والتقدیر وہ مجرم ہی ہیں تو آپ اپنی عدالت

ہیں ان سے باضابطہ مواخذہ فرماکر جس سزا کے وہ مستحق ہوں ان پر جاری کیجئے۔ اگر یہ مقدس ہندی عالم حرم محترم سے گرفتار کرکے غیر مسلم حکومت کے سپرد کر دیئے گئے تو حرم شریف کی توہین کا الزام آپ کے لئے قیامت تک باعثِ عار رہے گا اور تمام ہندیان مقیم مکّہ معظّمہ کی بھی خاص توہین ہوگی اور عام مسلمانوں پر اس کا جس قدر بُرا اثر پڑے گا وُہ مخفی نہیں۔ ترکی حکومت کے زمانہ میں جبکہ ترکوں نے بعض آدمیوں کو قید کرکے غیر مسلموں کو دینا چاہا تھا اس وقت آپ نے خود مانع ہوکر ان کو رہا کرا دیا تھا اب تو آپ مستقل باافتیار بااختیار ہیں"

وفد نے اور بھی معقول دلائل پیش کیے اور یہ بھی کہا کہ ہم نہایت قوی امید لے کر استرحام کے لئے آئے ہیں۔ لیکن وہاں سے ہر مرتبہ یہی جواب ملتا تھا کہ" حضرت مولانا انگریزی گورنمنٹ کی رعایا ہیں اور وہ ان کو بحیثیت مجرم طلب کرتی ہے چونکہ ہماری دوستی گورنمنٹ برطانیہ سے نئی نئی ہے اس لئے ہم کو کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہئے جو اس کی خلاف رضا اور ہمارے تعلقات میں مخل ہو"

اصرار کے بعد بھی جب ارکانِ وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو انتہائی رنج والم اور مایوسی کے ساتھ واپس ہوئے اور شریف صاحب نے اپنے حاکموں کو تعمیل حکم کی تائید کی۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی احتیاطی تدابیر

مولوی صاحب کو جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو بعض اپنے احباب کے مشورہ سے ارادہ ہوا کہ جس طرح ممکن ہو اپنے استاذِ معظم کو پنجۂ ظلم سے بچا کر کسی ایک خادم کے ہمراہ خفیہ کسی طرف نکال دوں۔ ہم پر جو کچھ گذرے گی برداشت کریں گے۔ جان جائے تو جائے مگر شیخ پر آنچ نہ آئے۔ زندہ رہے تو کبھی جا کر مل جائیں گے نہیں تو جان نثاروں میں نام رہے گا۔ کامل اخفا اور پوری احتیاط کے ساتھ ایک معتمد شتربان سے معاملہ طے کیا اور بایں خیال کہ روانہ ہونے تک شریف صاحب کے تشدد آمیز احکامات سے محفوظ رہیں

بعجلت تمام حضرت مولانا کو اور خدمت کے لئے مولوی وحید کو ایک نہایت محفوظ مکان میں آرام کے ساتھ چشم حساد سے مخفی کر دیا کہ محل و موقع دیکھ کر شب کو کسی وقت کسی لباس میں روانہ کر دیئے جائیں۔

مولانا حسین احمد مدنی کی گرفتاری

مولانا صاحب یہاں اس فکر میں تھے کہ ادھر شریف صاحب نے ان کو اپنے لئے خطرناک سمجھ کر گرفتاری کا حکم دیا اور چونکہ مدینہ منورہ کے قیام کی وجہ سے مولوی صاحب شریف کے دشمنوں یعنی ترکوں کی رعایا منصور ہوتے تھے اس لئے ان کی ایذا دہی میں کچھ تامل نہ ہوا۔ پولیس کا آدمی ان کو اور مولوی وحید صاحب کو بلانے کے لئے پہنچا۔ مولوی وحید پوشیدہ ہو چکے تھے وہ تو نہ ملے۔ مولانا حسین احمد کو حمیدیہ (عدالت) میں بلا کر لایا اور پولیس کمشنر کے سامنے پیش کیا۔ اس نے قید خانے میں لے جانے کا حکم دیا اور کہا کہ تم شریف کی حکومت کو انگریزی حکومت کہہ کر مذمت کیا کرتے ہو اب اس کا مزہ چکھو۔ ماتحت افسر آخر مسلمان تھے۔ حرم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مدرس اور معزز عالم دین کو ذلیل درجہ کے زندان میں رکھتے ہوئے شرم آئی اور اوّل درجہ کے معزز طبقہ کے زندان میں مقید کر دیا جس میں کوئی مشقت نہیں لی جاتی۔ اور لباس وغیرہ بھی وہی رہتا ہے، نماز اور نشست وغیرہ کے لئے تخت بچھے ہوئے ہیں۔ محافظوں کی اجازت سے ملاقات بھی ہو سکتی ہے اور عزیزوں دوستوں کا بھیجا ہوا کھانا بھی پہنچا دیا جاتا ہے۔ دوسرا قید خانہ ایک تہ خانہ ہے جس میں بہت سی سیڑھیوں سے اتر کر بالکل تاریکی میں رہنا ہوتا ہے جہاں دن رات برابر ہے۔ تیسرا اس سے بھی بدتر ہے جہاں اسی قسم کی ظلمات میں مادر زاد برہنہ کر کے لکڑی کے شکنجوں میں پاؤں ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے چلنا پھرنا بلکہ حرکت بھی کرنا دشوار ہو جاتا ہے یہ دو قید خانے نمونۂ عذاب دوزخ ہیں۔

مولوی صاحب کو اپنی ناگہانی گرفتاری بلا کا کچھ رنج نہ تھا ان کو اپنے مقدس استاد کی بیکسی کا صدمہ اور اپنی شائستہ تدبیروں کے درہم برہم ہو جانے کا قلق تھا جسم یہاں

مقید تھا اور دل وجان اُستاد کی خدمت میں۔ لاچار و مجبور بے قرار تھے۔ مگر کیا کرتے قضاءُ اللہ غالبٌ رضا بقضا، زنداں میں مقید رہے۔

حضرت مولانا اپنی گرفتاری کا قطعی حکم سُن چکے تھے۔ مجرموں کی طرح مخفی رہنے کی شدید کلفت برداشت فرمارہے تھے اس مصیبت کی حالت میں اپنے جان نثار رفیق کی گرفتاری اور قید کی خبر سُنی ایسے عزیز کی جدائی اور تکلیف سے جسقدر صدمہ ہو وہ کم تھا چہرہ پر رنج برستا تھا غم چھپایا نہ چھپتا تھا مگر جس طرح اولوالعزم اور راسخ القدم بندگانِ خُدا صبر کیا کرتے ہیں آپ نے بھی کیا اور سمجھے کہ امتحان در امتحان ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری

شریف صاحب کے ماتحتوں کے حضرت مولانا کی روانگی کے متعلق ان کے حکم کی تعمیل کرنی چاہی تو حضرت کا کہیں پتہ نشان ہی نہ پایا (کیونکہ وہ بکمال احتیاط مخفی ہو چکے تھے) البتہ مولوی عزیر گل صاحب و مولوی نصرت حسین صاحب موجود تھے۔ عربی پولیس نے ان سے تفتیش کی تو ان لوگوں نے اور مطوف صاحب نے بھی جن کی حمایت میں حضرت مولانا مکہ معظمہ میں قیام پذیر ہوئے تھے، بالکل لاعلمی ظاہر کی بہت تلاش اور جستجو کے بعد ناکامیاب ہوکر مجبوراً شریف صاحب سے اطلاع کی۔ وہاں سے نادر شاہی حکم صادر ہوا کہ "اگر عشا کے وقت تک یہ لوگ پتہ نشان نہ بتلائیں تو مطوف صاحب کو برہنہ کرکے کوڑے لگائیں جائیں اور عہدۂ مطوفی سے معزول کر دیا جائے اور دیگر رفقا جو موجود ہیں ان کو گولی مار دی جائے"۔ یہ احکام سُنکر مکہ معظمہ میں ایک تہلکہ پڑ گیا اور رفقا اور مطوف صاحب ان احکام کے خوف سے سراسیمہ اور پریشان تھے ہی پولیس کے تشدد اور گرفت نے اور پریشان کر دیا (حقیقت میں ان کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ حضرت کہاں ہیں۔ صرف اتنا جانتے تھے کہ مخفی ہیں) شدہ شدہ شریف صاحب کے سخت احکام اور رفیقوں کی پریشانی کی خبر حضرت کو پہنچی، سُنکر بے چین ہوگئے وہ مخزن رحمت و شفقت ایک معزز آلِ رسُول مطوف کی ذلت و رسوائی اور

اپنے مخلص جانباز رفقا کی پریشانی اور ہلاکت کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ احرام[1] باندھا اور سر بکف ہو کر بیتاب نکل آئے اور گرفتاری پر رضامند ہو گئے ع

مروت ہو تو ایسی ہو۔ فتوت اس کو کہتے ہیں

عالم ہو یا جاہل، بوڑھا ہو یا جوان، اپنی جان بہت عزیز ہوتی ہے اور اپنی سلامتی ہر شخص چاہتا ہے ممکن تھا کہ اپنی حفاظت نفس کے لئے جائز طور پر حضرت کوئی تاویل فرما لیتے کہ مطوف صاحب سزا پاکر کبھی نہ کبھی بحال ہو ہی جائیں گے اور رفقا کی ہلاکت اول تو یقینی نہیں۔ ممکن ہے کہ شریف صاحب کی صرف تخدید ہو اور وہ لوگ بچ جائیں اور اگر نہ ہی بچے تو مظلوم مقتول ہو کر درجۂ شہادت حاصل کریں گے۔ حضرت نہایت آرام سے محفوظ جگہ مخلصوں میں پوشیدہ تھے۔ شاید مدتوں چھپے رہتے کسی کو خبر نہ ہوتی اور کبھی کسی وقت بہ تبدیل ہیئت ولباس کسی طرف نکل جاتے یا وطن پہنچ جاتے یا کوئی اور صورت خلاصی کی خیال میں آ جاتی۔ لیکن نہیں، حضرت نے اپنے شایانِ شان کمال ایثار علی النفس اور استقلال کا ثبوت دیا اور اپنے خدام ومخلصین کو بچایا اور اپنے ضعیف جسم اور بیش بہا جان کو خطرہ میں ڈال کر یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ کے مصداق ٹھہرے

مخفی جگہ سے نکل کر حضرت مولانا اور وحید احمد صاحب اپنی جائے اقامت پر رفقا کے پاس تشریف لے آئے مغرب کے بعد جہاں محکمۂ پولیس اور مختلف لوگ حضرت کی تفتیش میں جمع تھے۔ حضرت کے ظاہر ہو جانے پر شریف صاحب کے ملازموں نے حکم کی تعمیل کی حضرت سے دریافت کر کے جس قدر اونٹوں کی ضرورت تھی مکان ہی پر لے آئے اور جب حضرت نے نماز عشا سے فراغت پائی تو بعزت واحترام سوار کر کے حضرت مولانا اور آپ کے تین رفیق مولوی عزیر گل صاحب، مولوی وحید احمد صاحب اور مولوی نصرت حسین صاحب نظر بندوں کی حیثیت سے حکومت عرب کی نگرانی ومحافظت سے چار عربی سپاہی یعنی بدوؤں کی حراست میں ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ شب یکشنبہ کو

---

[1] تہمد اور چادر پہن کر ایک مصلحت سے احرام کی صورت بنائی نیز شریف صاحب پر حجت قائم کرنے کے لئے اور اس لئے کہ مقام احرام اور حالت احرام میں کسی کو گرفتار کرنا ایذا دینا شرعاً نہایت مذموم اور گناہ کبیرہ ہے۔

بجانب جدّہ روانہ کئے گئے ۔ روانگی کے وقت حضرت نہایت مطمئن تھے اور رخصت کرنے والے احباب سے فرماتے تھے کہ "الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بہ معصیتے۔"

مولانا حسین احمد صاحب کے زندان میں اس وقت کون جا کہ کہتا کہ راحت و روح رواں اس وقت مقید ہو کر بیت الحرام سے جا رہے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

مولانا حسین احمدؒ کی پریشانی

صبح کی نماز کے بعد جب مولوی صاحب کے مخلص لوگ ملاقات کے لئے زندان میں پہنچے تو اطلاع کی کہ شریف صاحب کے حکم کی تعمیل ہو گئی اور حضرت مولانا عشائ کے وقت بجانب جدّہ حراست میں روانہ کر دئے گئے یہ سُنکر مولوی صاحب کی جان میں جان نہ رہی ۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی حیران رہ گئے کہ کیا کریں۔ دل چاہتا تھا کہ پَر لگا کر اڑ جائیں ۔ مگر مجبور تھے تن بدن کا ہوش نہ تھا یہی سُوجھی کہ جس طرح ہو اُستاد کے قدموں میں جا پڑوں۔ جان جائے مگر ساتھ نہ چھوٹے۔

شریف صاحب کی خدمت میں عرضداشت پہنچائی کہ مدینہ منورہ سے جدائی اور آستانۂ نبوی (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) سے مفارقت صرف مخدوم اُستاد کی خدمت گذاری کے لئے گوارا کی تھی اور مکّہ معظّمہ میں محض اسی لئے مقیم تھا۔ حکومت نے جو معاملہ اُن کے ساتھ کیا ہے ۔ میرے ساتھ بھی کرے اور جس قدر جلد ممکن ہو جدّہ پہنچا دے ۔ سرکار برطانیہ کی طرف سے بالتصریح طلبی نہیں لیکن جب حضرت کے سب رفقار کو بھیجا گیا بھیجا گیا ہے تو مجھے کیوں چھوڑا جاتا ہے میں بھی تو انہیں کا خادم ہوں اور ایک مخفی تدبیر یہ کی کہ بعض ذرائع سے شریف صاحب کی خدمت میں خیر خواہانہ یہ ذکر کرایا کہ حضور اصل مادۂ فساد تو حسین احمد ہے اس کو مکّہ معظّمہ میں آزاد یا مقید رکھنا ہر دو طرح خطرناک ہے آزاد رہا تو حکومت سے نفرت اور فساد کا تخم جو اس نے بویا ہے بارور ہو جائے گا مقید رہا تو اہل اسلام میں شورش اور بے چینی بڑھے گی موقع بہت اچھا

ہے چونکہ اس وقت اپنی غلطی سے یہ خود درخواست کرتا ہے اس کو دفع کرنے میں اور شیخ ہندی کے ساتھ جدہ بھیج دینے میں حکومت پر کچھ الزام نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ گنبد اخضر کے متبرک سایہ میں مدتوں درس دینے کی وجہ سے مدینہ منورہ سے گزر کر مکہ معظمہ تک بھی مولانا حسین احمد صاحب کے علم و فضل کی شہرت ہو چکی تھی اور صدہا مخلص اور بعض تلامذہ یہاں موجود تھے۔ مولوی صاحب کا زندان مکہ معظمہ میں بلا قصور مقید رہ کر تکلیف اٹھانا ان کے قلوب کو مضطر کئے ہوئے تھا اور شریف صاحب کی مجلس چونکہ نیکدل حضرات سے خالی نہ تھی ان مخلصین و تلامذہ نے انہیں کے ذریعے سے مولانا حسین احمد صاحب کا بلا تقصیر مقید ہونا اور ان کے علم و فضل کا حال شریف صاحب سے گوش گزار کر کے رہائی کی تحریک کی۔

ان سب حالات پر نظر کر کے شریف صاحب کو مکہ معظمہ میں ان کا وجود اپنے لئے ہر طرح خطرناک نظر آنے لگا۔ اور کسی قدر غور و تامل کے بعد جدہ پہنچا دئے جانے کی درخواست منظور کر لی۔ مگر ساتھ ہی خیر خواہی کے طرز پر یہ بھی سمجھایا کہ تم ترکی رعایا ہو۔ مدینہ منورہ[1] جانے کی اجازت ہو سکتی ہے خواہ مخواہ عالم ہندی کے ساتھ جا کر کیوں اپنے آپ کو مجرم اور مقید بناتے ہو۔ محبت میں انسان حقیقی ناصح کی بھی نہیں سنتا یہ تو محض سیاسی تدبیر اور منافقانہ خیر خواہی تھی۔ مولوی صاحب اس کی کب پروا کرتے تھے ان کے دل کو تو کچھ اور ہی لگی ہوئی تھی اپنی بات پر مصر رہے اور حکومتِ عربی نے حضرت کی روانگی سے اگلے دن ان کو بھی جدہ روانہ کر دیا۔

حضرت مولانا اونٹوں کی سواری پر دو روز میں جدہ پہنچے تھے۔ مولوی صاحب سب اسباب پیچھے روانہ کرنے کے لئے دوستوں کی سپردگی میں چھوڑ کر عرب کے سپید خچر کی تیز سواری پر دو روز کا راستہ بارہ گھنٹے میں طے کر کے جدہ پہنچے اور ان سب حضرات کے پہنچنے سے دو گھنٹے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر اور اپنے رفقا میں شامل ہو گئے۔ حضرت ان کو دفعۃً دیکھ کر متعجب ہوئے اور حالات معلوم کرنے

---

[1] شریف کا مطلب اس صورت میں بھی حاصل تھا کہ مکہ معظمہ سے دفع ہو جائیں گے۔

کے بعد اگرچہ ان کی اس مروت اور حسن وفا سے قلبی مسرت لازمی تھی لیکن اس مروت کے ظاہری نتائج اور آئندہ خطرات پر فرما کر متاسف و غمگین ہوگئے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ موردِ آلام و تکالیف ہوں گے۔

مولانا حسین احمد مدنی کی جاں نثاری

مولانا حسین احمد صاحب کی شریفانہ جاں نثاری اور حُبِّ شیخ کے متعلق اس مختصر تحریر میں اپنی طرف سے ایک حرف بھی کہنا نہیں چاہتے۔ لیکن آپ اس وقت کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر خود اندازہ فرماویں کہ اس زمانہ میں ایسی جانبازی کی نظیر مل سکتی ہے یا نہیں۔ مدینہ منورہ میں شیخ الحدیث ہونے کی عزت شرفاء بلدۂ طیبہ میں رسوخ و وجاہت، ضعیف والد اور بیکس زن و فرزند، اپنی نوجوانی کی حفاظت اور آئندہ ہر قسم کی امیدِ آرام و راحت، یہ سب ایک طرف ہیں۔ اور حسنِ وفا اور محبتِ شیخ دوسری طرف جس میں جان کا خطرہ ہے اور طرح طرح کے مصائب کا اندیشہ۔ مگر یہ شخص اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور خطرات کی طرف بے تامل عاشقانہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

گزشتہ زمانہ کے فنا فی الشیخ اور سرمست لوگوں کی حکایتیں جو آپ نے سنی ہوں گی (کہ عالم شوق میں شیخ کے نابدان میں سر گھساتے ہوئے شیخ کی آواز سن کر محو ہو رہے ہیں۔ برسات کا پانی صحن میں بھر جاتا ہے اور شیخ بدرو صاف کرنے کے لئے زور سے بانس مارتے ہیں تو سر سے خون کے فوارے جاری ہو جاتے ہیں مگر سر نہیں ہٹتا) اس شخص نے آنکھوں سے دکھلا دی کہ ہاں حالت ہوش و حواس میں اس طرح جان فدا کیا کرتے ہیں۔

بہر حال پہلے اصحاب اربعہ تھے اب پنجتن ہوگئے اور جدہ میں تین روز قید خانہ کے دروازے پر ایک کمرے میں فرش رہے اور پھر دوسرے مکان بہاؤ الدین، انگریزی خفیہ انسپکٹر کی نگرانی میں منتقل ہوگئے (جو بظاہر محافظِ حجاج کے عہدہ پر ممتاز

تھا) اور تقریباً پچیس روز یہاں مقیم رہے بالائی طبقے میں حضرت مولانا اور آپ کے رفیق رہتے تھے نیچے دروازے پر شریف کے سپاہی حفاظت کرتے تھے پنجگانہ نماز بر مکان پر ادا کرتے تھے اور جمعہ کے روز بہاؤ الدین اپنی ہمراہ سب کو جامع مسجد لیجا کر جمعہ پڑھوا کر ہمراہ واپس لاتا تھا۔ کھانا گورنمنٹ خرچ سے بہاؤ الدین کی معرفت ایک مسلمان کے مکان سے پک کر دونوں وقت آجاتا تھا۔

مدینہ منورہ میں حضرت مولانا کی گرفتاری اور مولانا حسین احمد کی معیت نہایت قلق و حسرت کے ساتھ سُنی گئی۔ اور مولوی صاحب کے شاگرد اپنے باکمال اُستاد کے فیوض سے مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ اور روضۂ مطہرہ کے پہ نور حضور میں جو قال اللہ و قال الرسول کا ایک شاندار حلقۂ درس جما رہتا تھا درہم برہم ہوگیا لیکن چونکہ اس وقت وہاں ترکوں کی سلطنت قائم تھی اور شریف صاحب کی مخالفت سے ایک پریشانی کا عالم تھا اور قحط کی عام مصیبت تھی اس لئے وہاں کے با اخلاص لوگ ان حضرات کی رہائی کی تدبیر کرنے سے معذور و مجبور رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے رفقائے کے مختصر حالات

مناسب ہے کہ حضرت کے رفیقان اسیری سے (جن کا نام آپ بار بار سُن چکے ہیں یا آئندہ سُنیں گے۔ اس موقع پر ذرا تفصیلی تعارف حاصل کریں جن میں سے ہر ہر شخص اپنے درجہ پر حضرت کا پورا جاں نثار اور مخلص خادم ثابت ہوا ہے اور حضرت تو نیکنائے زمانہ تھے ہی ان ہی خادموں میں سے بھی ہر ایک نے مزلۃ الاقدام اور محل امتحان مواقع میں کمال ایمانی اور استقامت کا موجب تحسین و لائق اقتدا کا ثبوت دیا اور حضرت کو بھی مختلف حیثیات سے ہر شخص پر پورا اعتماد اور ہر ایک کے حال پر ایسی خاص شفقت و عنایت تھی جس کو یہ لوگ بھی آخری دم تک کبھی نہ بھولیں گے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب، آپ کا قدیم وطن آلہ دار ہو قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد، نجیب الطرفین حسینی سید ہیں والد ماجد آپ کے مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی قدس سرہ کے عمدہ خلفاء میں سے تھے۔ آپ کے دو بڑے بھائی مولینا صدیق احمد صاحب و مولانا سید احمد صاحب آپ کے پہلے دارالعلوم میں پہنچ چکے تھے۔ اُنہیں کی موجودگی میں ۱۳۰۹ھ میں جبکہ آپ کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی ابتدائی کتابیں پڑھتے ہوئے دیوبند آئے اور خوش قسمتی سے اپنے دونوں بھائیوں سے زیادہ حضرت شیخ الہند کے مورد شفقت و عنایت ہوئے۔ یہاں تک کہ بعض ابتدائی کتابیں صرف وادب و منطق وغیرہ کی حضرت نے خارج از اوقات مدرسہ خود پڑھائی جبکہ بڑی کتابوں کے شائقین کو بھی وقت ملنا دشوار تھا۔ اسی طرح دارالعلوم میں نہایت کامل طریقہ سے تحصیل علوم کی اور حضرت مولانا شیخ الہند کے علمی فیوض سے متمتع ہوئے تینوں بھائیوں کو حضرت مولانا سے خاص عقیدت تھی مگر مولوی حسین احمد صاحب اس تعلق میں اپنے دونوں بھائیوں سے چند قدم آگے تھے۔

موجودہ حضرات میں سب کے علم و فضل و تقدس کے قائل تھے لیکن اپنا ملجا و ماوا صرف حضرت مولانا ہی کو سمجھتے تھے۔ بیعت ہونے کے متعلق بھی کبھی کسی دوسری جانب خیال دل میں نہیں گزرتا تھا، سمجھتے تھے کہ جب کبھی موقع ہوگا حضرت ہی سے بیعت ہو جائیں گے۔ حضرت مولانا سے جب کبھی عرض کیا تو حسب عادت مختلف طریقوں سے عذر و انکار فرمایا اور بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب گنگوہ میں حضرت مولینا رشید احمد صاحب قدس سرہ سے شرف بیعت حاصل کر چکے اور مولانا حسین احمد صاحب کا اپنے والد ماجد کے ہمراہ ہندوستان ترک کر کے مدینہ منورہ جانے کا قصد مصمم ہوگیا تو خود حضرت مولانا نے مولوی صدیق احمد صاحب سے تاکید کی کہ گنگوہ میں ان کو بھی داخل سلسلہ کرا دیا جائے۔

مولانا حسین احمد صاحب واقف تھے کہ حضرت مولانا بہت ہی کم بیعت فرماتے ہیں اور ان کے لئے باوجود کمال شفقت سے انکار فرما چکے ہیں اور خود ہی گنگوہ کی طرف راہ نمائی فرمارہے ہیں اور پھر گنگوہی قطب عالم قدس سرہٗ کا دربار بھی مرجع الکل سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے مولوی صاحب ماہ شعبان ۱۳۱۶ھ میں بغرض بیعت گنگوہ حاضر ہوئے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی ہی درخواست پر اس گوہر گرانمایہ کو شرف قبول بخش کر بیعت سے معزز فرمایا اور چونکہ والد کا قصد انہیں ایام میں ہجرت کرنے کا تھا اس لئے گنگوہ میں کچھ قیام نہیں کرسکے۔ بلکہ حضرت نے اشغال و دقائق بھی حضرت حاجی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) سے مکۃ معظمہ میں دریافت کرلینے کی ہدایت دی۔ اسی قصد کو دل میں لئے ہوئے رخصت ہوکر والد صاحب کی خدمت میں وطن پہنچے۔

صاحبزادوں کے آجانے کے بعد مقدس والد نے اس عارضی وطن ہندوستان کو (جس میں پندرہ پشتیں گزارنے کی وجہ سے بہت سے اعزہ و احباب موجود تھے) چھوڑ کر شوق قرب روضہ اطہر بکمال خلوص اپنے سب اہل و عیال اور پانچ صاحبزادوں اور یکسالہ پوتے (مولوی وحید احمد کو ہمراہ لے کر اہل بیت سرور عالم کے اصلی وطن مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ ہندوستان سے مکۃ معظمہ پہنچے اور تمام متعلقین کے ساتھ حج ادا کیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد روانہ ہوکر مدینہ منورہ میں اپنے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ مدینہ منورہ میں پہنچ گئے اور چند روز امتحان و تکالیف میں مبتلا رہنے کے بعد باطمینان مقیم ہوئے اور رفتہ رفتہ اپنے اہل و عیال اور مہمانوں کے لئے آرام دہ مکان بھی تعمیر کرلیا۔

مولانا حسین احمد صاحب نے حسب ہدایت حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کی مکۃ معظمہ میں حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر چند روزہ استفادۂ کمالات و فیوض روحانی کیا اور ذکر و اشغال میں مصروف رہے اور پھر وہاں سے بہ اجازت رخصت ہوئے اور مدینہ منورہ پہنچکر حرم شریف میں سلسلۂ درس جاری فرمایا۔ اور نہایت مشغولیت کے ساتھ اشاعت علم شروع کی اور مستعد

طلبہ اور اہل علم زانوئے شاگردی ان کی خدمت میں تہ کرنے لگے۔ مگر اس شغل میں اصلاح باطن کا خیال اور بزرگانِ ہندوستان کا خیال قلب میں لگا ہوا تھا خطوط میں گنگوہ بعض حالات و واردات کی اطلاع دی تو ۱۳۱۹ھ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب نے تحریر فرمایا کہ چند روز کے لئے میرے پاس ہو جاؤ تو مناسب ہے۔ دکیونکہ مکہ معظمہ میں حضرت شیخ الشیوخ حاجی صاحب قدس سرہٗ کی وفات ۱۳۱۷ھ میں ہو چکی تھی۔ مسند درس پر متمکن تھے اور روز افزوں ترقی پیش نظر تھی مگر اصلاحِ باطن کو اس قدر اہم اور ضروری سمجھا۔ اور ان ایام میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت نے وہ غلبہ کیا کہ سب تعلقات چھوڑ کر ہندوستان کا ارادہ کر دیا۔

بزرگ والد ماجد اپنا اندوختہ مصارفِ ہجرت میں صرف کر چکے تھے اور جو کچھ رہ گیا تھا وہ بڑے صاحبزادے (مولانا صدیق احمد صاحب) لے کر بشوقِ زیارتِ بزرگانِ جابجا ہندوستان اُن سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب کے شاگردوں اور معتقدوں کی کچھ کمی نہ تھی لیکن یہ کس کو خبر تھی کہ گھر میں سوائے سرمایۂ توکل کچھ ہے ہی نہیں اور یہاں حرفِ سوال تو کیا اشارہ کنایہ بھی خلافِ غیرت تھا۔ بہر حال والد صاحب سے اجازت و دُعا کے طالب ہو کر اور گھر میں جو کچھ قلیل رقم موجود تھی، لے کر متوکلاً علی اللہ روانہ ہوئے۔

مکہ معظمہ پہنچ کر حج ادا کیا اور وہاں سے جدہ پہنچے مگر بڑے بھائی صاحب سے کہیں ملاقات نہ ہوئی بلکہ معلوم ہوا کہ وہ جہاز کے انتظار کی کلفت اور زادِ راہ کی قلت سے پریشان ہو کر واپسی کے قصد سے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ مولوی صاحب نے ایک آگبوٹ کا ٹکٹ خرید لیا اور سوار بھی ہو گئے جہاز کی روانگی کا نہایت تکلیف سے انتظار کر ہی رہے تھے کہ بدقسمتی سے اس کی روانگی بالکل ملتوی ہو گئی۔

مولوی صاحب فرصت پا کر بھائی صاحب کی ملاقات کے لئے مکہ معظمہ گئے اور ان کو ہندوستان کے سفر پر آمادہ کر کے جدہ واپس لے آئے مگر بھائی صاحب کے زادِ راہ کا اکثر حصہ ختم ہو چکا تھا اور اب اتنا بھی روپیہ دونوں کے پاس نہ تھا کہ صرف خانی جہاز کا ہندوستان تک ٹکٹ ہی خرید لیں۔ حیران تھے کہ کیا کریں۔

شوق سب کچھ کراتا ہے اور محبت سب مصائب آسان کر دیتی ہے۔ بادبانی جہاز کا ٹکٹ مسقط تک دس دس روپیہ میں لے کر سوار ہو گئے بہت دقتوں کے بعد ڈیڑھ ماہ میں جہاز مسقط پہنچا اور وہاں سے دو دو روپیہ دے کر آگبوٹ میں کراچی پہنچے۔ یہاں تک کہ ریل کا ٹکٹ خریدنے کے بعد ایک پیسہ بھی پاس نہ رہا۔ مدینہ منورہ کا تبرک کھجوریں فروخت کرنے کو دل نے گوارا نہ کیا ہاں مسقط کا حلوہ جو بزرگوں کو ہدیہ دینے کے لئے خریدا تھا فروخت کر کے انتہائی ضرورت میں کچھ کھانا خرید کر کھایا اور خدا خدا کر کے سہارنپور پہنچے۔ بڑے بھائی براہِ راست گنگوہ چلے گئے اور مولانا حسین احمد صاحب دیوبند میں حضرت کی قدمبوسی کر کے یہاں سے گنگوہ پہنچے۔

قطب عالم نے محبت و شوق سے دونوں بھائیوں کو نئے جوڑے پہنائے جو پہلے سے تیار رکھے تھے خاص توجہ سے ارشاد و تلقین کر کے باقاعدہ معمولات اور ذکر اللہ میں لگا دیا اور بہت قلیل عرصہ کی ریاضت کے بعد ایک روز بعد عصر مجمع عام میں بلا کر بکمالِ شفقت و عنایت دونوں بھائیوں کے سر پر اپنے دستِ مبارک سے دستارِ خلافت باندھ کر انتہائی عزت افزائی فرمائی۔ یہ وہ درجہ تھا کہ حضرت کے خدام میں کبھی کسی کو اس کا خیال بھی نہ آتا تھا اور برسوں کی محنت کے بعد کبھی اتفاقیہ کسی خوش نصیب کو مرحمت ہو جاتا تھا۔

چند ہی ماہ میں بے انتہا دینی فیوض اور روحانی برکات حاصل کر کے اور تقریباً سات ماہ ہندوستان میں گزار کر پھر عرب کا قصد کیا گنگوہ سے رخصت ہو کر دیوبند آئے اور یہاں حضرت کی شفقت و عنایات سے مالا مال ہو کر روانہ ہوئے اور بلدۂ طیبہ مدینہ منورہ میں پہنچ کر حالت انتظار میں ضعیف والد کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا اور بدستور سابق مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم) میں جوار روضۂ مطہرہ میں درس جاری فرمایا اور چند ہی روز میں خلوص نیت اور علم و کمال کی وجہ اور بزرگوں کی دعا کی برکت سے خدا تعالیٰ نے وہ ترقی عطا فرمائی کہ رشک اقران و اماثل بن گئے۔

۱۳۲۵ھ میں مدینہ منورہ کا درس ملتوی کر کے حضرت استاذ کی زیارت اور

تحصیل فیوضات علمیہ کے شوق اور بعض ضروریات کی وجہ سے پھر ہندوستان تشریف لائے اور مسلسل تین برس حضرت کی خدمت میں ظاہری باطنی فیوض حاصل کئے دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ مدرس ہوکر درس دیتے رہے اور حضرت قدس سرہٗ کے حلقۂ درس میں دوسری مرتبہ جامع ترمذی اور صحیح بخاری شریف پڑھی ان کی شرکت اور حسن سوال کی وجہ سے حضرت مولانا سبق میں وہ مضامین عالیہ بیان فرماتے تھے جن کو عام طور سے ہمیشہ درس میں ذکر فرمانے کی عادت نہ تھی۔ اسی طویل قیام میں والد ماجد سے اجازت طلب کرکے اپنے ماوا و ملجا اور مربی و شفیق استاد (رحمۃ اللہ علیہ) کے مشورہ اور ارشاد سے ضلع مرادآباد میں اہل علم و صلاح کے ایک شریف خاندان میں مولوی صاحب نے بطرز مسنون شادی بھی کر لی، اور اہلیہ صاحبہ کو دیوبند میں حضرت مولانا ہی کے مکان میں لاکر رکھا۔

باکمال شیخ کی خدمت سے جدا ہونے کو ہرگز دل گوارا نہیں کرتا تھا مگر بوڑھے والد ماجد کی تاکید اور تلامذۂ مدینہ منورہ کی پُر اصرار استدعا سے مجبور ہوکر شوال ۱۳۲۹ھ میں مدینہ منورہ پہنچے اور اہلیہ صاحبہ کو وہاں پہنچا کر مکہ معظمہ آکر حج ادا کیا اور ۱۳۳۰ھ میں مدینہ منورہ جاکر اور بدستور سابق بلکہ اور زیادہ ترقی اور شوق اور شوکت کے ساتھ حرم محترم میں حلقۂ درس فرمایا اور متفرق شدہ تلامذہ بہت جلد جمع ہو گئے۔ خدا تعالیٰ نے علم و فضل کی وہ شہرت عطا فرمائی کہ دیگر اساتذۂ حرم شریف کے حلقے مختصر رہ گئے۔

چونکہ اہلیہ محترمہ کے والدین سے یہ وعدہ ٹھہر چکا تھا کہ مولوی صاحب خود اپنے اہتمام سے دو سال میں ایک مرتبہ ہندوستان لاکر لڑکی کو اس کے خاندان سے ملا دیا کریں گے لہٰذا بہ تعمیل ارشاد فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم "اِنَّ اَحَقَّ الشُّرُوطِ اَنْ یُّوْفٰی مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوْج[1]" مولوی صاحب ۱۳۳۱ھ میں اپنے بڑے بھائی مولوی صدیق احمد صاحب مرحوم کے نوعمر صاحبزادے مولوی وحید احمد کو ہمراہ لیکر

---

[1] وفا کرنے کی قابل سب سے زیادہ دو شرطیں ہیں جن کے ذریعے سے تم کو عورتوں سے حق صحبت حاصل ہوا ہے ۱۲۔

(تیسری مرتبہ) ہندوستان تشریف لاکر حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صرف آٹھ نو ماہ فیض صحبت اُٹھا کر ۱۳۳۲ھ میں (حضرت مولانا کے سفرِ حج سے ایک سال پہلے) اپنی اہلیہ صاحبہ کو لے کر رخصت ہوئے۔ بھتیجے کو دارالعلوم میں تکمیل علوم کرنے کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں چھوڑ گئے اور خود مکّہ معظمہ ہوتے ہوئے مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے۔

مدینہ منورہ میں شغل تعلیم میں مصروف تھے کہ حضرت کے سفرِ حج کی اطلاع پہنچی اور ایامِ حج کے بعد حضرت کے مدینہ منورہ تشریف لانے کا نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار کرنے لگے اور (جیسا کہ قریب ہی معلوم ہو چکا ہے) حضرت مولانا نے چھ ماہ مدینہ منورہ میں قیام فرما کر جب واپسی کا قصد فرمایا تو حضرت کی خدمت کے لئے ہمراہ مکّہ معظمہ تک آئے اور حضرت کی معیت کو حقیقی سعادتِ دارین سمجھ کر مکہ معظمہ کے زندان سے نکل کر جدّہ میں شریک نظر بندی ہوگئے۔ چار سال تک تمام تکالیف ومحن و مصائب وآلام میں شریکِ حال رہ کر بدل وجان خدمت کرتے رہے اور تراویح میں حضرت کو قرآن مجید سنانے کے لئے اسی نظر بندی کی حالت میں کلام مجید حفظ کر لیا۔

اسی اسیری کے زمانہ میں ان کو دوسرے مصائب وحوادث کا سامنا ہوا۔ والد ماجد اور دونوں بھائی ترکی حکومت کی طرف سے مخبری کے بے بنیاد شبہات پر جوارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے جُدا کر کے اڈریا نوپل بھیج دیئے گئے۔ مستورات بے کس و تنہا رہ گئیں۔ والد ماجد نے بحسرت تمام وہیں وفات پائی۔ مدینہ منورہ سے مصیبت زدہ اہلیہ صاحبہ (مذکورہ سابق) اور صغیر سن لختِ جگر اور دختر اور سوتیلی ماں و دیگر چند اقارب کی وفات کے جگر خراش صدمات کی خبر اسیریٔ مالٹا میں پہنچی اور سوتیلی والدہ صاحبہ اور عزیز بھتیجی اور دیگر اقارب کی متواتر اموات کی اطلاعیں ملیں۔ انھوں نے بعزم و ثبات وصبر وسکون سب صدمات برداشت کئے اور حضرت کی رفاقت وظلِ عاطفت کو اپنے لئے کافی تعزیت وتسلّی سمجھتے رہے۔

حضرت نے ہر چند سمجھایا کہ گورنمنٹ انگریزی نے مجھ کو مجرم سمجھا ہے تم تو بے قصور

ہو رہائی کی تحریک وکوشش کرو۔ مگر انہوں نے اور دیگر رفقا نے یہی جواب دیا کہ حضرت جان جائے مگر ایسی حالت میں آپ کی خدمت سے جُدا نہ ہوں گے ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے اوپر
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

رہائی کے بعد حضرت کے ہمراہ آکر سفر و حضر صحت و مرض میں حاضر خدمت رہے وفات کے وقت حاضر نہ ہونے کی حسرت (ان کی ترقی درجات کے لئے) مقدر تھی وفات سے تین روز پہلے مولانا ابوالکلام صاحب کی درخواست پر کلکتہ میں ان کے اسلامیہ کالج کی دینیات کا صدر مدرس تجویز کر کے حضرت مولانا نے بحالت مرض ہی دہلی سے ان کو روانہ کر دیا۔ وفات کا تار پہنچنے پر حیران و پریشان بعجلت تمام آئے اور دفن سے ایک ساعت بعد جس حسرت و افسوس کے ساتھ دیوبند پہنچے وہ قابل تحریر نہیں (نہایت افسوس ہے کہ ان اوراق کے مرتب ہونے کے بعد ۱۵ محرم ۱۳۴۰ھ کو حضرت شیخ الہند کے مکان سے شب کے تین بجے گورکھا اور گورا فوج لاکر گورنمنٹ نے گرفتار کر لیا اور کراچی کے مشہور مقدمہ میں اپنا کمال ثبات و استقلال دکھلا کر صبر کے ساتھ با مشقت کی تکالیف برداشت کر رہے ہیں) مولانا موصوف اپنے علم و فضل اور جاں نثاری و خدمت شیخ اور حضرت رح کے بعد قومی خدمات اور کراچی کے یادگار زمانہ تاریخی مقدمہ میں اعلان کلمۃ الحق اور تحمل مصائب و صدمات کے لحاظ سے خود ایک مبسوط و مستقل سوانح عمری کے مستحق ہیں یہ چند اوراق چونکہ حضرت مولانا کا ایک نہایت مختصر تذکرہ ہیں اس لئے چند سطروں میں ان کے بھی خاص خاص اور نہایت مجمل حالات تحریر ہوئے۔ فی الحقیقت ان کی سوانحعمری حضرت مولانا کے سوانح کے ساتھ بعینہٖ اس طرح متضمن و مربوط ہیں جیسے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبرک سوانح میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مُبارک حالات۔

فسلمھم اللہ تعالیٰ واعانہم ونصرھم

مولانا حاجی عزیر گل صاحب کاکاخیل

ساکن زیارت کاکاخیل علاقہ پشاور ۱۳۲۷ھ میں وطن سے بغرض تحصیل علوم دین ہندوستان آئے اور ربانی بہت میں مقیم ہوئے کچھ عرصہ کے بعد خوش قسمتی نے دارالعلوم دیوبند کی طرف ہدایت کی۔ یہاں پہنچکر مدرسہ میں جب باقاعدہ ابتدائی امتحان داخلہ خود حضرت مولانا نے لیا تو مخصوص توجہ اور شفقت کے اثر نے مولوی صاحب کے قلب میں حضرت شیخ سے ایک باطنی تعلق پیدا کر کے بندۂ بے درم بنا دیا اور اس امتحان کی کامیابی آئندہ امتحانات کے لئے نیک شگون اور فال حسن سمجھی گئی دو سال میں مختلف اساتذۂ دارالعلوم سے تحصیل علوم کر کے مشکوٰۃ شریف تک پہنچے۔ باطنی عظمت و عقیدت کا تو یہ حال تھا کہ جب تک حضرت مولانا کہیں دور تک بھی نظر کے سامنے رہتے غایت ادب سے بیٹھنا حرام سمجھتے۔ مگر حاضری خدمت اور کسی عرض و معروض کی نوبت نہ آئی تھی۔

۱۳۲۷ھ میں ولایتی مشہور بزرگ اڈہ ملا صاحب کے دو خلفا دیوبند تشریف لائے تو حسن اتفاق سے مولوی صاحب کو حضرت کی مخصوص ملاقات کے لئے واسطہ بنایا۔ حضرت نے ملاقات منظور فرما کر ان بزرگ مہمانوں کے ہمراہ براہ شفقت ان کو بھی مدعو فرمایا۔ واقع میں ان کی عقیدت اور ظاہر بیں یہ دعوت ان کے لئے باعث ہزار سعادت ہو گئی۔ آمد و رفت کی جراءت ہوئی رفتہ رفتہ بمقتضائے اِذَا خَالَطَہ اَحَبَّہ ترقی عقیدت سے باضابطہ حلقۂ خدام میں داخل ہو گئے اور فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے۔ تین مرتبہ حضرت سے بخاری شریف پڑھی اور چار مرتبہ ترمذی شریف۔

دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۳۲ھ تک تکمیل علوم کر کے فارغ التحصیل ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت نے قصد سفر فرمایا تو ان کے دیندار و بزرگ والد ماجد نے باوجود اپنی ضرورتوں کے ان کے لئے فلاح دارین سمجھ کر ان کو معیت و خدمت کی

اجازت دے دی اور سجر حرمین شریفین اور اسیری میں پورے شریک حال وخادم رہنے کے ساتھ تحصیل فیوض باطنی اور ذکر و شغل سے بھی غافل نہ رہے (اور حضرت کی صحبت فیض خود ہزاروں شغلوں سے بڑھ کر ایک شغل تھا ہی) آخر دم تک خدمت میں حاضر رہے ان کو حضرت کے مزاج میں بہت دخل تھا اور مقتضائے کہ مہاتے تو ملا کرد گستاخ بعض مواقع پر حضرت کے سامنے ایسی جرأت سے کلام کرتے تھے کہ حاضرین حیران رہ جاتے تھے مگر حضرت ان کے اس طرز سے مانوس تھے کبھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتے تھے اور مثل اولاد کے ان پر شفقت رکھتے تھے لیکن مناسب مواقع پر سختی سے تنبیہ و عتاب فرماتے تھے لیکن یہ ہر حالت میں سر تسلیم خم کئے ہوئے خدمت میں حاضر رہتے تھے ایسے دیانت دار وجاں نثار خادم بہت کم بزرگوں کو میسر آتے ہیں۔

بوقت تحریر دیوبند میں مقیم ہیں اور بعد الوفات حضرت کے بہترین خدمت سمجھ کر تحریک خلافت اور اصلاح مسلمین میں خالصاً للہ مساعی جمیلہ دکھلا رہے ہیں بڑے جوشیلے مسلمان اور قوی الایمان جوان ہیں زاد اللہ تعالیٰ برکاتہم۔

مولوی حاجی وحید احمد صاحب مدنی

مولوی حسین احمد صاحب کے برادر معظم مولانا محمد صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں۔ اپنے خاندان کی ہجرت سے ایک سال قبل ہندوستان میں تولد ہوئے اور ابتدائی کتابیں اپنے فاضل و محترم چچا مولانا حسین احمد صاحب سے پڑھیں۔

۱۳۳۱ھ میں جب مولانا حسین احمد صاحب ہندوستان تشریف لائے تو یہ بھی بغرض تحصیل علم ہمراہ آکر دارالعلوم میں تحصیل علم کے لئے مقیم ہوئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت اور بزرگانہ شفقت سے بہرہ ور ہونے لگے۔ نازپروردہ بچوں کی طرح حضرت ان کی ہر بات مانتے اور ان کے آرام و راحت کا نہایت درجہ خیال رکھتے۔ ان کو بھی حضرت سے ایک خاص معتقدانہ اور مخلصانہ انس تھا کہ حضرت کی زیارت کے بدون صبر نہ آتا تھا۔ حضرت نے ارادہ حرمین شریفین فرمایا تو حضرت کی

مفارقت کو شاق سمجھ کر نیز حضرت کی راحت رسانی کے خیال سے اور اپنے وطن (مدینہ طیبہ) پہنچ کر حضرت کا میزبان خادم بننے کے شوق میں معیت اختیار کی اور اپنے مکان پر حقِ میزبانی وخدمت ادا کرکے بوقت واپسی چچا صاحب کے ہمراہ یہ بھی مکہ معظمہ تک حضرت کو پہنچانے آئے اور شریف صاحب کے حکم سے حضرت کے ہمراہ اسیر ہو کر جدّہ بھیجے گئے اور آخری دم تک ہمراہ رہ کر رفاقت وخدمت کی سعادت حاصل کی اور نظر بندی کے زمانہ میں حضرت سے تحصیل علم بھی کرتے رہے اور اشاعت دین بھی۔ (جس کا حال آپ مالٹا کے ذکر میں ملاحظہ کریں گے) ترکی زبان اور کسی قدر انگریزی پہلے سے جانتے تھے مالٹا میں رہ کر مولوی نصرت حسین صاحب سے سیکھ کر اچھی مہارت حاصل کرلی۔ اور اُن کی وفات کے بعد اِن کی زباندانی سے حضرت کو سفر و اسیری یورپ میں بہت راحت پہنچی۔

اس نوعمری میں مرشد کامل کی ایسی سچی محبت اور ثبات فی الدین انہیں کا حصہ ہے۔ بڑے بڑے خطرناک مواقع پر ان کا قدم نہیں پھسلا اور بلا کسی خوف و رعب کے نہایت جراٴت سے ہمیشہ کلمۃ الحق زبان سے نکلا۔ پانچ سال کی تکالیف ومحن میں ان کو حضرت مولانا سے وہی نسبت ہے جو امتحان ذبح میں یا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ کہنے والے قوی الایمان لڑکے کو بوڑھے باپ ابراہیم علیہ السلام سے تھی۔

رہائی کے بعد ہمراہ ہندوستان آئے اور دُنیا سے رُخصت ہونے تک ہر وقت ہمراہ رہے۔ آجکل با دِل مغموم دار العلوم میں تحصیل علوم کرتے ہیں زاد اللہ علمہم و دام فضلہم۔

مولوی حاجی چودھری حکیم نصرت حسین رح شہید مالٹا

کوڑا جہان آباد ضلع فتحپور ہسوہ کے رہنے والے ایک معزز زمیندار کی حیثیت رکھنے والے دیندار مولوی تھے ۱۳۲۲ھ میں دار العلوم دیوبند میں کتابیں ختم کی تھیں اور وہیں دستار بندی ہوئی تھی اور طب یونانی سے بھی واقف تھے حضرت

مولانا سے نہایت تعلق و عقیدت رکھتے تھے اور بیعت بھی۔ حضرت مولانا کی روانگی ہند
سے ایک سال بعد ۱۳۳۴ھ میں اپنے پھوپی زاد بھائی مولوی سید ہاشم کے ساتھ
براہ عدن و پورٹ سوڈان مکلا وغیرہ گئے۔ وہاں کا حاکم سید ہاشم کے والد کا معتقد و
مرید تھا اس نے مناسب نذرانہ پیش کیا۔ اور جدہ تک ٹکٹ کا انتظام کر دیا۔
اور یہ دونوں صاحب بارادۂ حج آخر ذیقعدہ میں مکہ معظمہ پہنچے۔ اور طائف سے
نجات پانے کے بعد جو حضرت نے ۱۳۳۴ھ میں حج ادا فرمایا ہے اس میں شریک
ہوئے۔

شریف صاحب ترکوں سے مخالف ہو چکے تھے اور مدینہ منورہ پر ترک قابض
تھے۔ راستہ میں جنگ وجدل کا بازار گرم تھا اس لئے حج سے فارغ ہونے کے
بعد سید ہاشم صاحب زیارت مدینہ سے مایوس ہوئے تو ہندوستان واپسی کا
ارادہ کیا۔ ان کے مقدر میں حضرت کی معیت کا شرف لکھا تھا اور ان کا جسد عنصری
مالٹا کے سنسان گور غریباں کو لبیک کہہ رہا تھا۔ بھائی کو رخصت کر دیا اور آپ اس
امید پر مکہ معظمہ پھر گئے کہ شاید حاضری حرم مدینہ کی کوئی سبیل نکل آئے۔ اپنے رفیقوں
کو رخصت کرنے کے بعد یہ اپنے کرایہ کے مکان میں تنہا رہ گئے حضرت مولانا بھی حج
کے بعد مکہ معظمہ میں مقیم تھے حضرت کو اپنے مخلصوں اور ارادت مندوں سے جو خاص
مروت و شفقت تھی۔ اس کے تقاضے سے حضرت نے فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ اس
مکان کو چھوڑ کر آپ بھی ہمارے پاس آجائیں۔ چودھری صاحب کے لئے اس سے
بہتر اور کیا صورت ہو سکتی تھی بہت غنیمت سمجھا اور اپنا مکان چھوڑ کر حضرت کے رفقاء
میں شریک ہو گئے ابھی تین ہی روز گزرے تھے کہ حضرت کی گرفتاری کا حکم پہنچا اور
جس روز حکم کی تعمیل ہوئی یہ بھی ہمراہیوں میں محسوب ہو کر لا یشقے جلیسہم کے مصداق
ہوئے اور حضرت کے ہمراہ حراست میں جدہ روانہ کر دیئے گئے۔

مولوی صاحب نہایت ذکی ہوشیار۔ دیندار۔ انگریزی داں قوی الایمان و
راسخ القدم تھے طبیعت نہایت جوشیلی رکھتے تھے اور عالم اسلامی کی پستی اور مصائب

اور ہندوستان کی ذلّت کو دیکھ کر نہایت کلفت اُٹھاتے تھے مالٹا میں جان دیدی لیکن حضرت کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ حکام انگریزی نے بھی متعدد مرتبہ ان سے کہا کہ آپ پر کچھ جرم نہیں آپ ہندوستان جاسکتے ہیں مگر ان کا یہی جواب تھا کہ سب رفیقوں کو رہا کیا جائے تو مَیں بھی جاؤں گا۔

بیماری میں کہا گیا اور خود حضرت مولانا نے بھی فرمایا کہ حکیم صاحب اگر آپ رضا مند ہوں تو جانے کا انتظام کرا دیا جائے مگر یہ وفادار مخلص کسی طرح اور کسی حال میں دوسروں کو اسیری میں چھوڑ کر وطن واپس جانے پر راضی ہی نہ ہوئے اور ہر موقع پر بلاخوف وخطر زبان سے کلمۃ الحق کہتے رہے دو سال کی نظر بندی کے بعد مالٹا کی شدت برودت سے متاثر ہو کر نزلہ و زکام میں مبتلا ہوئے اور عرصہ تک مریض رہ کر حضرت کے قدموں میں جان آفریں کو سپرد کر کے شہادت غربت حاصل کی اور مالٹا کے مقبرے میں مدفون ہوئے (جس کا کچھ حال آئندہ مذکور ہوگا) زوجہ اور والدہ ضعیفہ اور صدیق حسن اور شبیر حسن دو بچے دہ سالہ اور ہفت سالہ چھوڑے ہیں خدا تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرماوے، اور چودھری صاحب کو حضرت کی معیّت اور اپنی رحمت و مغفرت نصیب فرماوے۔

بہ حالت اسیری قاہرہ روانگی

حضرت مولانا کی گرفتاری کی خبر ہندوستان میں مجمل طور سے مشہور ہوگئی تھی کچھ تفصیل معلوم نہ تھی کہ کیا قصور ہے اور کس جگہ مقیم ہیں کوئی کہتا تھا کہ نظر بند ہونے کے لئے ہندوستان آرہے ہیں کسی نے سُنا کہ رنگون بھیجدئے گئے۔ کیونکہ جدّہ سے یہ حضرات کوئی خط روانہ نہیں کرسکے جس سے کچھ حال معلوم ہوتا۔

قاہرہ کی جیل میں

جدّہ میں تقریباً ایک ماہ گزارنے کے بعد ۱۸ ربیع الاوّل ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو بروز جمعہ عربی حکومت کے بدو سپاہیوں کی حراست میں بہاؤالدین

انسپکٹر کی نگرانی میں جہاز میں سوار کئے گئے اور انسپکٹر صاحب بھی سوار ہو کر ان مجرمانِ بے قصوری کو سویز کی طرف لے چلے۔

چوتھے روز ۲۲ ربیع الاوّل کو صبح کے وقت جہاز سویز پہنچ گیا اور بیس گوروں گارد سنگین اور بندوق لگائے ہوئے آکر ان حضرات کو فوجی کیمپ میں لے گیا اور ایک خیمہ میں ٹھہرا کر ہندوستانی سپاہیوں کا پہرہ مقرر کر دیا اور ہندوستانیوں ہی سے کھانا پکوا کر دیا گیا۔ اگلے روز صبح کی نماز کے وقت ہی وہی گوروں کا مسلح گارد آکر کیمپ سے نکال کر اسٹیشن پر (جو بہت ہی قریب تھا) سب رفیقوں کو لے گیا اور تمام اسباب ہمراہ رکھ کر ریل پر سوار کر دیا اور یہ گارد بھی ہمراہ سوار ہو گیا۔ اسی روز یعنی ۲۴ ربیع الاوّل کو دو بجے گاڑی قاہرہ کے اسٹیشن پر پہنچی جو ملکِ مصر کا دارالسلطنت اور سب سے بڑا شہر ہے اور دریائے نیل کے کنارے پر واقع ہے اسی میں علوم عربیہ کا مشہور و معروف دارالعلوم جامع ازہر واقع ہے۔ قاہرہ دریائے نیل کی دائیں جانب واقع ہے اور بائیں جانب کی آبادی کو جیزہ کہتے ہیں جو ایک مستقل ضلع شمار ہوتا ہے۔ ظہر و عصر کی نمازیں یہاں کے عظیم الشان اور پر رونق اسٹیشن پر اسی گارد کی حراست میں با جماعت ادا کیں عصر کے بعد ایک موٹر آیا اور سب حضرات کو مع اسباب و سامان کے جیزہ میں لے گیا۔ یہاں ایک پرانا جیل خانہ بیکار پڑا تھا جو سامان رکھنے کے لئے تاجروں کو کرایہ پر دے دیا جاتا تھا۔ زمانۂ جنگ کی ضرورتوں سے اس کو خالی کرا کے سیاسی قیدیوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا اور مستقل سیاسی (سیاسی قید خانہ) کہتے تھے۔

ان ایام میں یہاں تقریباً ڈیڑھ سو سیاسی مجرم قید تھے جن میں اکثر مسلمان اور چند عیسائی تھے۔ جماعتِ بزرگان کی تلاشی لی گئی اور چاقو اُسترہ وغیرہ اور زرِ نقد جو کچھ تھا وہ سب علیحدہ کرا لیا گیا اور کہہ دیا کہ جب ضرورت ہوا کرے بمقدار ضرورت لے لیا کرو۔ اور احاطۂ جیل کے اندر ایک خیمہ نصب کر کے چار پائیاں بچھا کر ان حضرات کو ٹھہرا دیا گیا اور گورنمنٹ کے خرچ سے ترکی مطبخ سے کھانا لا کر دیا گیا، اور سیاسی نظر بندوں میں سے حاجی غلام نقشبند کابلی وغیرہ نے چائے بھیج دی۔ اگلے روز ایک

طویل کمرہ میں سب کی چارپائیاں داخل کر دی گئیں جس کا دروازہ لوہے کی سلاخوں کا مضبوط بنا ہوا تھا۔

رات بخیریت گزری لیکن صبح ہوئی تو گویا صبح قیامت آئی۔ خاص محافظ آئے اور پنجتن کے روح رواں یعنی حضرت مولانا کو اپنی حراست میں لے کر چلے گئے۔ چاروں خادم لاچار و مجبور دیکھتے رہ گئے۔ نہیں جانتے تھے کہ ہمارے آقا کو کہاں لئے جاتے ہیں اور کیا معاملہ کریں گے۔ لیکن بے دست و پا اسیر تھے کیا کر سکتے تھے نہ کوئی خبر دینے والا نہ حال بتلانے والا۔ عجیب ضیق کی حالت تھی۔ تمام دن اسی تشویش میں گزر گیا۔ بعض محافظ ان کی مضطربانہ حالت دیکھ کر تسلی بھی دیتے تھے کہ حضرت کی جان پر کچھ خطرہ نہیں مطمئن رہو۔ مگر ایسی باتوں سے کہاں تسلی ہوتی تھی۔

حضرت مولانا کو پہلے جیل کے دفتر میں لے گئے نام، نسب عمر وطن وغیرہ دریافت کر کے لکھا گیا۔ پھر وہی محافظ آپ کو ٹریم میں بٹھلا کر جنگی دفتر اور مرکز کی طرف لے چلے جو یہاں سے بہت دور شہر میں واقع تھا۔ وہاں اظہارات کے مختصر کمرے میں بعزت کرسی پر بٹھلایا گیا اور تین انگریزوں نے جن میں سے دو بخوبی اردو جانتے تھے نام و نسب اور پتہ دریافت کرنے کے بعد اظہار لینے شروع کئے تقریباً پانچ گھنٹے تک مختلف سوالات کر کے جواب لئے۔ ہندوستان میں مولوی عبدالحق حقانی کے لکھے ہوئے (گورنمنٹی) فتوے کی تصدیق سے انکار کی وجہ اور شریفی فتوے کو رد کرنے کا سبب اور مولوی عبیداللہ سندھی کا حال اور مولانا سے تعلق دریافت کیا اور خفیہ پولیس کے ایجاد کردہ بالکل بے بنیاد الزامات کا حال مثلاً مدینہ منورہ میں غالب پاشا کی ملاقات اور افغانستان کے ریشمی رومال کے متعلق تحقیق کی۔ حضرت مولانا نہایت بے رخی اور اکھڑے ہوئے طریقہ سے بلا التفات مگر نہایت استقامت و صداقت کے ساتھ جواب دیتے رہے جن کو افسر انگریزی میں لکھتا رہا۔

قیدِ تنہائی

اظہارات کے بعد بدستور سابق آپ کو جیل میں واپس کر دیا گیا، لیکن رفیقوں کے کمرے میں نہیں لائے بلکہ اندر جیل خانہ میں لے جا کر ایک کال کوٹھڑی میں تنہا مقید کر کے باہر سے قفل لگا دیا۔ اس شدید مصیبت میں حضرت مولانا نہایت صبر و سکوت کے ساتھ ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ اپنی تکالیف و مصائب کا کچھ رنج نہ تھا مگر اپنے رفیقوں کی طرف سے خطرہ ہو رہا تھا کہ جب میرا یہ حال ہے تو خدا جانے اُن پہ کیا گزری ہوگی۔ مگر وہ چاروں ابھی تک بحال خود یکجا تھے لیکن حضرت کی جدائی سے پریشان تھے حضرت نے اپنی ضروریات دلائل الخیرات قرآن مجید و تسبیح طلب فرمائی تو اُن لوگوں نے بھیجدی اور لوٹا اور کسی قدر پان دے دیئے۔ اُن کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت قید تنہائی میں ہیں۔

حضرت مولانا اسی حالت میں محبوس رہے اگلے روز مولانا حسین احمد صاحب کی باری آئی۔ ۲۴ ربیع الاوّل ۱۳۳۵ھ (۱۸ جنوری ۱۹۱۷ء) روز پنجشنبہ کو حضرت مولانا مقید ہوئے تھے۔ جمعہ کے روز ان کو کچہری میں لے جا کر بعزت بٹھلا کر حسبِ دستور اظہار لینے شروع کئے۔ شریف کی بغاوت اور مسئلہ خلافت اور ترکی حکومت سے مسلمانوں کے تعلقات اور دیگر سوالات تقریباً وہی جو حضرت مولانا سے کئے تھے ان سے بھی کئے گئے۔ یہ چونکہ فضل و کمال کے ساتھ ایک جوشیلے مقرر اور تیز طبیعت کے باذاق عالم ہیں اس لئے بڑے دلچسپ اظہار دیتے وہ کچھ پوچھتے ہیں یہ زورِ تقریر میں کہیں اور چلے جاتے ہیں بقول خود خوب زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ اسی لئے دو روز میں ان کے اظہار ختم ہوئے۔ لکھنے والا افسر بار بار کہتا تھا کہ ہمارے کاغذات میں جو ہندوستان کے محکمہ تفتیش نے مرتب کر کے اور طرح طرح کے بے بنیاد الزامات قائم کر کے بھیجے تھے تم لوگوں کی نسبت باتیں تو پھانسی کی ہیں لیکن تم اقرار نہیں کرتے۔

اظہارات کے بعد مولانا حسین احمد صاحب بھی حضرت کی کال کوٹھڑی کی برابر والی

کوٹھڑی میں اُسی طرح تنہا محبوس کر کے رفیقوں سے جُدا کر دیئے گئے اب کچھ قرائن سے
اور کسی قدر بعض نرم دل محافظوں کی خبر سے ان سب رفیقوں کو معلوم ہُوا اور مولانا حسین احمد
کو خود اپنے حال پر قیاس کر کے یقین ہُوا کہ حضرت بھی اسی قسم کے زندان میں مقید ہیں۔
چوتھے روز مولوی وحید احمد صاحب کا نمبر آیا اور پانچویں روز مولوی عزیز گل صاحب کا
بلا خوف وہراس نہایت خوبی سے اظہار دے کر یہ بھی حسب دستور قید تنہائی
میں پہنچے۔

سب سے اخیر میں مولوی نصرت حسین صاحب طلب ہوئے مولوی صاحب
چونکہ انگریزی خوب جانتے تھے اور مقدمہ بازی وقانون سے واقف تھے۔ گورنمنٹ
کی خیر خواہی کی طرز میں حضرت مولانا کی بے قصوری اور شریف صاحب کے گورنمنٹ
سے تعلقات اور ان کی مذمت خوب مفصل بیان کر کے اپنے حسن بیان سے سب کو
گرویدہ اور معتقد بنا لیا۔ اظہار کے بعد ان کو بھی جیل واپس کر کے بظاہر اس لئے کہ
کوئی پانچویں کوٹھڑی خالی نہ تھی اور تاکہ اپنے ضعیف شیخ کی خدمت واعانت کریں ان
کے چارپائی حضرت مولانا کی کوٹھڑی میں بچھا دی گئی مگر مقصود کچھ اور تھا جس کو مولانا
ہی سمجھتے تھے۔

یہ وقت ان خاصانِ خدا تعالیٰ کے سخت امتحان اور تکلیف کا تھا۔ چھ روز تک
ایک کو دوسرے کی صورت دیکھنا اور آواز سُننا نصیب نہیں ہُوا۔ جزع فزع گریہ وفریاد
کا نام نہ تھا۔ لیکن قلوب بے چین اور مضطرب تھے۔ کھانے کے وقت ہر شخص کی مجلس
میں کھانا پہنچایا جاتا تھا۔ خدام نے کبھی کبھی بہ مقتضائے بشریت جوع وضعف سے
لاچار ہو کر بادل ناخواستہ ایک دو لقمہ وقت پہ کھا لیا لیکن آفرین ہے اُس مظہر شفقت
کو کہ بارہ وقت گزر گئے مگر خادموں کی جدائی میں ایک دانہ نہ کھایا یہ کوئی مقاطعۂ جوعی
نہ تھا جو شرعاً ناجائز سمجھا جاتا ہے بلکہ شدت کلفت اور فراق احباب ومخلصین میں طعام
کی طرف رغبت نہ ہونا حضرت کا اقتضا طبعی تھا۔ نیز بایں خیال کہ خدا جانے رفیقوں
کو کھانا ملا یا نہیں اور وہ کس مصیبت میں ہوں گے۔ مقتضائے مروّت وحسن رفاقت

بھی تھا۔ اسی احاطہ میں بعض دیگر اسیر بھی تھے۔ جو اس طرح مقفل کوٹھڑیوں میں مقید نہ تھے۔ انھوں نے کسی ترکیب سے مولانا کی مجلس تک پہنچ کر نیز مسلمانان ملازم اور محافظوں نے ہر چند ادب سے بقسم عرض کیا کہ کھانا جو دو وقت آتا ہے اس میں کوئی چیز ناجائز نہیں ہے اور آپ کے ہمراہی بخیریت ہیں۔ کھانا پہنچا دیا جاتا ہے، مگر حضرت کسی کی نہ سُنتے تھے۔ کبھی چارپائی سے کمر نہیں لگائی بیٹھے بیٹھے غنودگی آگئی تو خیر ورنہ مونس حقیقی سے دل لگائے ہوئے باطمینان خاطر بیٹھے رہتے تھے اور چارپائی سے نیچے کمبل بچھائے ہوئے قرآن شریف دلائل الخیرات تسبیح و مراقبہ و صلوات میں مشغول رہتے اور اس ظلمت کدہ کو ذکر اللہ سے منور رکھتے تھے۔ دیگر حضرات بھی اپنے اپنے زندان میں حسب استعداد ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔

چھ روز تک حضرت نے ایک لقمہ نہیں کھایا کبھی کبھی چائے پی لیتے تھے اور پان کھاتے رہتے تھے۔ کیونکہ خدام نے مکہ معظمہ سے سوکھے ہوئے پان بہت سے ہمراہ لے لئے تھے اور اس قید تنہائی میں بھی ٹکڑے بنا کر کسی محافظ یا بالٹی بردار کے ذریعہ سے حضرت کے پاس پہنچا دیتے تھے البتہ جب مولوی نصرت حسین صاحب آپ کی کوٹھڑی میں پہنچے اور سب رفیقوں کو سرگذشت اور برابر کی کوٹھڑیوں میں سب کی موجودگی بیان کی تو حضرت کی تشویش میں کمی ہوئی اور مولوی صاحب کے اصرار پر ایک دو لقمہ تناول فرمایا اور چارپائی پر استراحت فرمائی۔

شیخ الہندؒ کا ثبات و استقلال

یہ ایام تھے محنت و تکلیف کے اور اظہار ثبات و استقلال کے۔ حضرت مولانا کے اظہار ہوئے جس کے دل میں ہیبت حق جاگزیں ہو وہ کسی دوسرے سے کیا مرعوب ہو سکتا ہے بڑے بڑے افسروں کے مشکل اور پیچیدہ سوالات کے جواب ایسی لاپروائی اور بے تکلفی سے دیتے کہ گویا کسی بہت ادنیٰ شخص کو نہایت معمولی بات کا جواب دے رہے ہیں جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت کے بعد رفیقوں کے اظہار ہونے

اور اسی طرح سات روز تک اظہاروں کا سلسلہ جاری رہا، خیالات تعلقات، حالات و واقعات کے متعلق سوالات ہوتے تھے حضرت مولانا کی تاثیر صحبت تھی کہ ہر شخص سلف صالحین کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ حالانکہ سب نو عمر تھے اور غریب الوطن بالکل عزیز و اقارب سے جُدا نہ کوئی مونس تھا نہ غمگسار۔ اور پھانسی کی سزا کا ظن غالب مگر کیا مجال کہ پائے ثبات کو ذرا لغزش ہوجائے۔ نہ جان کا خوف تھا نہ قید کی تنہائی کا خیال جو بات منہ سے نکلتی تھی حق اور جو جواب دیتے تھے سچا۔ افسروں نے ایسے اسیر نہ آنکھوں سے دیکھے تھے نہ کانوں سے سنے۔ اِن نفوس متبرکہ نے یورپ کو دکھلادیا کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔

حکیم نصرت حسین صاحب کے اظہاروں کی نسبت فرماتے تھے کہ "مولوی نصرت حسین صاحب نے کبھی خلاف حق اور لچر بات نہیں کی۔ لیکن انگریزی جانتے تھے ہوشیار شخص تھے ایسے طرز سے گفتگو کرتے تھے کہ افسر ذرا خوش ہوجاتے تھے اور متوقع رہتے تھے کہ ہمارے مفید مدعا کوئی بات ان کے مُنہ سے نکلے گی۔"

فرماتے تھے کہ ان کے اظہاروں کے بعد ان سے میری شکایت کی کہ "تمہارے شیخ نے ہماری بات کا سیدھے منہ جواب نہیں دیا۔" مولوی صاحب نے کہا کہ ان کی عادت ہی ایسی بے پروائی کی ہے اور کچھ زبان نہ سمجھنے سے آپ کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس کے بعد مجھ پر احسان کیا اور میرے ضعف کو دیکھ کر مولوی صاحب کو میرے کمرے میں شریک کردیا کہ شیخ کو ان کی رفاقت سے راحت ملے گی۔ مگر مَیں سمجھ گیا کہ مطلب سعدی دیگر است (حضرت کو افسروں کی ہمدردی کا یقین نہیں آیا۔ وہ خیال فرماتے تھے کہ مولوی صاحب کو میرے پاس اس لئے رکھا، کہ شاید وہ اپنے خیالات سے مجھے متاثر کرکے میرے خیالات کی سختی کو کچھ کم کردیں کیونکہ افسران تفتیس کو مولوی صاحب اپنے الفاظ سے خوش کردیتے تھے۔

ایک لطیفہ

انہیں اظہارات کے سلسلہ میں ایک روز حضرت سے ایک افسر کی طرف سے ایک انگریز ترجمان نے (جو ہندوستان میں رہ چکا تھا اور اردو دانی میں مشہور تھا) کہا کہ "افسر آپ کے فائدہ ہونے کا مقام پوچھتا ہے" حضرت کچھ نہ سمجھے۔ پھر اس نے یہی کہا حضرت حیران تھے کہ کیا کہتا ہے۔ سوال نہ سمجھنے کا عذر کیا مترجم بھی عدم قدرت کی وجہ سے لاچار ہوا مگر بار بار عبارت کو بدل کر آخر یہ کہا کہ افسر کہتا ہے کہ "یعنی آپ کہاں فائدہ ہوا" مولانا نے بے اختیار تبسم فرما کر کہا۔ کہ "میں بریلی میں پیدا ہوا"

قید خانے کا عالم

قید تنہائی کی کوٹھڑیوں میں چیڑ کے تختوں کی ایک چارپائی بچھی رہتی تھی جس پر گدے کے علاوہ ایک کمبل اوڑھنے کا دو بچھانے کے لئے رکھے ہوئے تھے کوٹھڑی کے ایک کونے میں ایک بالٹی رکھی رہتی تھی جس میں وضو پاخانہ پیشاب کرنے کا حکم تھا۔ اس پر ڈھکنا بھی ڈھکا رہتا تھا۔ پانی کے لئے صراحی اور جلانے کے لئے موم بتی اپنے خرچ سے خرید کر رکھنے کی اجازت تھی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند اور مقفل رہتا تھا البتہ پشت کی جانب روشنی اور ہوا کے لئے بہت اونچائی پر ایک ایک روشندان تھا کوٹھڑیوں کے پیچھے ایک جگہ چھوٹی ہوئی تھی جس کے دو طرف دیواریں اور ایک طرف جالی تھی۔ ہر روز صبح کو ایک مجرم کو کوٹھڑی سے نکال کر اس احاطہ میں ہوا خوری کے لئے داخل کر دیتے تھے۔ اسی وقت صفائی کرنے والے ملازم بالٹی اٹھا کر لے جاتے اور صاف کر کے لا رکھتے اور پھر ایک گھنٹہ کے بعد پہلے قیدی کو کوٹھڑی میں پہنچا کر دوسرے رفیق کو نکال کر احاطہ میں لاتے۔ اسی طرح سب رفقا کو علیحدہ علیحدہ ایک ایک گھنٹہ ہوا کھلا دیتے۔ جب سب رفیقوں کے اظہار ختم ہو گئے تو ساتویں دن صبح کو ایک ہی وقت میں

سب کو نکال کر احاطہ میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت ان بچھڑے ہوئے رفیقوں کی خوشی کا عالم نہ پوچھئے۔ سات دن کے بعد وہ خادم جن کے بدن میں خون خشک ہو رہے تھے کہ دیکھئے مخدوم کا کیا حال ہوگا۔ اپنے آقا کی زیارت کر کے مسرور ہوئے اور حضرت ان کو دیکھ کر مطمئن۔ اور پھر باہمی گفتگو سے اس وقت سب کو یہ خاص مسرّت ہوئی کہ سب رفیقوں کے اظہار و بیان میں کچھ مخالفت نہیں۔ جسکا پہلے سے اندیشہ تھا بلکہ سب کے بیان تقریباً یکساں ہیں حالانکہ پہلے سے باہم کسی مشورے اور ذکر کی نوبت نہ آئی تھی بلکہ جو سوالات غیر واقعی اور بے اصل الزامات کے متعلق یہاں مصر میں کئے گئے ان کا تو کسی کو وہم و گمان ہی نہ تھا۔

اظہارات کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد بھی حالت بدستور رہی اور یہ طائفہ صالحہ اپنی قید تنہائی کو مشاغل حسنہ میں گزارتا رہا۔ علاوہ معمولی عبادات کے کسی نے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کر دیا۔ کسی نے حصن حصین اور حزب البحر کے اوراد شروع کر دیے کسی نے آیت کریمہ، وظیفہ یونس علیہ السلام اور تسبیح و تہلیل کا شغل کیا۔ ان تکالیف و عبادات سے ان حضرات کی روحانی نورانیّت اور ترقی درجات میں دم بدم ایسا اضافہ ہوتا رہتا تھا کہ مدّتوں کی ریاضت میں بھی بہ مشکل نصیب ہوتا۔ سچ ہے ؏

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

کئی روز تک صرف ہوا خوری کے وقت ایک گھنٹہ کے لئے باہمی ملاقات میسر ہوتی تھی اس کے کچھ بعد ان حضرات کی صلاحیت اور تقدس کے اثر سے اور کچھ حضرت فلوس کی برکت سے ملازمانِ جیل نے اتنی رعایت کی کہ صبح کو ہوا خوری کے لئے داخل کر کے چار بجے تک وہیں رہنے دیتے اور چائے اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں پہنچا دیتے جس کو یہ حضرات پُر لطف یکجائی کے ساتھ نوش فرماتے اور چار بجے شام سے ۷ بجے صبح تک قید تنہائی میں مشاغل فرائض و مستحبات میں مشغول رہتے۔

ہندوستان میں اب تک حضرت کا حال مشتبہ چلا آتا تھا کوئی یقینی بات معلوم نہ ہوتی تھی۔ الجیزہ (متعلقات قاہرہ) سے انہیں ایام شدائد کا لکھا ہوا سب سے

پہلا خط ہندوستان میں مولانا حسین احمد صاحب کا آیا، اور پھر حضرت کا۔ ان خطوط میں خاص تکالیف کا اشارہ بھی نہ تھا اس لئے تحقیق حال ہوجانے سے تمام متعلقین و متوسلین کو گو نہ خوشی بھی ہوئی اور آپ کی اسیری کے یقین اور دوری کے احساس سے انتہائی صدمہ بھی ہوا۔ تاہم حضرت کے تسلی آمیز فقروں سے کچھ ڈھارس بندھتی تھی اس کے بعد حضرت کے رفیقوں کے خطوط بھی ہندوستان آتے رہے اور معمولی خیریت معلوم ہوتی رہی۔

قاہرہ سے مالٹا منتقلی

اسی تکلیف میں ایک ماہ گزارنے کے بعد اس جماعتِ مقدسہ کو قاہرہ سے مالٹا منتقل ہونے کی نوبت آئی (جو بقول حضرت مولانا گویا نظربندوں کا ہائی کورٹ ہے کہ بڑے سنگین مجرم اور سیاسی نظربند وہاں رکھے جاتے ہیں) اور قید تنہائی سے آزاد ہوکر وہاں بہت کچھ راحت و آرام ملا۔ اور مولوی وحید احمد صاحب کے لئے تو اپنی ہوشیاری اور نوعمری کی تیزی کی وجہ سے ہر محکمہ ہر آفس ہر دوکان میں دخل تھا۔ ہر محافظ ان کا مطیع تھا اور حضرت کی برکت سے ہر افسر اُن کا لحاظ اور رعایت کرتا تھا۔ بقول شخصے ؏

ان کی تو وہاں سلطنت تھی اسیری نہ تھی

۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو حضرت مولانا کو جیل کے افسر نے بلاکر اطلاع دی کہ تم لوگ مالٹا بھیجے جاؤ گے۔ ضروری سامان کرکے تیار ہوجاؤ۔ ان حضرات نے اپنے اس ذخیرہ سے جو بوقت داخلۂ زندان اُن سے جُدا کرکے محفوظ رکھا گیا تھا۔ دو گنیاں طلب کرکے معمولی قرض چائے وغیرہ کا ادا کیا اور باقی نقد ایک ہمراہ رکھی۔ اگلے روز صبح کے وقت مع تمام سامان کے موٹر میں بٹھلاکر گوروں کی گارد کی حفاظت میں قاہرہ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیا گیا اور اسی وقت ریل میں سوار کرکے گارد کی سنگینی حفاظت میں اسکندریہ پہنچا کر اسٹیشن

پر اُتار اگیا۔ اور وہاں سے بند موٹر میں بٹھلا کر جہاز کی گودی پہ لیجا کر جہاز میں سوار ہونے کا حکم دیا اور بالائی طبقے پر ایک بڑا کمرہ بتلا دیا جس کے دو طرف متعدد چار پائیاں بچھی ہوئی تھی اور درمیان میں ایک لمبی میز تھی اور آخری جانب ایک کمرہ میں پاخانہ و غسل خانہ بھی تھا ان حضرات نے پانچ چار پائیوں پر بستر جما کر آرام فرمایا اور شام کے وقت مولوی نصرت حسین صاحب کی انگریزی میں جہاز کے افسر سے گفتگو کرنے پر حضرت مولانا کی مرضی کے موافق سامان کا سامان چنے کی دال، ماش کی دال، آلو گھی نمک مصالحہ اور چائے اور چاول کچے مل گئے جن کو اپنے برتنوں میں جہاز کے باورچی خانہ میں مولوی وحید احمد اور مولوی نصرت حسین پکا کر لاتے تھے کیونکہ عیسائیوں کا پکایا ہوا گوشت و سالن کھانا جائز نہ تھا ڈبل روٹی میں کچھ مضائقہ نہ تھا اس لئے فی کس ایک ایک ڈبل روٹی صبح و شام روزانہ مل جاتی تھی جس کو سب رفیق یکجا بیٹھ کر اپنے پکائے ہوئے سالن سے کھا لیتے تھے۔ جہاز اُسی روز تقریباً سات بجے شام کو روانہ ہو گیا جو پانچویں روز مالٹا کی بندرگاہ پہ پہنچ گیا۔

یہ جہاز اسکندریہ سے چل کر ابھی تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ منتظمان جہاز نے ہر ایک شخص کو کاگ کی لکڑی کی بنی ہوئی پیٹیاں دیدی (جس کی ڈاٹ بوتلوں میں لگاتے ہیں جو کپڑوں کے اندر سلی ہوئی اور جڑی ہوئی ہوتی ہیں جہاز ڈوبنے کے وقت جس شخص کے گلے میں یا کمر میں پڑی ہوئی ہو وہ چوبیس ۲۴ گھنٹے تک ڈوبنے سے محفوظ رہتا ہے) اور کہدیا۔ کہ دن ہو یا رات کسی وقت ان پیٹیوں کو اپنے سے جُدا نہ کرو خدا جانے کیا واقعہ پیش آئے کہ برطانیہ اور جرمنی کی آتش حرب اُس زمانہ میں نہایت مشتعل تھی جرمنی جہازات اور آبدوز کشتیاں دُشمن کے جہازات کو غرق کرنے کے لئے سمندر میں گشت لگاتی رہتی تھیں۔ مگر غیر مسلح سپاہیوں اور زخمی و مریض سپاہیوں کو ایذا پہنچانا اور تعرض کرنا خلاف انسانیت اور معاہدات کے مخالف تھا جہاز کے کپتان نے ایک روز دُشمن کا جہاز دیکھ کر خطرہ محسوس کیا اور اپنے جہاز کو اُس کی زد پر دیکھ کر ہلاکت کا گمان کر کے مسافروں کو مطلع کیا اور پیٹیاں گلے میں ڈال لینے کی تاکید کر کے کہا کہ میری دُوسری اطلاع پر سب اسباب چھوڑ کر کشتیوں کو (جو اسی قسم کے خطروں کے

خیال سے جہاز کے گرد لگی رہتی ہیں) دریا میں ڈال کر ان میں کود پڑنا۔ اب لوگ زندگی سے مایوس اور مضطرب و پریشان ہوئے۔

حضرت مولانا اپنے استقلال سے بالکل اطمینانی حالت میں تھے اور آپ کے اثر سے رفقاء بھی۔ سب اسباب چھوڑا لیکن قرآن کا عزیز از جان ناتمام ترجمہ محفوظ باندھ کر مولوی عزیر گل صاحب کے گلے میں حمائل کیا اور حرمین شریفین کے بعض نہایت مخصوص تبرکات اور اپنے اکابر (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے متبرک لباس وغیرہ بیش قدر چیزیں اپنے اور دیگر رفقا کے گلے میں لٹکائیں۔ بایں اُمید کہ شاید کسی کو کسی طرح نجات ہو جائے اور یہ عزیز از جان چیزیں ضائع ہونے سے بچ جائیں تھوڑی دیر کے بعد کپتان نے اطلاع دی کہ اب دشمن جہاز کا یہ خاص خطرہ رفع ہو گیا۔ دشمن جہاز نے دُور بین سے دیکھا اور معمولی مسافروں اور اسیروں کا غیر جنگی جہاز سمجھ کر چھوڑ گیا۔

مالٹا کے حالات اور زمانۂ اسیری کے واقعات

اہل ہندوستان کے لئے مالٹا ایک ایسا غیر مانوس مقام اور گمنام اور شہر تھا کہ ہزارہا اہل ہند نے کبھی اُس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ خدا تعالیٰ کے نامحدود عجائبات قدرت میں سے یہ بھی ہے کہ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو چند روز کے لئے دُنیا کے دارالامتحان میں بھیجدیا تھا۔ چنانچہ حدیث میں الدنیا سجن المؤمن فرمایا گیا ہے ایسے ہی ترقی درجات کے لئے حضرت مولانا کو نظر بند کرا کر وہاں پہنچایا۔ اور اسیر مالٹا کے فرط اعتقاد کی وجہ سے ہر شخص کی زبان پہ مالٹا کا نام آنے لگا۔

مالٹا ایک مختصر جزیرہ اور جہازوں کا بندرگاہ ہے عرصہ دراز تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا ہے اور دوسری غیر اسلامی سلطنتوں کے تصرف میں رہنے کے بعد گورنمنٹ انگریزی کے مقبوضات میں شمار ہوتا ہے۔ تمام جزیرہ مالٹا کے نام سے مشہور

ہے جس میں بہت سے شہر اور قصبے اور دیہات ہیں۔ سب سے بڑا شہر اور جزیرہ کا
دارالحکومت مقام والیٹہ ہے۔ خاص شہر مالٹا سمندر سے نہایت قریب اور جہازوں کا
بندرگاہ اور نہایت خوبصورت مقام ہے۔ شہر کے اطراف میں سبزہ زار اور آبِ رواں
کے چشمے اور عمدہ تفریح گاہیں موجود ہیں شہر نہایت آباد ہے اور بہت سے قابلِ دید
عمدہ مکانات پر مشتمل ہے اور عام طور سے نہایت صفائی اور رونق نظر آتی ہے ایک طرف
سمندر لہریں مار رہا ہے اور بندرگاہ پر جہازوں کے لنگر انداز ہونے اور اموال تجارت
اُتارنے اور بار کرنے کے لئے گودی بنی ہوئی ہے۔

یہاں ایک نہایت وسیع قلعہ ہے جو قدیم زمانہ میں پہاڑ کھود کر بنایا گیا تھا جس کی
دیواریں اور خندقیں نہایت مستحکم و مضبوط ہیں اور علاوہ ایک وسیع میدان کے بہت
سی پُر تکلف اور آرام دہ عمارتیں بھی اس میں بنی ہوئی ہیں۔ یہ قلعہ حقیقت میں فوج اور
افسروں کے رہنے کے لئے بنایا گیا تھا اور جن کی ضرورتیں بھی اس میں ملحوظ تھیں بڑی
مقدار سپاہیوں کی اور افسروں کی یہاں مقیم رہتی تھی۔ ایام جنگ میں جبکہ خطرناک اسیروں
کے لئے زیادہ محفوظ مقام کی ضرورت ہوئی تو گورنمنٹ نے اس خاص مقام کو معزز
درجہ کے اسیران جنگ اور سیاسی نظربندوں کے لئے نہایت مناسب خیال کر کے
فوجی سپاہیوں اور افسروں کو یہاں سے ہٹا کر خالی کرا لیا گیا کیونکہ اسیر اگر کسی طرح
قلعہ سے نکل بھی جائے تو سمندر اُس کے لئے سدِ راہ موجود ہے۔

اس قلعہ کو گورنمنٹ نے اسیروں کے لئے خاردار تاروں کے ذریعہ سے مختلف
حصّوں پر تقسیم کر کے ہر ایک حصّہ کو مستقل محفوظ کیمپ بنا دیا ہے اور ہر حصّہ کا علیحدہ نام
تجویز کر دیا ہے۔ کوئی حصّہ سینٹ کلیمنٹ کے نام سے مشہور ہے۔ کوئی بلغار کیمپ
ہے کوئی روگیٹ کیمپ ہے کسی کو عرب کیمپ کہتے ہیں کسی کو گریک کیمپ۔ کسی کو
وردالہ براکس۔ ہر ایک کیمپ میں گوروں کا نہایت سخت و سنگین پہرہ رہتا تھا۔ صرف
دس بجے سے بارہ بجے تک ایک کیمپ سے دوسرے میں جا کر نظر بند لوگ باہم ملاقات
کر سکتے تھے البتہ ایک کیمپ کے اسیر باہم ایک دوسرے سے بلا تکلف بلا کسی قید اور

پابندی کے مل سکتے تھے۔ پھر قلعہ کے دروازے پر سخت گارد متعین تھا کہ بلا خاص احکامات اور بدون افسروں کی اجازت کے کوئی اسیر کسی ضرورت سے قلعہ سے باہر شہر میں یا اور کسی جگہ نہیں جا سکتا تھا۔ قلعہ میں اسیروں کے لئے ہر قسم کی ضروریات نہایت اعلیٰ پیمانہ پر مہیا کی گئی ہیں بعض کیمپوں میں ایک ایک بڑی دوکان تھی جس پر جملہ ضروریات شہر سے لاکر مہیا کرے اور ایک سبزی وغیرہ کی دکان تھی جو موسمی ترکاریاں اور میوے لاکر فروخت کرتا تھا بعض کیمپوں میں صرف خیمے ایستادہ تھے اور بعض میں عمدہ کمرے اور کافی مکانات بنے ہوئے ہیں کیمپوں کے درمیان میں ایک بہت بڑا سرکاری دفتر ہے جس میں تمام انتظامات کے لئے بڑا افسر کرنیل اور اُس کے ماتحت میجر، کپتان وغیرہ اور ملازموں کا بڑا عملہ رہتا تھا۔

اسی قلعہ کے متعلق دو شفا خانے تھے۔ بڑے کیمپ سینٹ کلیمنٹ میں چھوٹا شفاخانہ تھا اور اُس سے ایک فرلانگ پر بہت بڑا فوجی شفا خانہ تھا جس میں تمام ضروریات اور سامان راحت کے مکانات اور بیماروں کے لئے بہ تعداد کثیر آرام دہ کمرے اور بستر اور صدہا ملازم و خادم موجود رہتے تھے ڈاک کا بھی نہایت اہتمام تھا، دوشنبہ اور جمعرات کو ایک کھلا ہوا لفافہ ملتا تھا جس کو روانہ کرتا تھا اور مختلف جگہ سنسر مقرر تھے۔ سنسروں کے خطوط جو دیگر ممالک سے آتے تھے سرکاری ڈاکخانہ سے اس دفتر میں پہنچ جاتے تھے جس کو اہل کیمپ خود ڈاک کے انتظام کے لئے قائم کرتے تھے اور وہاں سے بطرزِ مناسب نمبروار تقسیم کر دیئے جاتے۔

حضرت مولانا جیسی بے لوث مقدس ہستی کو اسیر کرنے کی شکایت بجائے خود درست لیکن گورنمنٹ کی یہ جوہر شناسی قابلِ داد ہے کہ اس نے حضرت کا اعزاز ہر موقع پر ملحوظ رکھا اور نظر بندی کے لئے بھی اپنے خیال میں بہترین (محفوظ ترین) جگہ تجویز کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو حضرت کی شان میں کچھ فرق نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن گورنمنٹ کی مردم شناسی کے خلاف ہوتا۔ اور جیسے بہت سے امور میں گورنمنٹ کے ترک و واجبات پر ہم بجز خاموشی کے کچھ نہیں کر سکتے یہاں بھی یہی کرنا پڑتا۔

مالٹا پہنچنا

جہاز اسکندریہ سے چل کر ۲۹ ربیع الثانی (۲۱ فروری ۱۹۱۷ء) روز دوشنبہ کو دس بجے مالٹا میں لنگر انداز ہوا۔ لیکن عصر کے وقت تک اسیروں کے اتارنے کی کچھ فکر نہیں کی گئی۔ چار بجے کے بعد تمام اسیر ترکی سپاہی اور افسران، یہ پنجتن جہاز سے آتارے گئے۔ اسیر افسر موٹر میں روانہ ہوئے اور افسر اتارنے کے لئے آتا تھا وہ اپنے ساتھ یکہ میں بٹھلا کر حضرت مولانا کو قلعہ میں لے گیا اور باقی چار رفیق ترکی اسیر سپاہیوں کے ہمراہ پا پیادہ قلعہ تک پہنچے اور ان کا اسباب ترکی اسیر افسروں کے ہمراہ موٹر میں رکھ کر پہنچا دیا گیا۔ راستے میں اہل شہر اور ان کی عورتیں اور بچے جو سب کے سب عیسائی تھے قطاریں باندھے ہوئے تماشا دیکھنے کے لئے کھڑے تھے اور مسلمانوں کی قید اور ذلت پر خوشیاں مناتے اور مذاق اڑاتے تھے اور غالباً اسی لئے اسیروں کو جہاز سے اُتارنے میں دیر کی گئی تاکہ اہل شہر کو خبر ہو جائے اور تفریح کے وقت تماشا دیکھنے کو جمع ہو جائیں جس سے ان پر انگریزوں کی حکومت کا دبدبہ اور مسلمانوں کی تذلیل ظاہر ہو۔

حضرت مولانا مغرب کے وقت قلعہ میں پہنچے اور وہاں آپ کو روگیٹ میں داخل کیا گیا جس میں بہت سے ترکی افسر اور مکہ معظمہ سے گرفتار شدہ لوگ تھے۔ اس کیمپ میں رہنے کے لئے صرف خیمے تھے۔ باورچی خانے اور غسل خانے کے علاوہ کوئی پختہ مکان نہ تھا آپ نے وضو کر کے نماز ادا فرمائی اور آپ کے رفیق پا پیادہ ہونے کی وجہ سے کچھ دیر میں پہنچے۔ نماز کے بعد کچھ قلیل سامان چائے کا کر کے نوش کی۔ اسباب درست کیا۔ ایک خیمہ میں حضرت مولانا اور مولوی عزیر گل اور مولانا حسین احمد صاحب کے لئے چارپائی پر بستر لگایا۔ اور دوسرے میں مولوی نصرت حسین اور مولوی وحید احمد کے لئے۔ اور عشا کے بعد جلد سو جانے کا قصد کیا مگر بعض زیارت کرنے والوں اور مکہ معظمہ کے حالات دریافت کرنے والوں کی وجہ سے بہت

دبہ میں سونے کا موقع ملا۔

اُن حضرات کی عظمت اور امتحان فی سبیل اللہ نے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی قلعہ مالٹا میں ان کی شہرت کردی تھی اور صدہا اسیران حرب (جن میں مکہ معظمہ وغیرہ سے گرفتار ہونے والے معزز ترکی افسر اور شامی اور عربی لوگ اور جرمنی افسر بھی تھے) ان خیار عباد اللہ کے نادیدہ مشتاق ہو رہے تھے سب نے حسب موقع زیارت کی اور ان بزرگوں کے طہارت و تقدس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں مشتاقانِ دیدار میں میجر حسن عزت بیگ بھی تھے جو پہلی ہی ملاقات میں عقیدت مند مخلص بن گئے۔ یہ ایک نہایت خلیق شریف وضع دمشق کے رہنے والے علمی خاندان کے ممتاز شخص تھے ان کے ہر قول و عمل سے انسانیت و مروت ٹپکتی تھی حکومت عثمانیہ کے مختلف ممالک میں معزز عہدوں پہ رہ کر ہمدردی و اخلاص سے سلطنت کی خدمت کرنے کی وجہ سے ذمہ دار منتظمان سلطنت کی نظر میں نہایت وقعت رکھتے تھے۔ یمن کے گورنر کے حکم سے فوجی معاملات کے متعلق حجاز جانے کے لئے بحری راستہ اختیار کیا تھا۔ انگریزی جنگی جہاز نے راستے میں کشتی کو پکڑ کر گرفتار کر لیا۔ اور جو کچھ ساز و سامان ہمراہ تھا ضبط کر کے ان کو عدن کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ پھر وہاں سے مصر اور مصر سے مالٹا منتقل کر دیا۔

میجر موصوف نظر بندی سے واقف تھے اوّل ملاقات میں بادب عرض کیا کہ آپ ابھی نئے آئے ہیں اگر مصارف کی تنگی ہو تو ہم سب لوگ خادم و مخلص ہیں، ہم سے ظاہر فرما دیجئے۔ اس وقت تو سب نے شکریہ ادا کر کے یہ کہہ دیا کہ ایک رقم معقول جو مصر میں ہم سے گورنمنٹ نے لے لی تھی دو چار دن میں آجائے گی لیکن جب اس کے آنے میں تاخیر ہوئی اور باوجود درخواستوں اور تقاضوں کے پتہ نہ ملا اور مصارف میں بہت دقت پیش آنے لگی تو ان حضرات نے تکلف نہیں کیا اور مختلف اوقات میں پانچ پونڈ قرض لئے، اور دیگر مخلصین سے بھی جو قریب رہتے تھے بضرورت شدیدہ قرض لینے کی نوبت آئی۔ اس کے بعد سرکار کی طرف سے بھی ان حضرات کے لئے

دو ماہ کا وظیفہ فی کس دو پونڈ کے حساب سے دس پونڈ وصول ہوئے اور تین ماہ کے بعد مصر سے بھی جس رقم کا انتظار تھا اس کے ۷۷ پونڈ وصول ہوگئے جس میں سے میجر حسن بیگ وغیرہ کے سب قرض ادا کئے گئے اور چونکہ مالٹا میں گرانی شدید تھی اور وظیفۂ سرکاری کالعدم، اس لئے ایک سال سے پہلے ہی یہ سب رقم صرف ہوگئی اور مکہ معظمہ کے سوداگروں کے پاس جو چالیس پونڈ امانت چھوڑ آئے تھے وہ بھی مالٹا کے آفس کی معرفت بہت سی باقاعدہ درخواستیں دینے کے بعد معتمد برطانوی مقیم جدہ نے ان حضرات کے پاس بھجوا دی جس کو نہایت کفایت شعاری سے خرچ کرنا شروع کیا اور نقد وظیفہ مقرر ہونے تک اسی میں سے خرچ ہوتا رہا۔

شیخ الہندؒ اور اُن کے رفقاء کا تقویٰ اور احتیاط

چودہ پندرہ ماہ تک ان حضرات کو کھانے کے لئے سرکار سے رسد ملتی تھی یعنی کچا سامان طعام مسور کی دال۔ چاول۔ نمک۔ چائے۔ شکر۔ دودھ کے ڈبے موم بتی ہفتہ بھر کا باندازہ مقررہ ایک دفعہ مل جاتا تھا۔ اور صابن کپڑے دھونے کے لئے بمقدار کثیر مہینے میں ایک مرتبہ اور کچا گوشت، ترکاری، کوئلہ اور پکی ہوئی ڈبل روٹی روزانہ ملتی تھی۔ لیکن گوشت وہ ملتا تھا جو فاحہ میں مدتوں سے برف میں محفوظ چلا آتا تھا۔ کیونکہ مالٹا جنگی ضروریات کا بڑا مرکز ہے وہاں تمام فوجی ضروریات کا بڑا ذخیرہ نہایت اہتمام سے موجود رہتا ہے۔ گوشت کے لئے بھی سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا مکان بنا ہوا ہے۔ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے آسٹریلیا وغیرہ دور دراز مقامات سے مہیا کر کے ہزاروں من گوشت طبی قاعدہ سے برف کی بڑی بڑی سلوں میں دبایا جاتا ہے اور بوقت ضرورت نکال کر صرف کیا جاتا ہے۔ بعض ٹکڑے سولہ سترہ برس کے بعد بھی نکلے تو ظاہری صورت میں بالکل تازہ گوشت نظر آتا تھا۔ البتہ سنتا ہے کہ لذت میں کچھ فرق ہو جاتا ہے۔ یہ گوشت چونکہ باقاعدہ ذبیحہ نہ ہوتا تھا بلکہ منخنقہ (گلا مروڑا ہوا) یا جدید مشین کے ذریعہ سے ذبح اور صاف کیا ہوا ہوتا تھا اس لئے حضرت مولانا

نے اس کے کھانے سے احتراز فرمایا اور باوجود رغبت لحم کے مدتوں گوشت کا نام بھی نہ جانا۔

ترکی اور شامی اسیر جن میں بعض اچھے عالم بھی تھے۔ اسی گوشت کو استعمال کر رہے تھے کیونکہ گورنمنٹ نہ اس گوشت کو واپس لیتی تھی نہ اس کی جگہ کوئی دوسری چیز دیتی تھی۔ نہ حلال گوشت کا کچھ انتظام کرتی تھی ان میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ حلال ہے خواہ کسی طرح ذبح کریں اور بعض عالم تاویل کرتے تھے کہ بغیر گوشت کے زندگی دشوار ہے اور اس کے سوا دوسرا گوشت یہاں میسر نہیں ہو سکتا لہٰذا ہم مضطر ہیں اور یہ لحم ہمارے لئے حلال[1] ہے۔ مگر شیخ الہند اور ان کے رفقاء نے دکھلا دیا کہ ضعیف اور قوی لڑکا اور نوجوان ہر شخص بلا گوشت زندہ رہ سکتا ہے اور رضائے مولیٰ کے لئے اس طرح لذّات کو چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ حضرت کے اس ورع و اتقا کا اثر تمام مسلمانوں پر پڑا۔ اہل علم نے مولانا حسین احمد صاحب سے اپنے اشکال پیش کر کے شبہات زائل کئے اور مولانا کی تحقیقات سے مستفیض و محظوظ ہوئے اسی طرح رفتہ رفتہ علماء اور اکثر عوام نے وہ لحم مقتول نصاریٰ کھانا چھوڑ دیا اور سب حضرات نے بلا گوشت گزارا کیا۔ چنانچہ مولانا حسین احمد صاحب نے ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ قد شابهنا الجوكية بترك اللّحم والسَّمن (یعنی گوشت اور گھی چھوڑ دینے میں ہم ہندوستان کے جوگیوں سے مشابہ ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد مولوی وحید احمد صاحب نے زندہ خرگوش خریدنا چاہا۔ مگر محافظین نے (جو تمام فرمائشیں ان حضرات کی شہر کے بازار میں سے خرید کر لا دیا کرتے تھے) کہا کہ ہم ذبح کر کے لا دیں گے کیونکہ تمام قلعہ میں جانوروں کا پالنا یا باہر سے زندہ جانور لا کر ذبح کرنا نہایت ممنوع تھا جو لوگ تازہ گوشت کسی حیوان کا چاہتے تھے وہ شہر کے عیسائیوں کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا آ سکتا تھا اور مرغی اور خرگوش بھی باہر ذبح کر کے اندرونی آلائش نکال کر صاف شدہ حالت میں قلعہ میں داخل کرتے تھے۔ انہوں نے

---

[1] یہ دونوں عذر صحیح نہیں ہیں مفصل بحث اس مسئلہ کی مولانا حسین احمد صاحب کے سفرنامہ میں ہے ۱۲

کہا کہ ذبح شدہ لانے سے ہم کو کیا فائدہ ہوگا ہم تو اپنا ذبیحہ کھانا چاہتے ہیں۔ محافظ وہاں کے قواعد سے مجبور تھے۔ ان حضرات نے دفتر انتظام سے مراجعت و مراسلت کی اور اپنے مذہبی اعذار بیان کئے۔ چونکہ اس جماعت کی سلامت روی اور مذہب کی پختگی کو وہ لوگ خوب تجربہ کر چکے تھے۔ اس لئے دشواری کے بعد اجازت ہوگئی، کہ زندہ مرغ یا خرگوش یا کبوتر منگائیں اور اس کو سرکاری سپاہی کے سامنے ہی ذبح کر لیں اور پھر صفائی کے قوانین کا پورا لحاظ رکھیں۔ چنانچہ ان حضرات نے شرائط قبول کر کے جانور منگا کر ذبح کرنا شروع کئے۔ لیکن چونکہ دوسرے جانور نہایت ہی گراں تھے۔ کبوتر ڈیڑھ روپیہ بلکہ دو روپیہ میں دستیاب ہوتا تھا۔ مرغ پانچ چھ روپے میں، اس لئے زیادہ تر خرگوش خرید کر ذبح کیا جاتا تھا جس کا گوشت بھی زیادہ ہوتا تھا اور قیمت تین چار روپیہ۔ کبھی ایک ہفتہ میں دو مرتبہ گوشت پکتا کبھی ایک مرتبہ۔ اسی طرح تین سال کے عرصہ میں صدہا خرگوش کام آئے اور ہندوستان سے بھی بعض صاحبوں نے خشک گوشت روانہ فرمایا جس کو حضرت مولانا بہ غبت تناول فرماتے تھے۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کا وعدہ نہایت خوبی سے پورا ہوا خدا تعالیٰ نے گوشت بھی نصیب فرمایا اور پابندی مذہب بھی برقرار رہی اور ان حضرات کے بعد رفتہ رفتہ اس طرح زندہ جانور منگا لینے کی اجازت دیگر اسیروں کو بھی حاصل ہوگئی۔ اور ان بزرگوں کو برکت سے سب کو حلال گوشت میسر آجانے لگا۔

مسور کی دال اور دَلی ہوئی سفید گول مٹر مالٹا میں ملتی تھی۔ دوسری دالیں نہیں ملتی تھیں۔ البتہ مکہ معظمہ سے مولانا حسین احمد صاحب کے مخلصین اور ہندوستان سے حضرت کے خدام پارسلوں میں ماش کی دال دُھلی ہوئی اور بے دُھلی اور چائے اور چاول اور بڑیاں اور گھی وغیرہ بھیجتے رہے۔ چنانچہ حضرت مولانا ایک خط میں باوجود نظر بندی کی کلفت کے اپنی طبعی لطافت سے فرماتے ہیں۔

" پرسوں دو پارسل پہنچے جن میں ماش کی دال تھی۔ مولوی وحید احمد نے کھچڑی

پکائی بہت اچھی رہی سب نے شوق سے کھائی ۔ دال بہت اچھی ہے خوب گل جاتی ہے ہم کو خیال تھا کہ دیکھئے گلے گی یا نہیں ۔ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ ہندیوں کی دال مالٹا میں گل جائے"

ترکاریاں حسب موسم اکثر ملتی تھیں گوبھی، آلو ہر موسم میں پائے جاتے تھے ۔کدو، چقندر پالک مٹر کی پھلیاں وغیرہ ملتی تھیں مگر نہایت گراں ۔ بھنڈی اگر بہت ارزاں ہوتی تھی تو تین آنہ درجن اور وہ بھی بغیر چھانٹے ملتی تھی ۔گھی کی جگہ روغن زیتون استعمال کیا جاتا تھا جو مولانا کو ہندوستان کے گھی کی بہ نسبت بہت ہی مرغوب تھا ۔گوشت میں ڈالا جاتا ۔کبھی پلاؤ پکتا تو وہ اسی سے داغ کیا جاتا ۔سالن کی جگہ کام آتا ۔ بدن پر ملنے اور ناک کان میں لگانے کے لئے ہر وقت موجود رہتا ۔

بعض دوسرے ممالک کے اسیر بوجہ حسن عقیدت آجاتے تھے اور بہت سے معمولی کاموں میں مدد کر دیتے تھے ۔ اور صیدا سوریہ (علاقہ شام) کے اسیروں میں ایک مفلس اور ہمدرد و مخلص اسیر کو آٹھ روپے ماہوار پر روزانہ معمولی خدمات کے لئے (جیسے پارچہ شوی اور مکان کی صفائی اور کوئلے جلانا) ملازم رکھ لیا تھا ۔اور چونکہ وہ دل سے خدمت کرتا اور راحت پہنچاتا تھا اس لئے بطرز مروت و احسان دونوں کھانا بھی کھلا دیتے تھے ۔ ہانڈی چمچہ لے کر کھانا پکانے کا انتظام مولوی حسین احمد صاحب کرتے تھے اور باوجود دیگر رفقاء کے اصرار کے اس خدمت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے البتہ بوقت ضرورت دوسرے رفقاء سے امداد و اعانت لیتے تھے ۔صبح کو روزانہ چائے پکائی جاتی تھی جس میں ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈال کر کھا لیتے تھے لیکن حضرت مولانا کی چونکہ خوراک بہت کم تھی اور ضعف کا زمانہ تھا اس لئے دو بیضے نیم برشت بھی آپ کے لئے روزانہ تیار کئے جاتے تھے ۔حضرت کو اپنی یہ خصوصیت ناگوار ہوتی تھی ۔مگر جان نثار خدام نہیں مانتے تھے ۔ پھر دس بجے تک کھانا تیار ہو جاتا تھا اور حضرت مولانا اپنے رفیقوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بطرز مسنون کھانا تناول فرماتے ۔ ظہر کے بعد دوسرے وقت کا کھانا تیار کیا جاتا اور مغرب سے پہلے کھا کر فارغ ہو جاتے ۔ دونوں وقت کے طعام کے بعد بھی چائے روزانہ سب حاضرین کے لئے تیار کی جاتی تھی ۔کام کرنے والے یا

متعارف آدمی جو وقت پر موجود ہوتے برادرانہ طریق سے شریک طعام کرلئے جاتے تھے اور حسبِ اتفاق کبھی کسی شناسا و متعارف شخص کی دعوت بھی کردی جاتی تھی جس میں مولوی وحید احمد صاحب اپنے ہندوستانی کھانوں کی صنعت دکھلاتے تھے اور حضرت شیخ الہند کا دسترخوان جیسے وطن میں کشادہ رہتا تھا۔ غربت و نظربندی میں بھی خدا تعالیٰ نے وسیع ہی رکھا اور اکثر اوقات میں کوئی صورت تنگی کی پیش نہ آنے دی۔

کھانے کے واسطے نان پاؤ کے مشابہ تندور کی پکی موٹی روٹی ملتی تھی اور ترکاری وغیرہ دیگر مصارف کے لئے سات شلنگ (۷/۸) روزانہ سب رفقا کے لئے ملتے تھے اور چونکہ اپنے محفوظ سرمایہ میں سے بھی بقدر ضرورت لے سکتے تھے۔ اس لئے مصارف میں دقت پیش نہیں آئی۔

نومبر ۱۹۱۷ء (ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ) میں حضرت کی رہائی کی درخواست لے کر دارالعلوم دیوبند کے وفد کے پیش ہونے کے بعد لفٹننٹ گورنر صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری برن صاحب حضرت کی خدمت میں پہنچے اگرچہ ان کے سامنے بھی حضرت کی زبان سے کوئی نرمی اور توریہ تقیہ کا لفظ نہیں نکلا اور وہ حضرت کی استقامت فی الدین کو خوب سمجھ گئے تھے تاہم ان کی سفارش پر حضرت کے لئے پہلے سے بہتر مکان تبدیل کر دیا گیا اور وظیفہ مجموعی سب رفقا کا روزانہ نو شلنگ ہو گیا اس مکان میں ہر قسم کی راحت تھی اور صحن اس قدر تھا کہ دن کو دھوپ میں آرام سے بیٹھتے تھے اور مختصر کیاریاں بنا کر مولوی وحید احمد صاحب نے اپنی دلچسپی کے لئے خوشبودار چیزیں، مرچیں۔ کشنیز۔ پودینہ اور ٹماٹر وغیرہ بعض ترکاریاں لگائی تھیں۔

زمانۂ اسیری میں آپ کے معمولات

حضرت مولانا کی تمام عمر عبادت اور دینی اشغال ہی میں بسر ہوئی۔ جو روحانی اور باطنی ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں علوم دینیہ کی تعلیم و اشاعت اور احادیث نبویہ کی خدمت بھی محض لوجہ اللہ فرماتے تھے۔ تصنیف و تالیف میں جو وقت صرف

فرماتے تھے۔اس سے بھی خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہوتا تھا۔مہمانوں کی خدمت اور دوستوں کی مراعات وصحبت میں بھی ان کو اتباع سنت اور رضائے الٰہی مقصود رہتی تھی اور ان مشاغل کے باوجود بھی اذکار و اوراد و نوافل و تلاوت سے غافل نہیں رہتے لیکن مخصوص طور سے ان امور کی پابندی اور ان میں انہماک اور شب و روز کی مشغولیت اور محبوب حقیقی سے راز و نیاز کے لئے اور اس دوسرے طرز سے بارگاہ بے نہایت اور سیر فی اللہ کی ترقی کے واسطے فراغت اور یکسوئی کا وقت کبھی ایسا میسر نہیں ہوا تھا جیسا مالٹا کی اقامت میں حاصل ہوا۔اور ترقی معنوی و قرب الٰہی کے جو مدارج آپ کے لئے ازل سے مقدر ہو چکے تھے ان کے طے ہونے کا ذریعہ یہ نظر بندی اور سفر بنا دیئے گئے۔ان ایام میں آپ کو غیر اللہ سے انتہا درجہ کی یکسوئی بلکہ کراہت ہو گئی تھی کسی سے ملتے تھے تو بہ مجبوری بات کرتے تھے تو بضرورت، مولانا حسین احمد صاحب جیسے مقرب خادم اور محب محبوب صفت کا یہ خیال ہے کہ بعض اوقات تو حضرت مولانا کو ہم سے بات کرنا بھی ناگوار ہوتی تھی۔اس عدم تعلق بما سوی اللہ اور یکسوئی کے مضمون کو آپ نے واپسی مالٹا کے وقت مظفر نگر اور دیو بند کے درمیان میں خاص احقر سے حضرت نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ "بھائی یکسوئی کو کیا پوچھتے ہو بعض اوقات تو یہ خیال آتا تھا کہ یہ رفیق لوگ بھی ساتھ نہ ہوتے تو بہت اچھا ہوتا"[۱]

بہر حال زمانہ نظر بندی میں حضرت اکثر توجہ الی اللہ میں خاموش رہتے یا تسبیح و ذکر اللہ میں مشغول عشاء کی نماز کے بعد تھوڑی دیر اپنے وظائف پڑھتے تھے اور حسب موقع رفقاء سے علمی یا ضروری باتیں کرتے اور پھر آرام فرماتے۔دو بجے کے قریب بیدار ہو کر نہایت آہستہ آہستہ ایسی طرح اٹھتے کہ دوسروں کو خبر نہ ہو اور آرام میں خلل نہ آوے اور پیشاب اور وضو سے فارغ ہو کر نماز تہجد اسی کمرے میں ادا فرماتے

---

[۱] اس وقت حضرت کے بے تکلف خادم و رفیق مولانا عزیر گل صاحب موجود تھے کہنے لگے کہ حضرت وطن میں آکر ہم کو یہ انعام دیتے ہو۔مولانا تو ہنسکر خاموش ہو رہے احقر نے کہا کہ یہ خاص حالت اور ذاتی خیال تھا اس پر خفا نہ ہوجیئے۔۱۲

جو نماز کے لئے بطور مسجد کے مخصوص کر لیا گیا تھا (جس میں یہ حضرات بھی نماز پڑھتے تھے اور دوسرے اسیر بھی اپنی قیام گاہ سے آکر نماز با جماعت میں شریک ہو جاتے تھے کیونکہ اپنے اپنے کیمپ کے احاطہ کے اندر اسیروں کو کسی جگہ آمد و رفت کی ممانعت نہ تھی) تہجد کے بعد قیامگاہ میں آکر اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتے تھے اور صبح صادق تک مراقبہ اور ذکرِ خفی میں مشغول رہتے۔

نماز فجر کے بعد آفتاب بلند ہونے تک مصلّے پر مراقب بیٹھے رہتے اور نماز اشراق ادا فرما کر رفیقوں کے پاس کمرے میں تشریف لاتے اور چائے وغیرہ نوش فرماتے پھر قرآن شریف کی تلاوت فرماتے۔ کلام مجید کا ترجمہ لکھتے یا اس پر نظر ثانی و اصلاح فرماتے رہتے کبھی اس وقت میں خطوط لکھتے یا مولوی وحید احمد کو سبق پڑھاتے۔ طعام کے بعد اکثر قیلولہ فرماتے اور ڈیڑھ دو گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ضروریات اور وضو سے فراغت کر کے تلاوت قرآن و حزب الاعظم وغیرہ میں مصروف ہو جاتے اور ظہر کی نماز تک یہی شغل رہتا نماز کے بعد کبھی مولوی وحید احمد کا سبق ہوتا کبھی ترجمہ تحریر فرماتے یا رفیقوں کو سناتے اور کبھی بغرض ملاقاتِ احباب ہمراہی بعض خدام دوسرے کیمپوں میں تشریف لے جاتے عصر کے بعد تسبیح چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر ذکر خفی فرماتے رہتے۔ مغرب کے قریب کھانا تیار ہو کر دسترخوان پر آجاتا تو رفیق اطلاع کرتے اور آپ سب کے ساتھ شریک ہو کر تناول فرماتے اور پھر اپنی جگہ پر آکر ذکر اللہ میں مصروف ہو جاتے۔ مغرب کے بعد بھی نوافل اور ذکر اللہ میں عشاء تک مشغول رہتے۔

عید الاضحےٰ کی آمد

تقریباً چھ ماہ قیام کے بعد مالٹا میں عید الاضحیٰ کا زمانہ آیا۔ قربانی مسافر ہی پر واجب نہیں ہے۔ پھر جو شخص اسیری کے مصائب میں گرفتار ہو اس پر کیسے واجب ہو سکتی ہے مگر حضرت چونکہ ہندوستان میں کئی کئی قربانیاں کیا کرتے تھے لہٰذا آپ نے شعائر اللہ کی اقامت کرنے کے لئے اس مستحب کو بھی چھوڑنا گوارا نہ فرمایا۔ محافظوں

سے اطلاع کی گئی اور افسروں سے اجازت لی گئی کہ یہ سنتِ ابراہیمی ہمارا مذہبی حکم ہے کوشش کرکے اُضحیہ (قربانی) مہیّا کی جائے اور ذبح کی اجازت دی جائے۔ سچّی بات دل میں اُتر جاتی ہے اور للّٰہیت کا اثر ہوتا ہے۔ محافظ اور افسر مان گئے، اور نہایت وجستجو سے ایک دُنبہ سات گنّی کو خرید کر لایا گیا۔ قیمت حضرت نے بطیب قلب ادا فرمائی اور اس دارالکفر میں جہاں زوال سلطنت اسلامیہ کے بعد کبھی اس سنت ابراہیمی کے ادا ہونے کی نوبت نہ آئی ہوگی دسویں ذوالحجہ کو بلند آواز سے تکبیر کہہ کر قربانی کرکے واضح کر دیا کہ علو ہمّت ہو تو زندان میں مستحبات بھی ادا ہو سکتے ہیں۔

دارالحرب ہونے کے علاوہ چونکہ قلعہ میں آمد و رفت کا اذنِ عام نہ تھا (بلکہ حراست و حفاظت تھی) اور ادائے جمعہ و عیدین کے لئے اذنِ عام شرط ہے لہٰذا حضرت مولانا عیدین اور جمعہ ادا نہیں فرماتے تھے اور بعض ممالک کے اسیر صرف عیدین پڑھتے تھے اور بعض لوگ عیدین اور جُمعہ دونوں ادا کرتے تھے۔ حکم شرعی سے متنبہ ہو کر بعض علما نے آپ کا اتباع کر لیا اور بعض بدستور پڑھتے رہے۔

یورپ کی سردی ہندوستان سے بدرجہا زیادہ ہے۔ مالٹا میں بعض موسموں میں ایسی سخت سردی پڑتی تھی کہ بہت سے گرم کپڑے اوڑھنے بچھانے کے بعد بھی نصف شب کے بعد نیند نہ آتی تھی۔ ہوا ایسی سرد اور زور سے چلتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کٹ کر ٹکڑے ہو جائے گا۔ برتنوں میں رکھا ہُوا پانی (برف سے زیادہ) سرد ہو جاتا تھا۔ مالٹا کے ابتدائی قیام میں حضرت مولانا کو اسی سخت سردی کی تکلیف برداشت کرنی پڑی کھُلی ہوئی جگہ میں اسی سرد پانی سے وضو کرنا پڑتا تھا۔ لیکن کبھی معمولات میں ذرا فرق نہ آیا حسب عادت تقریباً دو بجے بیدار ہو جاتے اسی سردی میں وضو کرتے اور اپنے معمولات کو ادا فرماتے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے سامان راحت پیدا فرما دیئے اور گرم پانی بفراغت میسر ہونے لگا۔

کھانا پکنے کے بعد ٹین کا ایک بڑا برتن جو گورنمنٹ کی طرف سے چاء پکانے کے لئے دیا گیا تھا۔ جس میں آٹھ دس سیر پانی آ جاتا تھا خوب بھر کر گرم کر لیا جاتا تھا اور

کمبل میں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا تھا۔ یہ پانی صبح تک خوب گرم رہتا اور حضرت مولانا کو صبح تک کئی مرتبہ وضو کرنے کے لئے کافی ہونے کے بعد دوسرے لوگوں کے لئے بھی باقی رہ جاتا تھا۔

ظاہری اسباب کے موافق چونکہ ایسے شیخ کامل کا مالٹا کے قلعہ میں پہنچنا بعید از قیاس تھا اس لئے حق تعالیٰ نے بصورت نظر بندی آپ کو وہاں پہنچا کر دُور دراز کے خوش نصیبوں کے لئے ذریعۂ ہدایت اور سبب وصول الی اللہ بنایا اور ایسی جگہ مقیم کرایا کہ دُوسرے اسیر آزادی کے ساتھ آپ سے ملکر استفادہ کر سکیں۔ قلعہ میں طرابلس و مصر وروم وشام کے جنگی اسیر اور سیاسی نظر بند تھے اس مقدس جماعت نمونۂ اصحاب کو استعجاب کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ مذہب کا کس قدر احترام کرنے والے اور احکام خُداوندی کو عُسر و یُسر میں یکساں بجا لانے والے لوگ ہیں۔ یہ حضرات پابندی کے ساتھ اسی ایک کمرے میں جس کو بطور مسجد مخصوص کر لیا تھا، پنجوقتہ باقاعدہ با جماعت نماز ادا فرماتے۔ بہت سے دیندار مسلمان اسیر جماعت میں شریک ہوجاتے اور جرمنی عیسائی وغیرہ جن کو اس قسم کی عبادت دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہُوا تھا حیرت سے کہتے تھے کہ "یہ لوگ اپنے خُدا سے باتیں کر رہے ہیں"۔

مُسلم و غیر مسلم ہر شخص اعتقاد کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور تمام اہل قلعہ میں حضرت بجا طور پر ایک قطبِ زمانہ شمار ہوتے تھے اور ہر قوم کے معزز و مقتدر لوگوں کو حضرت سے بہت زیادہ ہمدردی تھی اور نہایت تعظیم سے پیش آتے تھے۔ عید کے موقع پر مسلمانوں کے علاوہ جرمنی اور آسٹرین وغیرہ کے ممتاز اور ذی وجاہت لوگ ملنے اور مبارکباد دینے آتے۔ بڑے بڑے انگریز فوجی افسر جرنیل و کرنیل وغیرہ جب حضرت کو دیکھ لیتے غایت تعظیم سے جھک جاتے ٹوپیاں اتار لیتے۔ بڑے بڑے ترکی افسر اور شامی لوگ بفرط عقیدت خدمت میں حاضر ہو کر انفاس متبرکہ سے فیض حاصل کرتے اور بہت سے لوگ سلسلۂ بیعت میں باصرار داخل ہوتے اور راہ مستقیم پاتے اور بہت سے معزز لوگ اور مشہور سپہ سالار انور بیگ کے بوڑھے

والد ماجد ایسے مخلص و معتقد ہو گئے تھے کہ گویا پُرانے رفیق و خادم ہیں۔

اسیروں میں جو لوگ اہلِ علم تھے اور اپنے مقام پر مرجع و معتمد سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات مولانا کے رفیقوں سے مفصل تحقیق و گفتگو کر کے مسائل و عقائد و علوم میں اپنے شبہات دُور کرتے اور کبھی کبھی حضرت مولانا سے با دب گفتگو کر کے تشفی حاصل کرتے اور حضرت ہی کی تحقیق پر عامل و معتقد ہوتے۔ ذبیحۂ نصاریٰ اور بالالٹے کے گوشت کے متعلق حضرت کا قول و عمل دیکھ کر صدہا لوگوں نے وہاں کے گوشت سے احتراز کیا اور مسئلہ حق پر عامل ہوتے۔ فوٹو کے متعلق ان میں بعض علماء کا خیال تھا کہ چونکہ تصویر کشی اس میں نہیں ہے اس لئے جائز ہے لیکن حضرت کا ارشاد اور مولانا حسین احمد صاحب کی تقریر سُن کر اکثر لوگ عدم جواز کے قائل ہو گئے۔ ان میں جو لوگ حضرت سے درخواست کرتے تھے کہ آپ اپنا فوٹو اتارنے کی اجازت دیں وُہ حضرت کا عذر شرعی سُنکر خاموش ہو گئے۔

زمانۂ اسیری میں قرآن مجید کا ترجمہ

حسنِ اتفاق دیکھئے اسی قلعہ میں ایک نہایت بزرگ عالم سلانیک کے مفتی اعظم مولانا فخرالدین آفندی بھی اسیر تھے اور حضرت سے با دب و عقیدت ملتے تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب نے ان سے کسی قدر ترکی زبان سیکھی اور اس سے بڑھ کر عجیب اتفاق دیکھئے کہ خاص قسطنطنیہ کے مفتی صاحب نہایت بوڑھے عالم بھی وہیں اسیر ہوئے جو ترکی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے تھے حضرت کی خدمت میں آمد و رفت شروع کی اور یہ معلوم کر کے ان کو بہت ہی مسرت ہوئی کہ شیخ الہند بھی ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں استفادہ کرتے حضرت کے مضامین و تحقیقات سے محفوظ ہوتے معتقدانہ حاضر رہتے۔ حضرت کے پاس ایک مطبوعہ قرآن مجید چار ترجموں کا تھا۔ جن میں دو ترجمے فارسی کے تھے اس کے مطالعہ کا شوق ظاہر کیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ اوّل تو ہم نے ان کے شوق کا اندازہ کرنا چاہا ان کی نذر نہیں کیا۔ ہر روز

لے جاتے اور چند گھنٹہ مطالعہ کر کے واپس دے جاتے رجب معلوم ہوا کہ واقعی قدر دان اور شائق ہیں اور اس کے اہل، اور یہ بھی خیال کیا کہ ان کو ترجمہ کرنے میں سہولت ہوگی۔ ہمارا ترجمہ تو ختم ہو ہی گیا ہے اگر ضرورت ہی پڑی تو ہندوستان پہنچ ایسا ہی اور خرید لیں گے وہ کلام مجید مفتی صاحب ہی کو دے دیا۔ نہایت مسرور ہوئے۔

مولوی وحید احمد صاحب مدنی مغرب کے بعد چراغ جلا کہ مشکوٰۃ شریف لے کر صحن میں بیٹھتے اور کیمپ کے مسلمان اسیر ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ مولوی صاحب ان کو احکام شرعیہ اور آداب مذہبی کی حدیث سنا کر تعلیم کرتے اور ہر شخص کو اس کی زبان (عربی، فارسی، ترکی) میں سمجھا کر ذہن نشین کرا دیتے۔

بہر حال قلعہ مالٹا کے ذریعہ سے حضرت کے ظاہری باطنی فیوض اُن دور دست ممالک تک پہنچ گئے جہاں اور کوئی صورت ہی خیال میں نہ آتی تھی اور ممالک بعیدہ کے اس قدر لوگ حلقۂ ارادت و اخلاص میں داخل ہوئے کہ شاید ہی کسی دوسرے بزرگ کے ہوئے ہوں۔

دو ترکی افسر قلعہ مالٹا میں نظر بند تھے ایک طرابلس الغرب کے باشندے تھے، حاجی علی اور دوسرے خاص ترکی، ان کا نام ڈاکٹر سعدی تھا۔ باہم کسی امر میں نزاع ہوا اور حاجی علی نے ڈاکٹر سعدی کو چاقو سے زخمی کر دیا۔ اسی زخم سے ڈاکٹر کی وفات ہو گئی اور قاتل پر مقدمہ قائم ہو کر سخت حراست ہو گئی (یہاں تک حضرت کے پہنچنے سے پہلا واقعہ ہے) واقعہ کی تفتیش ہوتی رہی اور جرم ثابت ہو گیا۔ سزائے موت سنائی گئی۔ یہ شخص چونکہ شیخ الہند کی تشریف آوری کی شہرت اور فضائل و کمالات سن چکے تھے افسروں سے باقاعدہ درخواست کر کے حضرت کو بلا کر نیاز حاصل کیا اور نہایت عقیدتمند ہو گئے اور پھر مکرر ملاقات کی استدعا کی چونکہ وہ دنیا سے رخصت ہونے والے تھے۔ حضرت کو رحم آیا اور پھر تکلیف فرمائی انہوں نے توبہ وغیرہ کی حضرت کو وصیت کی بوقت قتل آپ میرے قریب رہیں اور آپ ہی نماز جنازہ پڑھائیں اور میرے لئے دعاء مغفرت

فرماویں اور آپ کی جماعت میرے غسل وکفن میں شریک رہے۔ چنانچہ قتل کے روز حضرت مولانا اور مولانا حسین احمد صاحب پھر تشریف لے گئے۔ ترک نے حضرت کا ہاتھ پکڑ کر سولی کے بہت قریب کھڑا کر لیا تاکہ آخری دم میں تقویت رہے۔ مولانا حسین احمد ذرا فاصلہ سے کھڑے تھے ترک نے استقلال سے جان دی اور حضرت نے ان کی وصیتیں پوری کیں۔

مولانا نُصرت حسین کی مالٹا میں وفات

اسیری اور نظربندی ایک مصیبت عظیم ہے اور اس کے ساتھ اعزّہ اور مخلصین و خدّام سے جُدائی اور اشاعت حدیث سے معذور و مجبور ہوجانا انسان کے لئے انتہائی کلفت ہے۔ اس پر حضرت کے امتحان کے لئے ایک اور اضافہ ہوا۔ خادم و مخلص رفیق حضرت مولانا نصرت حسین صاحب مرض نزلہ و بخار میں مبتلا رہنے لگے (مولانا حسین احمد صاحب نے افسران بالا تک درخواستیں پہنچائیں کہ مالٹا کی برودت سے ہم لوگوں کی صحت پر مضر اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک رفیق برابر مریض رہتے ہیں۔ ہم کو یا تو آزاد کیا جائے یا کسی مناسب مقام پر تبدیل کیا جائے۔ لیکن معاملہ ہمیشہ زیر غور کھٹائی میں پڑتا رہا۔ اور کچھ نتیجہ برآمد نہ ہُوا) اور کچھ عرصہ کے بعد ماہ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ میں مرض مذکور کو اشتداد ہوگیا اور اسی مرض کی حالت میں ایک مرتبہ مرض نمونیہ میں مبتلا ہوگئے باوجود علاج و تدابیر کے جانبر نہ ہوسکے اور یہ راسخ العقیدت والمودّت عالم غربت و اسیری میں رفقاء نظربندی کو چھوڑ کر اعلیٰ علیین میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور موت غربت اور شہادت فی سبیل اللہ کے درجات سے ممتاز ہوئے۔

حالتِ مرض میں مرحوم کو شفاخانہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں بہت خوبی سے علاج ہوتا تھا اور رفیق حضرات بار بار جاکر خدمت کرتے تھے وفات کے بعد رفقا غسل و کفن کے فکر میں تھے مگر وہمی ڈاکٹروں کو ہر ایک مرض متعدی نظر آتا ہے ان کے کہنے سے محافظوں نے بلا اطلاع ہی تمام سامانِ نعش کو جلانے کا تیار کر لیا اور پھر حضرت

کو اطلاع دی۔ فرمایا کہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے ہم غسل و کفن دے کر نماز پڑھ کر دفن کریں گے۔ ڈاکٹر و محافظ تعدیہ کا خطرہ پیش کرتے تھے اسی ردّ و بدل میں بعض محافظوں نے کہا کہ جب ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے تو نعش کو اٹھا کر لے چلو۔ حضرت نے نہایت شدّت و قوت سے فرمایا کہ "اگر تم میں طاقت ہے تو اٹھا لو تم ان کو ہرگز نہیں جلا سکتے ہم ضرور نماز پڑھ کر دفن کریں گے۔"

اس ضعیف الجثّہ اسیر کی جرأت دیکھ کر سب محافظ ششدر و دم بخود رہ گئے اور شاید سمجھ گئے کہ ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب خلق نیست

اور نرم ہو کر یہ کہا کہ آپ ان کو دفن کر سکتے ہیں غسل و کفن و نماز موقوف رکھیں مگر حضرت کو اپنے عزم پر پختہ دیکھ کر اور باوجود اصرار کے نہ ماننے پر کہا کہ غسل میں چونکہ پانی وغیرہ پھیلنے سے سخت اندیشہ تعدیہ اور وبا پھیلنے کا ہے آپ صرف کفن دے کر اور مخصوص رفیق نماز پڑھ کر دفن کر دیں۔ یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ چند جوشیلے شامی اور ترکی اسیر خبر سُنکر دوڑے آئے اور مارنے مرنے پر تیار ہو گئے کہ ہم غسل بھی دیں گے اور تمام قلعہ کے اسیر جمع ہو کر نماز پڑھیں گے۔ قصّہ مختصر یہ ہے کہ ایک عظیم ہنگامہ اور فساد برپا ہو جانے کے اندیشہ سے مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ غسل کی جگہ تیمم کرا دینے پر حضرت بھی رضامند ہیں اب نزاع فضول ہے۔ افسر اور محافظوں کو بھی اسی میں خیر نظر آئی اور بوجہ معذوری غسل بقاعدہ شرعیہ تیمم کرا کر کفن دے کر جنازہ قبرستان چلنے کے لئے تیار ہوا۔ اسیر کی نعش کے ہمراہ قانوناً صرف پندرہ آدمی جا سکتے تھے لیکن اصرار اور جرأت کر کے اور محافظوں سے طوعاً و کرہاً اجازت حاصل کر کے پچپن دبندار اسیر ہمراہ ہو گئے اور مقبرہ میں پہنچ کر غمزدہ رفیقوں اور ہمدرد اسیروں کی جماعت نے شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا کی امامت میں نماز ادا کی اور ہندوستان سے ہزارہا میل کے فاصلہ پر سلطان

عبدالعزیز تھاں رحمۃ اللہ کے بناتے ہوئے قبرستان میں راضی برضائے الٰہی ہو کر سپرد خاک کیا۔ بظاہر ڈیڑھ بالشت اونچی قبر خام بنا کر چھوڑ دی اور حقیقت میں توحید پر جان فدا کرنے والے اہل ہند کی دینداری اور ثبات فی الدین کا کبھی نہ مٹنے والا ہزار ہا گز ملند نشان مرکز تثلیث میں قائم کر دیا۔

باپ کو بیٹے کے اور بھائی کو بھائی کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوتا جس قدر حضرت کو اس مرد مخلص کی وفات غربت سے ہوا۔ ہندوستان کے ایک خط میں نہایت درد انگیز لہجہ میں فرماتے ہیں "رفیق جاں نثار مولوی نصرت حسین کے دلخراش واقعہ کی خبر تم کو مل گئی ہو گی" لیکن خاصان خدا اور اہل اللہ جس اسلوب سے دنیاوی مصائب کو برداشت کرتے ہیں اور لنبلونکم بنقص من الاموال والانفس کے امتحان میں پورے اترتے ہیں حضرت مولانا اور آپ کے رفقا نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔

عین اسی زمانہ میں جبکہ ان اسیروں کی رہائی کی افواہیں سنکر ان کی ضعیف والدہ بیٹے کی آزادی کے لئے چشم براہ تھیں اور حسرت زدہ زوجہ دو چھوٹے بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے شوہر کی آمد کی منتظر تھی۔ تیر جگر دوز کی طرح اس خبر نے دل کے ٹکڑے اڑا دیئے کہ اس اسیر بلا کی روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر ایسے پُر بہار عالم میں پہنچ گئی کہ پھر آنے کا نام بھی نہ لے گی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اس واقعۂ فاجعہ کی درد انگیز تاریخ جو حضرت مولانا نے انہیں ایام رنج و محن میں تحریر فرمائی تھی خود حضرت کے قلم کے لکھی ہوئی اس وقت نظر کے سامنے ہے حرف بحرف نقل کی جاتی ہے۔

تاریخ واقعۂ جانکاہ جناب مولوی حکیم سیّد نصرت حسین مرحوم مغفور

ھو الغفور الرحیم

فغاں کہ مولوی نصرت حسین حامیٔ دیں — کہ بود جامع فضل و کمال و لطف و کرم
بہ اسر رابطہ در عین عنفوانِ شباب — قدم ز قیدِ فرنگ و حیات زد بعدم
بہ غیر قتل و سلاح درجۂ شہادت یافت — ز فضل رحمت ربّ غفور جلّ و عمّ
ز مخلصاں کہ پئے آں گذاشتی ہمہ را — چہ شد کہ چشم بہ بستی و رخ نہفتی ہم
چرا گناہ گرفتی دریں دیار ضعیف — گذاشتی رفقا را اسیر حسرت و غم
بہ شوق خلد مگر آنچناں شدی مضطر — کہ ہر دو قید بہ یکبارگی زدی برہم
جدا شدیم چو از یار و از دیار کنوں — کجا روم چہ کنم حالِ دل کرا گویم
بدوستاں مگر آموختی طریق خلاص — جزاك ربك یا خیر ناصح مفحم
بچشم اشک فشاں و بخاطر غمگیں — بحالِ حزن و تاسف چو سر فرو کردم

سروش گفت چہ نالی مگر نمی بینی
رہائی یافتہ از ہر دو قید دریکدم

۱۳ ۳ ۷ ھ

دیگر

نوبادۂ گلشن سیادت — از پا بسر افتاد را صد حیف
آں نصرت حسین راحتِ دل — رو سوئے عدم نہادہ صد حیف
سرمایۂ لطف و شادمانی — صد داغ بدل نہادہ صد حیف
خاک رفقائے بیکس و کو — صد حیف بباد دادہ صد حیف
از قید فرنگ آمدہ تنگ — پا سوئے عدم نہادہ صد حیف
زیں بزم گریز ناگزیر است — درد ہر یکیکہ زادہ صد حیف

زیں زمزمہ پر صدا ست گوشم
شمشاد ز پا فتادہ صد حیف

۱۳ ۳ ۷ ھ

(مالطہ محرم ۱۳۳۸ھ)

۱؎ بہ تخفیف الف (ر)

سلطان عبدالعزیز خاں رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے زمانۂ سلطنت میں یورپ کی سیاحت فرمائی ہے تو مالٹا میں بھی گزر ہوا۔ دیکھا کہ وہ شہر جس میں کبھی پانچ وقت ہر طرف سے خدائے واحد کی توحید کی صدائیں گونجتی تھیں۔ آج خدا کے نام سے ایسا محروم ہو گیا کہ کوئی اسلامی نشان تک نظر نہیں آتا۔ ہر طرف نصاریٰ کے قبرستان ہیں کوئی مسلمان اتفاقیہ وہاں وفات پائے تو مٹی برباد ہو۔ شہر سے باہر ایک نہایت دلکشا اور سبزہ زار جگہ پر مقابر مسلمین کے نام سے پختہ احاطہ بنوایا، اور غسل میت کے لئے وہاں ایک نہایت صاف و شستہ جگہ بنوائی اور اسی قبرستان میں ایک طرف مسجد بنوا کر ایک امام و محافظ تنخواہ دار مقرر کر کے خزانۂ سلطنت سے اس کی تنخواہ مقرر فرمائی۔ اسی قبرستان میں وارد و صادر سیاح و تاجر مسلمانوں کی چند قبریں پہلے سے موجود تھیں مگر یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ کون ہیں کس طرح یہاں آئے۔

مولوی نصرت حسین صاحب مدفون ہونے کے بعد حضرت کا خیال ہوا کہ ایک پتھر پر ان کا نام و نشان لکھ کر قبر کے قریب گاڑ دیا جائے (جس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے) نظربند ترکی افسر اشرف بے جو حضرت کے خاص معتقد و نیاز مند ہو گئے تھے، اس خیال پر مطلع ہو گئے۔ اپنے پاس سے زر کثیر خرچ کر کے دور دراز سے نہایت عمدہ پتھر منگا کر اور سب اہل قبور کے نام و نشان حتی الوسع تحقیق کر کے نہایت اہتمام سے پتھروں پر کندہ کرا کر علیحدہ علیحدہ سب کی قبروں پر لگا دیئے اور سب سے بہتر عمدہ پتھر پر عربی عبارت میں بطرز شائستہ مولوی نصرت حسین صاحب کا نام و نشان اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے رفقاء میں اسیر ہو کر مالٹا پہنچنا اور تاریخ وفات کندہ کرا کر خوبصورتی سے قبر کے سرہانے نصب کر دیا بالکل مکمل ہو جانے کے بعد حضرت سے استدعا کی کہ ملاحظہ فرما دیں، حضرت تشریف لے گئے اور ملاحظہ فرما کر خوشنودی ظاہر فرمائی جس سے اشرف بے کی تمام سعی اور مصارف کا ثمرہ بخوبی مل گیا۔

جان نثار رفیق کے تعلق نے پھر ایک مرتبہ کشش کی حضرت نے پھر زیارت قبور

اور فاتحہ خوانی کا قصد فرمایا بقول شخصے ؎

قبر پر فاتحہ پڑھنے کو نہ آئیں گے وہ کیا
جان دینے کا کچھ انعام ملے گا کہ نہیں

قلعہ سے نکلنے کی اجازت لی گئی اور بعد نماز ظہر وقت مقرر ہوا۔ اپنی سادہ طبیعت اور ثواب طلب نیت کے مقتضا سے حضرت کا خیال تھا کہ پیادہ پا تشریف لے جاکر زیارت قبور کا ثواب حاصل فرمائیں گے اور مغرب کے وقت واپس آجائیں گے۔ مگر مولوی وحید احمد صاحب (جن کی نو عمری کی شائستگی آمیز اور مؤدب شوخیوں پر حضرت براہ شفقت مواخذہ نہیں فرماتے تھے) محافظوں سے موٹر کی سواری کے انتظام کی فرمائش کر آئے (جو ان لوگوں کے اشاروں پر تعمیل کرتے تھے) حضرت نے ظہر کی نماز ادا فرما کر چلنے کا قصد کیا تو موٹر موجود تھا۔ حضرت تبسم فرما کر سوار ہو گئے اور آپ کی معیت میں ہر شخص نے سوار ہونے کو سعادت سمجھ کر جگہ لینے کا ارادہ کیا۔

حضرت مولانا کے علاوہ چار شخص سوار ہو گئے تھے۔ مولوی عزیز گل صاحب۔ رئیس ادارہ محمد حلمی بے آفندی۔ لفٹیننٹ عبدالرحمٰن آفندی۔ انگریزی افسر محافظ۔ مولوی وحید احمد صاحب کی جگہ نکل سکتی تھی مگر انہوں نے اشرف بے کو مشتاق معیت دیکھ سعادتمندی سے اپنی جگہ دے دی اور باوجود اشتیاق سیر کے خود رہ جانا گوارا کیا اور شاید دوستانہ بے تکلفی کے طرز پر اس کا معاوضہ شیرینی بھی اشرف بے سے وصول کیا۔

مقابر میں پہنچ کر حضرت نے فاتحہ پڑھی کچھ دیر قیام فرما کر اور نماز عصر وہیں ادا کر کے واپس ہوتے سوار ہو کر چلنے کے بعد ایک عرصہ گزر گیا مگر قلعہ تک نہ پہنچے اول تو حضرت کو تعجب ہوا پھر خیال فرمایا کہ شاید کسی بعید راستے سے واپس ہوئے ہیں پھر بھی دیر ہوئی تو حضرت کی پیشانی پر ناگواری کی شکن پڑے اور (موٹر بان کی نسبت) فرمایا کہ یہ ہم کو کہاں لئے پھرتا ہے۔ سب ہمراہی ادب سے خاموش رہے اور عرض کیا کہ حضرت اب پہنچے۔ پھر بھی دیر ہوئی اور مغرب کا وقت ہو گیا تو حضرت ناگواری

نہ فرما سکے اور غصہ کے لہجے میں فرمایا کہ کہاں لے جائے گا۔ اس سے کہ قیامگاہ پر چلے۔ سب رفیق دم بخود ہو گئے اور چند منٹ کے بعد قلعہ میں پہنچ گئے اور نماز مغرب بہ نسبت معمول کے کسی قدر تاخیر سے ادا ہوئی۔

دیوبند میں عصر کے بعد خود ہی اس واقعہ کی نسبت فرماتے تھے کہ "چلتے چلتے شہر کے گلی کوچے آجاتے تھے اور خیال ہوتا تھا کہ اب پہنچ جائیں گے مگر پھر جنگل اور پہاڑ اور سبزہ زار چشمے نظر آنے لگتے تھے۔ پھر آبادی میں سے گزرنے لگتے تھے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ویسے ہی جنگل اور سیرگاہیں پیش نظر ہو جاتی تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اشرف بے نے موٹر بین کو سمجھا دیا تھا کہ واپسی میں تمام مالٹا کی سیر کرا دینا (تاکہ حضرت ایک مرتبہ ضروری سیرگاہیں دیکھ لیں۔ کیونکہ قلعہ سے نکلنے کی اجازت ملنا اور پھر سیر کے لئے ایسا موقعہ میسر آنا دشوار تھا۔ نیز محض سیر کے لئے نکلنا حضرت کی طبیعت و مزاج سے ہی بعید تھا) فرماتے تھے کہ رفتار کا حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ اتنی دیر میں سینتالیس میل مسافت قطع کی ہے۔ اتنی تاخیر اور مسافت میں موٹر کا کرایہ بھی بڑھ کر ساڑھے چار گنا ہو گیا۔ ہم نے ہر چند دینا چاہا لیکن اشرف بے نے منظور نہ کیا خود ہی ادا کر دیا۔"

مولوی عزیر گل صاحب تو اس سیر سے بہت ہی محظوظ ہوئے مگر حضرت کو ایسے امور کی طرف توجہ نہ تھی وہ اپنے اور ہی خیال میں لگے ہوئے تاہم اس دور دراز کے گشت اور تاخیر کی مصلحت معلوم ہو جانے کے بعد ناگواری بالکل زائل ہو گئی اور اس سیر سے ہمراہیوں کو فرحت حاصل ہو جانے کی وجہ سے حضرت کو بھی بشاشت ہوئی۔

حضرت کو اپنے رفیقوں کی راحت کا اپنی برابر بلکہ زائد خیال رہتا تھا ایک دفعہ مکان سے پارسل پہنچے تو ان میں صرف چھالیا اور پان تھے۔ پارسلوں کی رسید کے ساتھ ہی رنج سے یہ تحریر فرمایا کہ

"دو پارسل پہنچے ایک میں پان اور چھالیا اور دوسرے میں صرف چھالیا تھی تم نے جوتوں کے جوڑے بھیجے تو سب کے واسطے۔ وہاں قربانی

کی تو سب کی طرف سے۔ پھر یہ پارسل ایسا کیوں بھیجا جس سے ایک کے
سوا کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ اتنی دُور سے پارسل آوے اور ایک کے
سوا کسی کو اس سے نفع نہ ہو تعجب کی بات ہے تھوڑا سا ادرک یا زیرہ
ہے یا بتاشے ہی رکھدئے ہوتے تاکہ سب کی ناک میں خوشبو ہی پہنچ جاتی
یا رال ہی میٹھی ہو جاتی"

مسلمان اسیران مالٹا تو اس خُدا پرست جماعت کے معتقد تھے ہی، لیکن غیر مسلم اسیر اور محافظ بھی ان کی حسن سیرت طاعت وعبادت طرز و ہیئت کو دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے اور ان کی صُلح جُوئی امن پسندی اور صلاحیت کو دیکھ کر محافظ بھی مطمئن ہو گئے تھے اور اخیر زمانہ میں حراست وحفاظت میں تخفیف ہوگئی تھی۔ جرمنی اسیر طرح طرح کی شرارتیں کرتے تھے کبھی ذخیرہ میں آگ لگا دیتے تھے کبھی قفل توڑ کر گودام میں سے کپڑے نکال لیتے تھے (کیونکہ وُہ جانتے تھے کہ قوانین جنگ اور قومیت و مذہب کی یکرنگی ہم پر تشدد سے مانع ہوگی اور اسیری سے بڑھ کر ہمارے لئے کوئی سزا ہی نہیں ہے) بعض جرمنی فرار ہوگئے لیکن سمندر حائل تھا کشتی میں بیٹھ کر کچھ دُور نکل بھی گئے تھے مگر پھر گرفتار ہوگئے بعض نے اعلان کر دیا کہ ہم فلاں تاریخ کو فرار ہوں گے اور سرنگ لگا کر عین اسی تاریخ کو راہ فرار اختیار کی دو تین روز کے بعد یہ بھی واپس لائے گئے کیونکہ دریا کی وجہ سے شہر سے نکل جانا ممکن نہ تھا قلعہ سے اگرچہ مختلف تدابیر سے نکل جاتے تھے۔

ہمارے مخدوم صبر و ثبات کے ساتھ خُدا پر توکل کئے ہُوئے اپنے علمی مشاغل و عبادت و طاعت میں مصروف تھے کبھی اس قسم کے ارادے تو درکنار خیال تک نہیں گزرتا تھا۔ البتہ اسی کے ساتھ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اور اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا مضمون بھی نظر انداز نہیں فرمایا تھا ایک روز کسی جگہ آفس میں اظہار دینے کے لئے دو نوجوان انگریز حضرت کو اپنی حراست میں لے چلے حضرت کو حمزۃ القضا کا واقعہ پیش نظر تھا اور حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مشتمل بر اظہار

جلادت قوت دلیر نقش تھا بالکل وہی لفظ گوروں کی زبان سے کہلا کر چھوڑا۔ جو صحابہؓ کی نسبت مشرکین نے کہا تھا یعنی حضرت ان کے ساتھ نہایت تیزی اور چستی سے چلتے رہے جس سے ضعف کا شائبہ بھی نہ ہو۔ ان محافظوں نے واپس ہو کر حضرت کے ہمراہیوں سے کہا کہ " تمہارے شیخ ہیں تو بوڑھے لیکن قوت ان میں بہت ہے چلنے میں ہم سے آگے آگے رہتے تھے "۔ حضرت سے رفیقوں نے ذکر کیا۔ تو ہنس کر فرمایا کہ " یہ انہیں کی برکت تھی "۔ (یعنی انہیں کے سبب سے عمداً تیز چلتا تھا۔ اگر بجائے ان کے مسلمان محافظ ہوتے تو اس کی ضرورت نہ تھی۔

ترجمۂ قرآن مجید کی تکمیل

وطن میں حضرت نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع فرمایا تھا لیکن تین سال میں بکوشش والتزام صرف دس پارے بہ شکل تمام کسی قدر غیر مکمل تیار ہوئے تھے۔ دارالعلوم میں شغل تعلیم اور زائرین و اضیاف کے ساتھ حضرت کی وسعتِ اخلاق کی وجہ سے فرصت ہی نہ ہوتی تھی اور اس طرح دس سال میں بھی پورا ہونے کی اُمید نہ تھی۔ مالٹا کی یکسوئی اور گوشہ نشینی میں خدا تعالیٰ کے فضل سے دو ہی سال میں کامل ہو گیا۔ اور حضرت مولانا نے کمال مسرت سے یہ مژدہ ہندوستان کو ۱۹ شوال ۱۳۳۶ھ کے خط میں تحریر فرمایا کہ " رمضان المبارک کے دو روز بعد ترجمہ قرآن شریف کا الحمد للہ کہ پورا ہو گیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں اطلاع کر دینا "۔ مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کو تعلیم قرآن مجید کا دلی شغف اور خاص اہتمام تھا اور اس ترجمہ کے نہایت مشتاق و آرزو مند تھے۔ افسوس ہے کہ حضرت ممدوح کی حیات میں یہ ترجمہ ہندوستان نہیں پہنچ سکا۔ باقی حال اس کا حضرت مولانا کی تصانیف کے تحت میں آوے گا۔

الابواب و التراجم کی تالیف

علم حدیث میں درجۂ کمال حاصل ہونے کی وجہ سے صحیح بخاری کے علوم سے حضرت

کو خصوصی مناسبت تامہ تھی۔ ترجمۃ القرآن کے ضمن میں مضامین کلام مجید میں غور کرنے کا یہ ثمرہ اور برکت ہوئی کہ تراجم بخاری کے علوم (جو ایک نہایت ہی دقیق و لطیف مشکل علم سمجھا جاتا ہے) حضرت پر منکشف ہو گئے۔ بقول مولانا رُوم رحمہ اللہ ؎

بینی اندر خود علوم انبیا
بے معید و بے کتاب و اوستا

اور خود بخود بلا اختیار ایک داعیہ غیبی تراجم بخاری کی تحریر پر محرک ہوا۔ اور حضرت نے ابتدائی کتاب کے تراجم کے متعلق نہایت بیش بہا وہبی مضامین کو نقوش و الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ جن کو دیکھ کر اہل علم وجد میں آتے ہیں۔ جس قدر لکھا گیا اس سے زیادہ مقدر ہی نہ تھا حضرت ہندوستان تشریف لے آئے یہاں آکر اچھی طرح قیام بھی نصیب نہ ہوا تھا مگر آئندہ تحریر فرمانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ سفر آخرت درپیش آگیا۔ آہ کیسے کیسے مضامین عالیہ اس گنجینۂ علوم کے ساتھ دفن ہو گئے۔ افسوس،

زمانۂ تحریر میں حضرت پر تجرد و تفرید کا وہ غلبہ ہوا اور تعلق مع اللہ کو اتنی ترقی ہوئی کہ تمام تعلقات ناگوار اور فضول محسوس ہونے لگے اور بارہا یہ خطرہ[۱] گزرتا تھا کہ اگر یہ رفقا بھی ہمراہ نہ ہوتے تو اور زیادہ یکسوئی و بے تعلقی نصیب ہوتی۔

مالٹا میں بعض جرمنی عیسائی پادری بھی مقید تھے ان کے پاس قرآن مجید کے بعض پارے جرمنی زبان میں ترجمہ شدہ موجود تھے جن کو وہ لوگ کبھی کبھی بہت غور سے مطالعہ کرتے تھے۔ حضرت فرماتے تھے کہ مالٹا میں ادائے فرائض مذہبی سے کسی کو ممانعت نہ تھی۔ یہاں تک کہ جرمنی پادری اسیر افسروں اور محافظوں سے درخواست کر کے شہر کے ہسپتال میں جاتے اور حسب عادت مریضوں کو اپنا وعظ و نصیحت سناتے۔ کیونکہ وہ لوگ اسی کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے اور ادائے فرائض سے کسی اسیر کو روکنا خلاف قانون تھا۔

---

[۱] یہ مضمون حضرت نے کسی قدر اخفا کے ساتھ ذرا دبا کر مالٹا سے واپس آنے کے وقت ریل میں مظفر نگر کے قریب بیان فرمایا تھا ۱۲

تصویر کشی اور حضرت کی ممانعت

ترکی اور شامی مسلمانوں نے کبھی حضرت کے فوٹو لینے کا ذکر کیا تو آپ نے اس کو بھی مثل تصویر کشی کے حرام فرما کر اجازت نہ دی لیکن ایک مرتبہ حضرت کو معلوم ہوا کہ جب آپ رفیقوں کے ہمراہ کسی کھلی جگہ میں بیٹھے تھے جرمنی لوگ ان سب حضرات کا فوٹو اتار کر لے گئے تاکہ اپنے ملک کے اخباروں میں اس کو شائع کر کے سلطنت برطانیہ سے نفرت وحقارت پیدا کریں کہ ایسے ایسے ضعیف اور مقدس اور بے لوث حضرات کو گرفتار کر کے وطن سے دور ڈال دیا ہے ۔ واقعہ چونکہ گذر چکا تھا اب حضرت اس کی نسبت کیا فرماتے ۔

اہل مالٹا اگرچہ بدبختی سے مذہب حق کو چھوڑ بیٹھے ہیں لیکن زبان بدستور عربی ہے جس کو حالت اسلام میں آباؤ اجداد بولا کرتے تھے اور اسی زبان کی برکت ہے کہ جا بجا انشاء اللہ تعالیٰ ۔ ماشاء اللہ اور واللہ بلیٰ واللہ کے خوبصورت جملے ان کے کلام کو مزین کر دیتے ہیں اور رحمدلی اور فزع من الموت کا اس قدر اثر ہے کہ جنازہ کو دیکھ کر بچے اور عورتیں تک گھروں سے باہر نکل کر تھوڑی دور مشایعت کر کے یا قبرستان پہنچا کر واپس آتے ہیں ۔

مالٹا میں انگور و انار وغیرہ بھی عمدہ ہوتے ہیں مگر تین چیزیں یہاں کی خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں ۔ کثرت اولاد ۔ بکریاں ۔ پتھر ۔

اولاد کی یہ کثرت ہے کہ ایک ایک شخص کے آٹھ آٹھ اور دس دس بچے ہونا معمولی بات ہے جس محلہ میں آپ نکل جائیں بچوں کا ایک متحرک لشکر نظر آئے گا

بکریاں نہایت قلیل اور بہت کم ہوتی ہیں مگر تھن اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ بھینس کو شرماتے ہیں ۔ پتھر کی کانیں ہر طرف موجود ہیں جس جگہ کھود دیتے پتھر نکلیں گے لیکن بالکل بودے اور ناپائیدار ۔

اسیری کے زمانہ میں ایک ایک ساعت برسوں کے برابر ہوتی ہے لیکن حضرت

نے پانچ سال کا زمانہ اپنے صبر و استقلال سے نظر بر قضا و قدر رکھ کر خود بھی سہولت سے گزار دیا اور ہمراہیوں کو بھی آپ کے فیض صحبت ، اخلاق حسنہ ، غایت شفقت کی وجہ سے گویا گراں ہی نہ گزرا ، بلکہ دیگر اسیرانِ مالٹا کو بھی اپنی اسیری مثمر برکات نظر آتی تھی ۔

جزیرہ مالٹا سے رہائی

مختلف اوقات میں قلعہ کے بہت سے اسیر حضرت سے پہلے ہی متفرق ہو گئے تھے بعض کو آزادی نصیب ہوئی ۔ چنانچہ اشرف بے وغیرہ آپ سے ڈیڑھ ماہ قبل رہا ہو گئے تھے اور بعض دوسری جگہ منتقل کر دیئے گئے ۔ اس جماعت کی صالحین کی رہائی کی خبریں بھی کئی مرتبہ مشہور ہوئی ۔ اور چند مرتبہ مالٹا سے روانگی کی خبریں ملیں لیکن سب بے نتیجہ رہی اور آخر میں تو ایک مرتبہ باضابطہ اطلاع آنے اور تاریخ مقرر ہو جانے پر اسباب سفر باندھ کر بالکل تیار ہو جانے کی بھی نوبت آئی لیکن پھر التوا ہو گیا ۔ بالآخر ماہ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ میں روانگی کی اطلاع پہنچی اور تاریخ مقرر ہو گئی باقی ماندہ اسیروں کا حال نہ پوچھئے ۔

یوسف علیہ السلام جب زندان سے رخصت ہوتے ہیں تو اہل سجن آہ و بکا کرتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اُن کو رخصت کر رہے تھے اور یوسف علیہ السلام ان کے لئے دُعا فرماتے تھے کہ اَللّٰھُمَّ عَطِّفْ عَلَیْھِمْ قُلُوْبَ الْاَخْیَارِ وَلَا تَعْمَ عَلَیْھِمُ الْاَخْبَارَ[1] ۔ اور جب نکلے ہیں تو دروازہ پر یہ لکھ آتے تھے کہ " ھذا بیت البلوی وقبر الاحیاء وشماتۃ الاعداء وتجربۃ الاصدقاء " (یعنی یہ امتحان کا مکان ہے اور زندوں کی قبر ہے اور دشمنی کی خوشی کی جگہ ہے ، اور دوستوں کا تجربہ ہونے کا موقع ہے) وہی منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کا سچا مصداق پانچ برس تک

---

[1] یا اللہ نیک بندوں کے دل ان پر مہربان رہیں اور دنیا کی خبریں ان سے پوشیدہ نہ رہیں (اسی دُعا کا اثر ہے کہ قید خانوں میں بلا تار اور اخبار کے تمام خبریں پہنچتی رہتی ہیں ۱۲

اصحابِ سجن کو دعوت الی الحق کرنے بعد زندان سے جدا ہوتا ہے۔
حضرت جیسے قابلِ رحم مقدس شخص کی آزادی اور پاکباز جماعت کی رہائی باعثِ مسرّت تھی لیکن ایسے شخص کامل کی مفارقت اور اپنی محرومی آٹھ آٹھ آنسو رلاتی تھی۔ کئی روز پہلے سے لوگ وصایا اور نصائح حاصل کرکے اور استدعاءِ دعا معروض کرکے رخصت ہو رہے تھے۔ خاص تشریف لے جانے کے دن تمام اسیر مسلمانوں کا ایک جلسہ شیخ الاسلام خیرالدین آفندی کی صدارت میں منعقد ہُوا۔ اور اس معزز افسر نے خطبۂ صدارت میں حضرت کے فضائل، آپ کی تکالیف اور بے قصور نظربندی پر افسوس، رہائی کی دُعا اور اپنی مفارقت و محرومی پر اظہارِ حسرت کیا۔ بعض لوگوں نے عربی اشعار پڑھے۔ آخر میں سب نے حضرت سے دُعا کے لئے عرض کیا۔ حضرت نے ہاتھ اُٹھائے۔ ہر طرف سے آمین کی آواز بلند ہوئی۔ پندرہ منٹ تک بالحاح و زاری خلوصِ قلب سے دُعا ہُوئی۔ بہت سے حاضرین پر رقت طاری تھی۔

اسکندریہ آمد

عین رخصت کے وقت قلعہ کے دروازے تک ہر صغیر و کبیر چشم گریاں و دل بریاں مصافحہ اور دست بوسی کے لئے حاضر ہُوا اور بکمال حسرت آخری دیدار کرکے حضرت کو رُخصت کیا۔ قلعہ سے سمندر کی گودی تک سواری پر تشریف لائے اور محافظوں کی حفاظت میں سوار ہو گئے۔ ان حضرات کو یہ معلوم نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں اور کس لئے۔ کیونکہ کوئی اطلاع نہ تھی۔ البتّہ غالب گمان آزادی کا تھا۔ حفاظت میں رفتہ رفتہ کمی اور تخفیف ہوتی جاتی تھی۔ جہاز اسکندریہ پہنچا اور جہاز سے اُتر کر اسکندریہ کے متصل قریۂ سیدی بشر میں بائیس روز مقیم رہے بائیس دن کے بعد وہاں سے براہِ ریل سویز پہنچے۔ یہاں شہر سے باہر کسی قدر دُور مقیم رہے۔ اسکندریہ اور سویز کی یہ اقامت نہایت تکلیف دہ تھی راحت کا مکان نہ تھا بلکہ خیمے استادہ تھے۔ ٹھہرنے کا تعین نہ تھا کہ کسی سامانِ راحت کا کچھ فکر کریں

چلنے کی خبریں تھیں لیکن فرداشے قیامت کی طرح وہ دن ہی نہ آتا تھا۔ کبھی جہاز کا پتہ نہ تھا۔ جہاز آیا تو اس میں جگہ نہ تھی۔ جگہ تھی تو ان اسیروں کو اس میں سوار کرنا خلاف مصالح تھا اور اس پر طرہ یہ کہ سرکاری مہمانداری بھی مالٹا ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ ان مقامات پر نہ کوئی وظیفہ تھا نہ خوراک اور ان حضرت کا ذاتی سرمایہ بھی جو محافظوں کے پاس تھا وہ مالٹا ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ یہاں کوئی یار نہ مددگار اور پھر ساتھ ہی استغنا اور حیا۔ ایسے وقت میں جس تکلیف سے ایام بسر ہو رہے ہوں گے آپ خود اندازہ کر لیں تفصیل کیا ہو سکتی ہے۔ بدرجہ مجبوری مولانا حسین احمد صاحب نے بذریعہ تار مکہ معظمہ میں اپنے معتبر دوستوں کے پاس جمع کی ہوئی امانت میں سے روپیہ طلب کیا۔

حالت سفر اور رمضان المبارک

اسی تکلیف کی حالت میں ڈیڑھ ماہ گزر گیا اور ۲۹ شعبان کو شہر سویز سے حضرت کی قیامگاہ پر رویت ہلال کی خبر پہنچی (خود ان حضرات نے چاند نہیں دیکھا تھا اور ہندوستان میں بھی اکثر جگہ ۲۹ شعبان کو رویت نہیں ہوئی تھی) بہت افسوس کہ ماہ مبارک اسی بے موقع قیام میں بے لطفی سے گذرے گا (فرماتے تھے کہ یہ تو کہیں وہم بھی نہ تھا کہ رمضان المبارک ہی میں خدا تعالیٰ وطن پہنچا دیں گے تراویح ادا کی گئی۔ روزے رکھنے شروع کئے۔ مکہ معظمہ سے ابھی روپیہ وصول بھی نہ ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ نے رحم فرمایا اور یہ اس ناگوار قیام کی (جو شب ہجر کی طرح تکلیف دہ اور طویل ہوتا جاتا تھا) خدا خدا کر کے سحر نمودار ہوئی یعنی بہت انتظار کے بعد ۵ ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو جہاز آیا۔ حضرت مولانا اور رفقا سرکاری طور فرسٹ کلاس کے نہایت مکلف کمروں میں سوار کئے گئے۔ اب حفاظت و حراست برائے نام رہ گئی تھی۔ اور جہاز میں کوئی خاص انتظام نظر بندی اور نگہداشت کا نہیں تھا۔ (حضرت فرماتے تھے کہ) اس جہاز میں بجائے پنکھوں کے دوسری قسم کے آلے لگے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ جہاز چونکہ نہایت سرد خطوں

میں بھی سفر کرتا ہے اس لئے حرارت پہنچانے کے آلے لگائے ہیں تاکہ مسافر شدّت برودت کی تکلیف سے محفوظ رہیں۔

جہاز میں یہ معزز مسافر روزے رکھتے رہے۔ عدن پہنچنے پر مولانا حسین احمد صاحب نے ہندوستان کے مختلف مقامات پر ۸ رجون تک بمبئی پہنچنے کے تار دیئے اور ضروری خطوط بھی لکھ کر روانہ کئے اور مولانا موصوف نے بایں خیال کہ شاید ہندوستان پہنچ کر موقع نہ ملے۔ بمبئی پہنچنے سے پہلے ہی تراویح میں کلام مجید باطمینان تمام کرلیا۔ اور ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ سہ شنبہ ۸ جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچ گئے۔

نظربندی اور مالٹا کے مختصر حالات احقر نے سب یکجائی طور پر جمع کر دیئے ہیں۔ زمانہ نظربندی میں ہندوستان میں جو واقعات پیش آئے اور رہائی کی تحریکات ہوئی وہ بالاجمال آئندہ مذکور ہوں گی۔

ہندوستان کی کیفیت

رہائی کی تحریکات تشریف آوری کے حالات

ہندوستان میں حضرت مولانا کی نظر بندی کی اطلاع پہنچنے کے ساتھ ہی قلوب میں تو بے چینی اور اضطراب پیدا ہوگیا تھا لیکن ابتدا میں چند وجوہ سے اس کا اظہار نہیں ہوسکا امید تھی کہ سرکاری تفتیش کے بعد حضرت مولانا بے جرم ثابت ہو کر جلد رہا ہو جائیں گے یہ بھی خیال تھا کہ معمولی تحریک و استدعا کے بعد اس میں کامیابی ہو جائے گی ادھر حضرت کے خطوط جو خادموں، دوستوں عزیزوں کے نام آتے تھے صبر و سکون کی تاکید سے لبریز اور تسلیم و رضا بالقضا کی تاکید سے معمور ہوتے تھے۔ پھر جوں جوں تاکید ہوتی گئی متوسلین کا اضطراب بڑھتا گیا اور باطنی تدبیر یعنی الحاح و زاری بجناب باری سے (جس کی طرف سے کبھی غافل ہی نہ تھے) آگے بڑھ کر ظاہری تدابیر کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔

مسلمانوں کی قومی جماعتوں (مدارس اور انجمنوں) کی طرف سے اور مخصوص و معزز افراد کی جانب سے مختلف مقامات اور اضلاع و امصار سے ہزارہا تار وزیر ہند کو لندن میں اور والسرائے صاحب کو ہندوستان میں بھیجے گئے جن میں بعض تمام نظر بندان اسلام کی رہائی کے متعلق تھے اور بعض خاص حضرت مولانا کے اظہار ناکردہ گناہی اور مطالبہ آزادی پر مشتمل تھے۔

آنریبل سید رضا علی صاحب نے صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی قانونی کونسل کے اجلاس میں حضرت مولانا کی نظر بندی کے متعلق سوال کیا اور یہ بعید عن القیاس جواب پایا کہ "مولانا محمود حسن صاحب اس وقت مالٹا میں ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے اسیران جنگ کے کیمپ میں رکھے گئے ہیں صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کو اطلاع پہنچی ہے کہ مولانا کی گرفتاری ہندوستان کے باہر عمل لائی گئی ہے کیونکہ تحریری اور دیگر

اقسام کی شہادتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ انہوں نے ہز مجسٹی ملک معظم کے دشمنوں کو ان کی فوجی تجاویز میں مدد دی ہے۔"

اردو اخبارات میں آٹھ دس مسلمان اخباروں نے اس زمانہ کی روش کے اندازہ پر مناسب آواز میں حضرت مولانا کا ذکر خیر اور ان کی براءت و بے قصوری بیان کرکے اپنے اپنے طرز میں گورنمنٹ سے حضرت کی آزادی کی استدعا کی یا اخباری طرز پہ آزادی کا مشورہ دیا۔

حضرت مولانا کی قوی الہمت و عالی حوصلہ اہلیہ صاحبہ نے ایک درخواست باقاعدہ مرتب کراکر گورنمنٹ میں بھیجی جس میں حضرت کی بے لوث زندگی، بے قصوری اور ضعیفی اور اپنے ممتد امراض کا اظہار کرکے رہائی کی استدعا کی، عرصہ تک اس کا کچھ جواب نہ آیا اور جب آیا تو خلاف مراد۔

منتظمین دارالعلوم دیوبند نے حسب استطاعت سعی و کوشش شروع کی اور ۵ ر نومبر ۱۹۱۷ء (مطابق محرم ۱۳۳۶ھ) کو معزز مدرسین و اہل مشورہ کا ایک وفد بمقام میرٹھ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ لارڈ جیمس مسٹن کی خدمت میں پیش کیا اور نہایت مہذب و شائستہ الفاظ کی تحریر پڑھی جس میں نرم لہجہ میں حضرت مولانا کی رہائی کی درخواست کی گئی تھی۔

اس وفد کے ساتھ لفٹنٹ گورنر صاحب نے نہایت ملاطفت و اخلاق سے معاملہ کیا اور اگرچہ ایک دوسری گورنمنٹ (یعنی شریف صاحب کی حکومت عربی) سے معاملہ کا تعلق ہونے کی وجہ سے کسی قدر دشواری اور دقت کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا کہ میں اس مجلس میں جو کچھ کہوں گا بالکل صحیح اور صاف کہوں گا، مجھ سے میرے خاص دوستوں نے اس بارہ میں کہا لیکن میں نے ان سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مولانا

---

[1] سلطنت برطانیہ اور شریف صاحب کے تعلقات اور حضرت مولانا کی گرفتاری کے واقعات معلوم ہو جانے کے بعد اس غدر کی جو کچھ حقیقت ہے وہ مخفی نہیں رہتی خصوصاً جبکہ آپ اس جواب کو بھی ملحوظ رکھیں جو سید رضا علی صاحب کو قانونی کونسل کے اجلاس میں دیا گیا تھا ۱۲۔

کی نظر بندی ہمارے یہاں اور ہمارے حکم سے نہیں ہوئی بلکہ شریف نے گرفتار کرکے ہمارے حوالہ کیا ہے وہاں کوئی بات ہوئی ہوگی"۔ لیکن اپنی طرف سے پوری سعی کرنے کا وعدہ کرکے امید افزا اور دل خوش کن جواب دیا۔

اس وعدے کے نتائج کا عرصہ دراز تک انتظار کیا گیا اور بعض تحریکات کا بھی حال معلوم ہوا اور یہ کہ بعض معتمدان سرکار نے حضرت مولانا سے مالٹا میں ملاقات کرکے بعض سوالات کئے مگر افسوس ہے کہ کلفت انتظار بڑھتی ہی رہی اور حصول مقصود کی کوئی علامت و نشان نظر نہ آیا۔

جس طرح طبیعت انسانی کا اقتضا ہے اسی مایوسی کے بعد عرصہ تک سکوت رہا بلکہ بہت سے قلوب میں مضمون یاس کا غلبہ ہوگیا اور حضرت کے وابستگان دامن عاطفت نے جو کچھ صدمہ اور رنج اس زمانہ میں برداشت کیا وہ قابل بیان نہیں۔

شیخ الہندؒ کے بعض خطوط

حضرت مولانا اور ان کے رفقا کے خطوط آتے تھے بعض بہت جلد پہنچ جاتے تھے اور بعض محکمۂ سنسری کی عنایت سے کئی کئی ماہ کے بعد، اسی طرح ہندوستان کے خطوط بھی حضرت کو کبھی آٹھ آٹھ ماہ کے بعد پہنچے ہیں جیسا کہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"مگر اتنی مدت میں پہنچا کہ سخت تعجب ہوتا ہے کہ اتنی تاخیر کا کیا باعث ہوا۔ تم نے ۲۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۷ھ کو روانہ کیا اور ہم کو ۲۴ صفر ۱۳۳۸ھ کو ملا۔ حمل کی مدت معتاد سے بھی بڑھ گیا۔ مگر الحمدللہ کہ وصول ہوگیا یہ بھی غنیمت ہے"۔

مکان کے خط میں لکھتے ہیں:-

"تمہارے پندرہ سولہ خط اکٹھے ہوکر مجھ کو صفر کے اخیر میں ملے شوال، ذی قعدہ، ذوالحجہ، ان چاروں مہینوں کے خطوط تھے"۔

مگر یہ دیکھ کر جگر خون ہوتا تھا کہ کسی خط میں بھی نہ تشریف آوری کے متعلق کوئی اشارہ ہوتا تھا نہ آزادی کی نسبت ایک حرف اور آزادی کے متعلق وُہ کیسے لکھتے اور کیا لکھتے کوئی خبر ہو تو لکھیں۔ کوئی بات ہو تو کہیں۔

ان خطوط میں کیا ہوتا تھا معمولی سلام و دعا۔ عزیزوں دوستوں کے صدمات وفات پر تعزیت وافسوس۔ عالم آخرت کی طرف ترغیب، دُنیا اور تکالیف ومصائب دُنیا کا سریع الزوال اور فانی ہونا، رضا و تسلیم کی تلقین، ایک تعزیت نامہ میں مستورات کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"دُنیا میں کوئی چیز یوں ہی نہیں ہو جاتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اس کا کرنے والا حق تعالےٰ ہے ہر کام میں اس کی حکمتیں اور رحمتیں ہیں جن کو وہی جانتا ہے۔ تمام دُنیا کو اس نے پیدا اور آباد کیا۔ پھر ایک دن سب کو فنا کر دے گا اور پھر سب کو نئے سرے سے پیدا کرے گا۔ اس کے ہر حکم کو حق سمجھنا چاہیئے۔ راحت ہو یا مصیبت ہمت کر کے سر پہ رکھ لینا چاہیئے اور اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔"

گھر میں اہلیہ صاحبہ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"خُدا کے سوا کوئی کچھ نہیں کر سکتا اسی پر نظر رکھو اور اسی سے دُعا کرو۔ دُنیا کے تمام قصّے بھلے اور بُرے ختم ہو جانے والے ہیں اس لئے زیادہ خیال کرنے کے لائق نہیں۔ صبر اور سکوت سے جس طرح ہو سکے اپنے دن گزارو اور اللہ کی رحمت سے متوقع اور اس کی ناراضی سے ڈرتے رہو۔"

دُوسرے خط میں فرماتے ہیں:۔

"دُنیا بہت گندی اور ناپائیدار ہے۔ اللہ کے سوا کسی سے امّید رکھنا بالکل غلط ہے جو احسان کرے اس کا احسان ماننا چاہیئے اور اللہ کا شکر کرنا چاہیئے کہ اس نے اپنے کسی بندہ سے ہم کو نفع پہنچایا۔

اور جو احسان نہ کرے اس کی شکایت ہرگز نہ چاہیئے ۔"
ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

" بات قابل فکر صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے اور کوئی امر قابل فکر و اندیشہ نہیں ۔ آدمی کی سعادت اور خوش قسمتی بس یہی ہے کہ اپنے اللہ رحیم و کریم کو کسی حال میں نہ بھولے اور جہاں تک ہو سکے اس کے حکم کو مانے باقی کوئی چیز چنداں اعتبار کے قابل نہیں حسبنا اللہ ونعم الوکیل ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم ۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

" حق سبحانہٗ جو تکلیف ڈالتا ہے اس کے سامنے قری محصّنہ اور بروج مشیدہ نسیج عنکبوت سے زیادہ کام نہیں دیتے اور راحت دیتا ہے اس کے آگے غربت و بیکسی و درماندگی و بے دست و پائی سب ہباءً منثوراً بن جاتی ہیں ۔

گر انست توقیع احسانِ اوست ور انبست منشور احسان اوست

۱۲ رجب ۱۳۲۷ھ کو تحریر فرماتے ہیں :۔

" کچھ تحریکات جو پہلے سے شروع تھیں اب ان کا کچھ ظہور ہو رہا ہے مگر بہت آہستگی سے ۔ بہرحال سلسلہ شروع ہے حق تعالیٰ کو جو منظور ہے لابد ایک روز پورا ہی ہو جاوے گا ۔"

ایک خانگی خط میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

بندہ کی سعادت مندی اس میں ہے کہ مالک حقیقی کے حکم کو گو وہ نفس پر کتنا ہی شاق ہو بصبر و رضا سر پر رکھ لے اور اس کی رحمت پر بھروسہ رکھے ۔ پریشان نہ ہو ۔ اس کی قدرت و رحمت میں سب کچھ ہے اس کی قدرت کے سامنے کوئی چیز لاعلاج نہیں تکلیف کو راحت ، راحت کو تکلیف کر دینا اس کو ہرگز دشوار نہیں ۔"

وہی مولانا دیوبندی جن کو مخالفین ایصال ثواب کا منکر کہا کرتے ہیں قید میں بیٹھے ہوئے گھر میں اہلیہ صاحبہ کو تاکید کرتے ہیں:۔

"اپنے آگے چلی جانے والی لڑکی کو ثواب رسانی سے مت بھولیو۔ قلیل کثیر جو ممکن ہو وقتاً فوقتاً اس کو ثواب میں یاد رکھو۔"

مصیبت ہو یا نعمت، رنج ہو یا راحت زمانہ کا قدم کبھی ٹھہرتا ہی نہیں۔ تکالیف کی گھڑیاں اور گھنٹے، مہینوں اور برسوں سے زیادہ دشوار معلوم ہوتے ہیں مگر آخر گذر ہی جاتے ہیں اور ایسے ہی معدوم و محو ہو جاتے ہیں جیسے راحت و مسرت کے ایام۔ اس حالت میں بھی دو سال سے زیادہ گذر گئے اور یہ آخری زمانہ کچھ ایسی خاموشی کا تھا، کہ نہ کسی اخبار میں حضرت کا ذکر ہوتا تھا نہ کسی جلسے میں۔

رہائی کا حکم

آخر حالات بدلے۔ تمام نظر بندوں کی آزادی کے متعلق ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ (دسمبر ۱۹۱۹ء) میں اعلان شاہی صادر ہوا۔ ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ اب سیدالقوم کے مصداق خادمانِ قوم رہا ہوں گے اور استحقاق آزادی اور اپنی عظمت و جلالت شان کے لحاظ سے ہمارے مذہبی مقتدا شیخ الہند کا نام نامی اوّل نمبر پر ہوگا۔

مگر وائے ناکامی کہ چھوٹے اور بڑے مشہور و غیر مشہور ہندو اور مسلمان ہر قسم کے نظر بندوں کو آزادی نصیب ہوئی مگر ہمارے زاہد گوشہ نشین کا کہیں نام ہی نہ آیا۔

اہل اسلام میں عموماً اور حضرت مولانا کے خدام و منوسلین و عزیز و اقارب میں خصوصاً اس زمانہ میں جس قدر اضطراب و تردد امید و انتظار کی حالت رہی اس کا اندازہ مشکل ہے اردو اخبارات میں کوئی صورت مقصود نہیں نظر آتی تھی تو انگریزی منگائے جاتے تھے ان سے بھی کار برآری نہیں ہوتی تھی تو مناسب مقامات پر تار دیئے جاتے تھے مگر سب بے سود۔

دیوبند پر ہی منحصر نہیں تمام ہندوستان میں جس کسی جگہ بھی مولانا کے تلامذہ معتقدین و مخلصین اور احباب موجود تھے۔ نہایت بے قلق و اضطراب کی حالت میں تھے منتظمان دارالعلوم کے پاس ہر جگہ سے روزانہ خطوط اور تار آتے تھے۔ دارالعلوم کے مدرسین و متعلقین سے ان کے شناسا لوگ استفسار کرتے تھے کہ مولانا رہا ہو گئے یا نہیں کہاں ہیں کب آئیں گے" جب خلاف امید اور غیر تسلی بخش جواب پہنچتے تھے تو لوگوں کی پریشانی میں اور اضافہ ہوتا تھا۔

ان ایام میں حضرت کی رہائی کے متعلق بہت سی افواہیں اور بے اصل خبریں مشہور ہو کر مسلمانوں کے لئے اور زیادہ تکلیف و دقت کا باعث ہوئیں۔ ایک تار میں کسی جگہ یہ خبر دی گئی کہ "مولانا ابوالکلام آزاد ہو گئے"۔ غلطی یا غلبۂ امید سے یہ پڑھا گیا کہ "مولانا، اور ابوالکلام آزاد ہو گئے"۔ اسی اعتماد پر دہلی سے دیوبند اور دیوبند سے جا بجا خطوط اور تار روانہ ہو گئے۔ اور دیندار طبقۂ اسلام میں ایک بے موقع اور قبل از وقت مسرت کا جوش پھیل گیا۔ جس کے بعد ناامیدی سے بہت ہی کلفت ہوئی اور کبھی بعض لوگوں نے کسی مصلحت یا غلطی سے آزادی کی خلاف واقع اطلاعیں دے کر چشم براہ لوگوں کو انتظار کی تکلیف میں مبتلا کیا۔

اعلان شاہی اور اس پر عمل درآمد دیکھ کر اور پھر اسی قسم کی خبریں سن کر اس زمانہ میں بار بار یہ امید بندھتی تھی کہ حضرت ضرور رہا ہو کر آ رہے ہوں گے اور بقدر تعلق ہر شخص شوق دیدار سے بے چین ہو رہا تھا۔ جس کا اظہار بعض حضرات نے اشعار اور نظموں کی صورت میں شروع کیا۔ سب سے پہلے مولانا سراج احمد صاحب معتمد المدیر القاسم والرشید نے ایک تیئیس اشعار کی نظم بہ عنوان "مژدۂ جانفزا" لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مالٹا سے اب نسیم جانفزا آنے کو ہے	دل میں جان آنے کو ہے علیلی ادا آنے کو ہے
وہ گئے تو زندگانی کا مزا جاتا رہا	اب وہ آتے ہیں تو جینے کا مزا آنے کو ہے
اب لبوں پر خیر مقدم مرحبا آنے کو ہے	قاسم خیرات کا وہ لاڈلا آنے کو ہے

بحرِ ہستی کا سفر آسان ہوگا بالیقین
کشتیٔ طوفان زدہ کا ناخدا آنے کو ہے

ہو مبارک تجھ کو اے دار الحدیث دیوبند
وہ ترا شیخ حدیث مصطفےٰ آنے کو ہے

پھر پھلے پھولیگا گلزار رشیدی قاسمی
سالکو گھبراؤ مت تم رہنما آنے کو ہے

استقامت کی تمہیں تصویر دکھلاؤں گا میں
نائب شرع شہ ہر دوسرا آنے کو ہے

صورت حسن توکل جس کے چہرے سے عیاں
وہ شہ اورنگ زیب اتقیا آنے کو ہے

عاشق شیدائے محمود اے شہ عبد الرحیم
آپ کا محبوب دیار با صفا آنے کو ہے

ہائے افسوس آج تم دنیائے فانی میں نہیں
جس کے تھے تم منتظر وہ دلربا آنے کو ہے

حضرت آئیں گے حسین احمد بھی لائیں گے ساتھ
شیخ آنے کو ہے ساتھ اس کے نیا آنے کو ہے

شیخ حسین احمد وحید احمد عزیز باوفا
دوستانِ باصفا کا قافلہ آنے کو ہے

پھر اسی طرز پر بہت سی نظمیں جابجا لکھی گئیں اور شائع ہوئی بعض مخلصین نے اسی بحر میں کسی قدر تغیر سے لکھا۔ قاری محمد طاہر صاحب خلف الرشید مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم مدظلہم نے قافیہ بدل کر "شوق دید" کے عنوان سے اکیس اشعار میں سوز دروں کا اظہار کیا۔ ان میں سے پانچ سات شعر لکھے جاتے ہیں ؎

انتظار دید میں کیا جانے کیا ہونے کو ہے
حسرتوں میں دل کی اب محشر بپا ہونے کو ہے

ولولے مٹے ہوئے امید پر پانی پھرا
زندگی آتش بنی اور دم ہوا ہونے کو ہے

مدرسہ میں ہونے والا ہے طلوع مہر علم
اس اندھیرے گھر میں اب پھر چاند نا ہونے کو ہے

ہے ثبات و استقامت جس کے قدموں پر فدا
ایک عالم اس کے قدموں پر فدا ہونے کو ہے

دل پریشاں ہے خدارا مجھکو بتلا دے کوئی
مالٹا سے کب روانہ قافلہ ہونے کو ہے

آپ کی صورت پہ صدقے آپ کے رخ پر فدا
اپنا اور بیگانہ چھوٹا اور بڑا ہونے کو ہے

حضرت محمود آئیں جلد وہ دن ہو خدا
اس پہ بس ختم دعا و مدعا ہونے کو ہے

اور ایک گمنام قائل صاحبزادہ ممدوح کے اشعار پر یہ اضافہ کر کے انگلی کٹا کر

شہید دل میں داخل ہو گیا ؎

آیئے تشریف لانا ہے تو جلد آجایئے
ورنہ حضرت اب تو اپنا خاتمہ ہونے کو ہے

راہ سنت میں قدم رکھا ہے جس نے پھونک پھونک
سجدہ گاہِ اولیا وہ نقشِ پا ہونے کو ہے

وہ بھی دن ہو یوں کہے ملا ہر کہ حضرت آگئے
روز کہتا ہے روانہ قافلہ ہونے کو ہے

مالٹا سے جلوہ گر ہونے کو ہے شمس العلوم
جس سے ہندوستان پہ نور و ضیا ہونے کو ہے

ہو چکی ظلمت نظر آئیگا اب آبِ حیات
اب مرا خضر طریقت رہنما ہونے کو ہے

آرہے ہیں دیکھ کر جن کو خدا آتا ہے یاد
دیکھنا ہر گھر میں اب ذکر خدا ہونے کو ہے

ابر رحمت آرہا ہے صورتِ محمود میں
وعدۂ لاتقنطوا بیشک وفا ہونے کو ہے

کہتے ہیں آئیں گے حضرت کلبۂ احزان میں
رشکِ قالین آج میرا بوریا ہونے کو ہے

آرہی ہے مرقد قاسم سے آمیں کی صدا
اُن کا بچّہ آج مشغول دعا ہونے کو ہے

ہاتھ اُٹھا کر صدق دل سے آپ سب آمیں کہیں
دوستو باب اجابت جلد وا ہونے کو ہے

بہر حال یہ زمانہ کسی قدر مسرّت آمیز انتظار میں گذر رہا تھا کہ تشریف آوری کی تاخیر اور گورنمنٹ کی خاموشی نے اس کو مبدل بہ کلفت کر دیا۔ خادمان دارالعلوم دیوبند کی طرف سے حضرات منتظمین نے اعلیٰ حکام کو استفسار حال کے لئے تار بھی دیئے مگر خاموشی کے سوا کچھ جواب نہ آیا۔ عجیب ضیق کا زمانہ تھا حال ہی نہ کھلتا تھا ؎

اضطرابم نہ گزارد کہ نشینم جائے
انتظارم نہ گزارد کہ زجا برخیزم

اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ حضرت یا اُن کے رفقاء کا کوئی خط بھی کسی کے پاس اس زمانہ میں نہ آیا جس سے اتنا تو معلوم ہوتا کہ ہیں کس جگہ؟

جب کوئی تدبیر اور صورت نظر نہ آئی تو حضرات مہتمان دارالعلوم دیوبند نے سب خدام دارالعلوم اور حضرت مولانا کے دوسرے مخلص و مخصوص حضرات سے مشورہ کر کے یہ طے فرمایا کہ معزز مسلمانوں کا ایک وفد جس میں متوسلین دارالعلوم کا

زیادہ حصہ ہو وائسرائے کی خدمت میں پیش ہو۔ قلبی اضطراب اور شوق کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جہاں تک ہو یہ مرحلہ جلد طے ہو جائے اور چونکہ ان ایام میں وائسرائے کا دہلی قیام تھا اور ان کی کونسل کے اجلاس وہیں ہو رہے تھے اس لئے سب کی یہی آرزو تھی کہ اس قدر جلد انتظام ہو جائے کہ شملہ اور منصوری کے دشوار سفر اور مصارف برداشت کرنے کی نوبت نہ آئے۔

لیکن ظاہر ہے کہ وفد لے جانا کچھ آسان اور محض اپنے اختیار میں نہ تھا نہایت سعی اور کوشش اور اجازت و انتظامات کی ضرورت تھی۔ انہیں امور کی مصروفیت میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا دہلی جا کر مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے ملنا ہوا تو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ وفد کے اہتمام سے پہلے وائسرے کی کونسل میں حضرت مولانا کے متعلق سوال ہو جائے تو نہایت مناسب ہے یہ بھی ممکن ہے کہ سوال ہی کچھ حصول مدعا کے لئے مؤید و مؤثر ورنہ کم از کم اس کے جواب سے حضرت کا کچھ حال تو معلوم ہوگا اور وفد کے مفید اور ضروری ہونے کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

اس رائے کی عمدگی میں سے کلام ہو سکتا تھا اور جو لوگ انتہائی کلفت برداشت کر رہے ہوں وہ کسی امکانی سعی و تدبیر میں کیسے پس و پیش کر سکتے تھے کونسل کے ایک معزز ممبر کو اس قسم کے سوال پر آمادہ کیا گیا اور خاص حضرت مولانا کی رہائی کے متعلق۔ انہوں نے یادداشت بھی لکھ لی مگر افسوس ہے کہ اس کے بعد ان کی رائے بدل گئی اور مخصوص سوال چھوڑ کر عام نظر بندوں کی رہائی کے متعلق سوال پیش کیا۔ اس خلاف توقع تغیر کا حال منتظر و امیدوار لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ سوال اور اس کا جواب اخبارات میں شائع ہو گیا۔

اس ناگوار تاخیر و ناکامی کے بعد بھی ہمت قاصر نہ ہوئی اور دہلی میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مولانا کفایت اللہ صاحب نے حکیم محمد اجمل خانصاحب سے ملاقات کر کے دوبارہ سوال کرانے کا سامان کیا اور الحمد للہ کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور ۱۲؍ مارچ ۱۹۲۰ء کے سوال پر کونسل میں یہ تسکین بخش جواب حاصل ہوا کہ "مولانا مالٹا سے

روانہ ہوکر ہندوستان کے راستے میں ہیں اور ان کی آزادی کا مسئلہ زیرِ غور ہے"۔
ایک ضیق وانتشار و بے صبری کی حالت میں یہ جواب بہت کچھ غنیمت معلوم ہوا۔ اور کسی نہ کسی وجہ میں اطمینان حاصل ہوکر وفد کا خیال بے سود معلوم ہونے لگا اگرچہ آزادی کے زیرِ غور نہ ہونے سے گونہ تشویش تھی۔ مگر اس میں شبہ نہ رہا تھا کہ مولانا جلد ہندوستان پہنچ جائیں گے۔ ہر روز یہ انتظار تھا کہ بمبئی میں چند اصحاب حضرت مولانا کے متوسلین کی تحریک پر اور بعض اپنے شوق سے خود ہی روزانہ جہازات کی آمد و رفت کی خبر رکھتے تھے اور یقین تھا کہ جب کوئی معمولی اطلاع بھی ملے گی وہ فوراً تار دیں گے پھر بھی بعض مرتبہ شدتِ اضطراب اور انتظار کی بے چینی میں ہندوستان سے ان کے پاس بغرض استفسار تار پہنچ جاتے تھے۔

دو چار روز نہیں ایک عرصہ گذر گیا۔ اور صدائے برنخاست۔ اب یہ انتظار پہلے انتظاروں سے زیادہ شدید اور تشویش ناک تھا کبھی خبر آئی تھی کہ عدن میں ہیں اور کبھی افواہ اڑتی تھی کہ ہندوستان واپس آنا پسند نہیں فرمایا مکہ معظمہ پہنچا دیئے گئے۔

حضرت مولانا کی نظر بندی کے ابتدائی زمانہ کی طرح یہ وقت سکوت اور خاموشی کا نہیں تھا۔ تمام ہندوستان اپنی بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔ خلافت کمیٹی کے جلسوں میں دوسرے ریزولیشنوں کے ساتھ حضرت مولانا کی رہائی کا مطالبہ بھی بلند آہنگی سے کیا جاتا تھا۔

کونسل کے سوال و جواب کے بعد جلد تشریف آوری کی امید نے خدام دارالعلوم دیوبند سے وفد کے جس خیال کو ملتوی یا ترک کرا دیا تھا اس تاخیر و تشویش نے پھر تازہ کر دیا۔ صرف اس قدر تردد تھا کہ جب مولانا تشریف ہی لا رہے ہیں تو اب یہ تحریک شاید بے سود یا مضرت رساں ہو۔

یوم احتجاج

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مددگار دارالعلوم دیوبند نے باوقات مختلفہ بار بار

خدام و متعلقین دارالعلوم اور حضرت مولانا سے تعلق و عقیدت رکھنے والے دوسرے مقامات
کے علماء و مشاہیر سے بطریق مراسلت اور زبانی مشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ وفد مرتب کرنے
سے پہلے چند مقامات میں رہائی کے مطالبات کے مخصوص جلسے بھی ضروری ہیں (گو اس
وقت تک اکثر مقامات میں دوسرے جلسوں کے ضمن میں اس کی بھی تحریک ہوتی رہی ہے)
اسی قرارداد کے مطابق حضرت مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی طرف سے
ایک اشتہار شائع ہوا جس میں تجویز شدہ وفد اور دیوبند کے جلسہ کی اطلاع دے کر دوسرے
مقامات کے اہل اسلام کو ۲۶ رجب ۱۳۳۸ھ (۱۶ اپریل ۱۹۲۰ء) یوم جمعہ کو اپنے
اپنے شہروں میں جلسے کرنے کی تحریک کی گئی تھی اور اشتہار کی اطلاع کے موجب
اسی تاریخ کو بعد نماز جمعہ دیوبند میں عام اہل اسلام کا ایک جلسہ ہوا جس میں دیوبند اور
اس کے متعلق دیہات کے مسلمان بہ تعداد کثیر شریک تھے۔ حضرت مہتمم صاحب مولانا
حبیب الرحمٰن صاحب مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریریں کیں جن میں مناسب حالات و
واقعات کے ذکر کے بعد پر زور الفاظ میں گورنمنٹ سے حضرت مولانا کی آزادی کا
مطالبہ کیا گیا اور پھر تمام حاضرین کے اتفاق سے وائسرائے کی خدمت میں اسی مضمون
کا تار بھیجا گیا۔ دیوبند کی تحریک پر اسی تاریخ میں سہارنپور۔ بجنور۔ مرادآباد اور دیگر مقامات
پر اسی قسم کے جلسے ہوئے اور وائسرائے کو تار بھیجے گئے۔

جلسوں کی تحریک اور وفد کی اطلاع کے ساتھ ہی ساتھ وفد کا انتظام بھی شروع
ہوا اور حاضری وفد کی باضابطہ درخواست اردو میں مرتب کی گئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن
صاحب خود اس کو لے کر میرٹھ تشریف لے گئے اور نہایت کامل ترجمہ انگریزی میں کرا کر
معززہ حضرات میرٹھ کی معیت میں کمشنر صاحب میرٹھ کی خدمت میں پیش کی اور
انہوں نے اس کو باضابطہ وائسرائے کی پاس سفارش کے ساتھ روانہ کر دیا۔

حضرت مولانا کی رہائی کے متعلق خادمانِ دارالعلوم کی یہ آخری کوشش تھی اس کے
بعد وہ کسی قدر اطمینان کے ساتھ جواب اور حاضریٔ وفد کی منظوری اور تعین تاریخ
کا انتظار کرنے لگے اس اثناء میں اگرچہ حضرت مولانا کے ارشد تلامذہ اور رفیق اسیری

مولانا حسین احمد صاحب مہاجر کے خطوط سویز سے ہندوستان آکر باعث تسلی ہو گئے تھے اور اس قدر معلوم ہو گیا تھا کہ مولانا مالٹا سے روانہ ہو کر سویز تک پہنچ گئے ہیں۔ اور اب کسی مناسب جہاز کا انتظار ہے کہ ہندوستان روانہ ہوں لیکن چونکہ آزادی و رہائی کا کچھ حال معلوم نہ تھا اور نہ خط لکھنے والے نظر بندوں کو اس کا کچھ علم تھا اس لئے وفد کو اب تک غیر ضروری نہیں سمجھا گیا تھا اور منظوری حاصل ہونے میں جس قدر تاخیر ہو رہی تھی وہ ناگوار گزرتی تھی۔ نہ حضرت مولانا کے ہندوستان پہنچنے کی کوئی اطلاع آئی تھی نہ وفد کی درخواست کا جواب۔

اسی انتظار میں رمضان المبارک شروع ہو گیا اور نہایت افسوس ہوا کہ سویز میں حضرت مولانا کا رمضان تکلیف سے گزرے گا اور یہاں حسرت و بیداریں متعلقین کی عید بے لطف رہے گی یہاں یہی خیال تھا مگر ہزاروں بیقرار مسلمانوں کی دعائے نیم شبی اور عرصۂ دراز کی آہ و زاری نے رحمتِ خداوندی کو متوجہ کر دیا اور ۳ ار رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو مولانا حسین احمد صاحب کا تار عدن سے پہنچا کہ "ہم لوگ ۸ رجون تک بمبئی پہنچ جائیں گے" ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آمد آخر ز پس پردۂ تقدیر پدید

یہ خبر کیا تھی ایک حیات تازہ تھی جس نے مسلمانوں کے مردہ قلوب کو زندہ کر دیا۔ خبر پہنچتے ہی صدہا تار ہزاروں خطوط ہندوستان کے اس گوشہ سے اس گوشہ تک پہنچ گئے اور مخصوص مقامات پر اسی روز اور دوسرے تیسرے روز تہ عام طور سے سب جگہ یہ بشارت پہنچ گئی۔

مایوسی آمیز انتظار اور بے چینی کی حالت میں اس خبر نے دینی مسرت کے جو جذبات پیدا کئے ان کے بیان سے قلم عاجز ہے اور زبان قاصر، ہر شخص چاہتا تھا، کہ تشریف آوری سے پہلے بمبئی پہنچ جاؤں۔ لیکن بعید سفر تھا اور رمضان المبارک کا مہینہ اور گرمی کی شدت۔ وسعت و ہمت و طاقت کی ضرورت تھی۔ بعض لوگ پہنچ سکے

اور اکثر معذور رہے اور حضرت مولانا کی خدمت میں ایک زیرک عالم کا یہ مقولہ بجا پر منقول ہوا کہ "حضرت بہت سے غیر حاضر مخلص حاضرین سے زیادہ مشتاق ہیں" حضرت مولانا خود فرماتے تھے کہ "مجھے تو خیال تھا کہ رمضان کا مہینہ ہے اکثر لوگ حافظ ہیں یا قرآن سننے والے سب اپنے کام میں لگ رہے ہوں گے اپنی دور کون آئے گا۔ مگر دیکھا تو اپنے پچیس تیس آدمیوں کی جماعت بمبئی میں موجود تھی"

مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بمبئی کو روانگی

مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا روحانی تعلق تمام عوارض و موانع پر غالب آگیا۔ باوجود قرب مرض اور بقائے ضعف و نقاہت انتہائی شدید گرمی اور روزہ کی حالت میں بمبئی کا ارادہ فرمایا اور راجپوتانہ کے خشک ریگستان اور پہاڑ قطع کرتے ہوئے ۔متھرا ناگرا ریلوے کی ویران لائن میں سفر کرکے مع اپنے دونوں صاحبزادوں اور دو مخصوص شاگردوں کے ۷ رجون کو ۱۰ بجے بمبئی جا پہنچے ۔

حضرت مولانا مدظلہم کے دونوں حقیقی بھائی مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور مولوی محمد محسن صاحب جن کو جدائی کا ایک ایک روز ایک سال گزر رہا تھا ان جوشِ محبت کب پیچھے رہنے دیتا تھا۔ یہ دونوں حضرات اور مولانا مدظلہم کے مثل فرزند عزیز داماد مولوی محمد ضیف صاحب سب سے پہلے بمبئی روانہ ہوئے اور انہیں کے ہمراہ حضرت مولانا کے نواسے مولوی محمد رفیع ۔

استقبال کرنے والوں کا ہجوم اور شیخ الہند کی ہندوستان واپسی

مراد آباد سے آخری زمانہ کے سیف اللہ قامع المبتدعین مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب اور حضرت مولانا کے چند مخلص اور امروہہ سے حضرت کے نہایت خاموش بے ریا خادم و شاگرد مولوی حافظ زاہد حسن صاحب براہِ راست بمبئی تشریف لے گئے اسی طرح دہلی سے محب العلماء والصلحاء حاجی احمد مرزا صاحب اور حضرت

مولانا کے ممتاز شاگرد مدرسہ امینیہ کے مدرس اوّل مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور جدید تعلیم یافتہ معزز لوگوں میں حضرت مدظلہم کے سب سے زیادہ شیدائی و خادم ڈاکٹر مختار احمد انصاری تاریخ مقررہ سے پہلے بمبئی پہنچ گئے۔ لکھنؤ سے مولانا محمد عبدالباری صاحب وقت پر پہنچ گئے اور مولانا شوکت علی صاحب و مسٹر گاندھی صاحب بھی جہاز سے اُترنے کے وقت استقبال کرنے والوں میں موجود تھے[1]

گورنمنٹ نے حضرت مدظلہم کا دوستانہ طور پر استقبال کرنے اور بعزت و احترام وطن پہنچانے کے لئے مولانا رحیم بخش صاحب پریذیڈنٹ کونسل بہاولپور کا بہترین انتخاب کیا تھا جو گورنمنٹ کی نظروں میں معتمد ہونے کے ساتھ ہی اپنی خداداد اہلیت و دینداری کی وجہ سے طبقۂ علماء و صلحاء میں بھی مقبول تھے۔ چنانچہ جناب موصوف بھی ۷۔ جون کو بمبئی پہنچ گئے تھے۔ تار کی خبر سے سب حضرات ۸ جون کو مولانا کا جہاز بمبئی پہنچنے کی اُمید کئے ہوئے تھے مگر پہنچنے کے ساتھ ہی یہ معلوم ہوا کہ آج صبح کو ایک جہاز مالٹا سے آکر ساحل سمندر سے دو میل کے فاصلہ پر کھڑا ہے۔ مولانا رحیم بخش صاحب کو چونکہ نائب الاستقبال ہونے کی حیثیت سے افسر جہاز سے دریافت کیا کہ حضرت مولانا اس میں تشریف رکھتے ہیں یا نہیں۔ بامُراد جواب سے دلشاد ہونے کے بعد مولوی صاحب ایک چھوٹے اسٹیمر میں ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا اس وقت ظہر کے لئے وضو فرما رہے تھے۔

حضرت رحمہم اللہ فرماتے تھے کہ "مولوی صاحب پر نظر پڑتے ہی یہ خیال و تردّد پیدا ہوا کہ مولوی صاحب پر چونکہ گورنمنٹ کو اعتماد ہے ادھر مولوی صاحب کو ہمارے حال پر عنایت۔ لہٰذا ممکن ہے کہ مولوی صاحب نے ہماری نسبت کوئی ذمہ داری منظور فرمائی ہو جس کی پابندی میں ہم کو کلفت ہو اور خلاف ورزی اور خلاف مروت ہو۔ مگر گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ الحمدللہ اس قسم کی کوئی ذرا سی بھی بات نہیں ہے اور محض

---

[1] احقر کو جن حضرات سے تعارف تھا اور حال معلوم تھا۔ ان کا نام بمبئی حاضر ہونے والوں میں لکھا ہے ورنہ بعض دیگر اطراف سے مولانا کے بہت سے شاگرد و خدام اور بعض علماء بھی بمبئی حاضر ہو گئے تھے ۱۲

دوستانہ طور پر استقبال وراحت رسانی کی فرمائش ہے۔

فی الحقیقت حضرت مولانا کے لئے یہ نہایت کلفت کا موقع ہوتا اور اپنی آزادی ان کو ہزار قیدوں سے گراں نظر آنے لگتی۔ کیونکہ ادھر آپ مداہنت سے ہزاروں مراحل بعید اپنے خیال کے پختہ اور کوہ وقار ہیں۔ اُدھر خلق مجسم، اپنے دوستوں، شناسا لوگوں، بلکہ اعاعز و خدام کے لئے بھی سراپا مروّت ہر شخص کی عزّت واعتماد کا تحفظ فرمانے والے تھے۔ عنایت خداوندی نے اس کلفت سے بھی محفوظ رکھا۔ سمندر کی تمام گودی مختلف ممالک کے جہازوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس لئے حضرت کا جہازہ کنارے سے دُور ٹھہرا ہوا تھا جہاں پہنچنے اور جانے آنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ اور کثرت باد باراں نے تو اس کو گویا محال ہی بنا دیا تھا۔ لہٰذا ۷جون کو مولانا جہازہی میں مقیم رہے چونکہ جہازوں سے اسباب اتارنے چڑھانے میں بڑی دیر لگتی ہے اس لئے گودی خالی ہونے اور مولانا کے جہازہ کو گودی پہ لانے کا انتظار کیا جاتا تو غالباً باوجود عجلت کے چوبیس گھنٹے اور صرف ہو جاتے۔ استقبال کرنے والوں کی مشتاق جماعت کو اتنا صبر کہاں تھا۔

جہاز سے بندرگاہ تک لانے کی تیّاریاں

۸ جون کو علی الصبح دیوبندی جماعت کے چند مخصوص حضرات ایک دخانی کشتی میں سوار ہو کر مولانا کو لینے کے لئے چلے۔ جہاز کے قریب پہنچ خُدا کی اور عناصر مخلوقہ کی قوت کا تماشہ نظر آیا۔ ہوا اس زور سے چل رہی تھی کہ کشتی کو جہاز کے قریب پہنچنے ہی نہ دیتی تھی۔ ذرا قریب پہنچی اور ہوا کا طمانچہ لگا کہ دُور جا پڑی دخانی قوّت بیکار تھی اور انسانی تدبیر بے سُود۔ عجب منظر تھا مولانا جہاز پر کھڑے ہوئے اپنے سچے دوستوں جاں نثاروں خادموں کو دیکھ رہے تھے سلام کا جواب دیتے اور اشارے سے اظہار کرتے تھے مگر نیچے نہیں آسکتے تھے۔ ادھر ہر ایک کا یہی دل چاہتا تھا کہ بے ساختہ قدموں پر جا گرے لیکن قدرت نہ تھی۔ دو گھنٹے یہی تماشا

رہا۔ جہاز کے چاروں طرف کشتی کو پھیر دیا کہ شاید کسی طرف ہوا کا زور کم ہو مگر وہاں ہر سمت ایک ہی عالم تھا بہزار کوشش کشتی ذرا قریب آتی تھی کہ فوراً ہوا دور پھینک دیتی تھی۔ آخر سب کے سب عاجز تھے ایک کار آمد شعر کا مضمون یاد آگیا ؎

اذا لم تستطع شیئاً فدعہ
وجاوزہ الیٰ ما تستطیع

اس تدبیر سے ہاتھ دھوئے اور ایک اور صورت تجویز کی۔ کسی معزز مسافر (غالباً پارسی) کو اُتارنے کی ضرورت سے ایک کشتی پہلے سے جہاز سے بندھی ہوئی تھی۔ ان لوگوں سے صورت حال کو ظاہر کیا انھوں نے ان سب کی وجاہت اور حضرت مولانا کی عظمت کے لحاظ سے بخوشی منظور کر لیا کہ مولانا اس میں اُتر کر کنارہ پر چلے جائیں۔

حضرت مدظلہم چونکہ بہت ضعیف ہو گئے تھے اور اس کشتی میں پہنچنا بھی خالی از دقت نہ تھا۔ اس لئے اپنے خاص خادم و رفیق مولانا حسین احمد صاحب کی اعانت سے بہ مشکل اس چھوٹی کشتی میں پہنچے اور اس نے لے جا کر چھوٹے اسٹیمر میں پہنچا دیا۔ جس میں خاص خاص حضرات مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مولانا حکیم محمد حسن صاحب[۲]۔ مولانا حافظ محمد محسن صاحب[۳]۔ حافظ محمد طاہر صاحب[۴]۔ مولانا محمد حنیف صاحب[۵]۔ مولانا محمد طیب صاحب[۶]۔ مولانا رحیم بخش صاحب وغیرہ آپ کو لینے کے لئے آئے تھے۔ پرجوش و مخلصانہ مصلفحے معانقے جوش گریہ فرط مسرت کا عالم دید تھا۔ الفاظ میں اس کے اظہار کی کوشش بے سود ہے

آمد اور شاندار استقبال

سب سے پہلے مولانا حافظ محمد احمد صاحب سے بہ چشم پُرنم معانقہ فرمایا پھر اپنے حقیقی بھائیوں سے، اسی طرح درجہ بدرجہ موقع بہ موقع سب سے سلام کے بعد مختصر

---

[۱] جب کوئی بات قابو میں ہی نہ آئے اسے چھوڑ دو۔ اور کوئی ایسی صورت اختیار کرو جو طاقت میں ہو۔

مزاج پرسی کرتے ہوئے اسٹیمر کنارے لگ گیا جہاں بمبئی کے امیر و غریب عوام و خواص ہزار ہا ہندو مسلمان اور معزز قومی لیڈر[1] استقبال کے لئے موجود تھے حضرت نے اللہ اکبر کے پر عظمت و مسرت نعروں کی آوازیں ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (۸ جون ۱۹۲۰ء) ایک بجے دن کے ساحل پر قدم رکھ کر سرزمین ہندوستان کو قدوم میمنت لزوم سے معزز فرمایا۔ بالکل آنکھوں سے نظر آتا تھا کہ ؎

اے تماشا دیکھنے والو خدا کی شان کا

بھیس میں درویش کے فرمانروا آیا ہے آج

بمبئی کے والنیٹروں نے اپنے مضبوط حلقے میں لے کر حضرت مولانا کو موٹر میں سوار کرایا اور حاجی احمد صدیق کھتری کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ باوجود کسی قدر بارش کے راستہ میں مخلوق کا بے شمار ہجوم تھا اور اللہ اکبر کی پرجوش متواتر آوازیں مسرت و شادمانی کا اظہار کر رہی تھیں۔

لیڈران قوم اور مسلمانان بمبئی کو تو یہی آرزو تھی کہ اعلیٰ پیمانے پر حضرت کا جلوس نکالا جائے لیکن چونکہ حضرت مزاج شناس اور طبیعت سے موافق لوگ بھی موجود تھے اس لئے حضرت مدظلہم کے خلاف طبع کرنا پسند نہیں کیا گیا۔ احمد صدیق صاحب کے مکان پر قیام فرمایا اور ہزار ہا لوگ وہاں آکر مصافحہ و زیارت سے مشرف ہوئے منارہ مسجد میں خلافت کمیٹی اور مسلمانان بمبئی کی طرف سے ایک نہایت مناسب مضمون کا ایڈریس مشتمل بر خیر مقدم وغیرہ دیا گیا۔ اور حضرت مولانا کی طرف سے بھی بہ تعمیل ارشاد خداوندی فحیوا باحسن منھا[2] بہترین جواب دیا گیا۔

بمبئی کے معزز لوگوں کی استدعا تھی کہ حضرت چند روز یہاں قیام فرماویں، تاکہ مشتاق لوگوں کو زیارت اور مہمانداری وضیافت کی عزت حاصل ہو لیکن رمضان المبارک

---

[1] مولانا عبدالباری صاحب، مولانا محمد علی صاحب۔ مولانا شوکت علی صاحب اور مسٹر گاندھی جی سیٹھ چھوٹانی صاحب احمد صدیق کھتری صاحب وغیرہ مشاہیر وغیر مشاہیر ۱۲۔

[2] حکم ہوتا ہے کہ جب کوئی تم کو سلام کرے تو اس سے بہتر طریق پر جواب دو (مستحب ہے) یا اسی قدر جواب دے دو (یہ واجب ہے) ۱۲

کا مہینہ اور آخری عشرہ تھا خود حضرت کو بھی اس قیام میں بے لطفی اور تمام ہمراہی علماء و صلحاء کی تکلیف کا اندیشہ تھا۔ علاوہ ازیں حضرت کی اہلیہ صاحبہ (مرحومہ) کی زیادہ بیماری کی خبر بھی پہنچ چکی تھی، اس لئے بھی اطمینان نہ تھا لہٰذا حضرت نے قیام منظور نہ فرمایا۔ اگلے ہی روز ۲۱ رمضان المبارک کو روانگی کا قصد کیا، لیکن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور حضرت مولانا کے ہم سبق اور مخلص دوست مولانا قاضی محی الدین صاحب مراد آبادی اسی روز بمبئی پہنچے۔ قاضی صاحب نے چونکہ نہایت ضعف اور مرض کی حالت میں محض قلبی تعلق کی وجہ سے صعوبت سفر برداشت کی تھی۔ حضرت مولانا کے اخلاق کو مروّت نے گوارا نہ کیا کہ قاضی صاحب بلا کسی راحت کے دوبارہ سفر میں مبتلا ہوں۔ اس لئے ایک روز قیام فرمایا اور ۲۲ رمضان (۱۰ جون پنجشنبہ) کو بعد مغرب ۸ بجے بمبئی سے مع اپنے تمام رفقاء اور استقبال کرنے والوں کے روانہ ہوئے۔

حضرت مولانا کی عظمت اور رفیع منزلت کو ملحوظ رکھ کر اور راحت کے خیال سے مولینا رحیم بخش صاحب نے تو آپ کے لئے سیکنڈ یا فرسٹ کلاس کا انتظام کرنا چاہا تھا مگر حضرت نے سادگیٔ طبع، تواضع منکسر المزاجی، نیز بعض ہمراہیوں کی رعایت سے درجہ سوم میں سوار ہونا پسند فرمایا اور ایک خالی گاڑی دیکھ کر تمام جماعت نے اسی میں بستر جما دیئے اور اسی اجتماع سے براحت سفر طے ہو گیا۔ اگرچہ سفر میں شریعت نے افطار کی اجازت دی ہے لیکن بلا ضرورت شدید ماہ مبارک کی فضیلت چھوڑنے کو طالبان اجر و ثواب پسند نہیں کیا کرتے۔ اسی لئے حضرت مدظلہم اور آپ کے اکثر رفقاء و ہمراہیان روزہ دار تھے اور دو چار حضرات حسب اجازت شرعی افطار کئے ہوئے تھے اور بالکل جیسا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سفر رمضان کے متعلق[۱] منا الصائم و منا المفطر فلا یعیب بعضنا علی بعض مروی ہے۔ اسی مقدس مجمع میں ایک

---

[۱] ہم میں سے بعض لوگ روزہ دار ہوتے تھے اور بعض افطار کرنے والے پھر کوئی شخص دوسرے پر طعنہ نہیں کرتا تھا ۱۲۔

دُوسرے پر طعن و تعریض نہیں کرتا تھا۔ ممبئی میں حضرت کا قیام امید سے بہت کم ہُوا۔ اس لئے اطراف ممبئی کے بعض مشتاقانِ زیارت جو ۲۲ رمضان کے بعد ممبئی پہنچے زیارت سے محروم رہ گئے۔

ممبئی سے دہلی روانگی

بہرحال ۲۳ ماہ مُبارک کی شب کو ممبئی سے روانہ ہوئے جن لوگوں کے دوستوں رشتہ داروں نے ممبئی سے بذریعہ تاران کو مطلع کر دیا تھا وہ جا بجا راستے میں اسٹیشنوں پر حاضر ہو کر اپنے ہمراہ بہت سے مسلمانوں کو لاکر زیارت و مصافحہ سے مشرف ہوتے رہے اور جن صاحبوں کو دیر میں اطلاع ہوئی وہ کفِ افسوس ملتے رہے۔

پہلی قرار داد اور ۹ رجون کو روانگی کے خیال کے مطابق جناب مہتمم صاحب دارالعلوم کا ۸ رجون کا تحریر فرمودہ خط ۱۱ رجون کو بروز جُمعہ دیوبند پہنچا کہ حضرت مولانا جمعہ کے روز دہلی پہنچ جائیں گے اور شنبہ کے روز دیوبند، اور اسی خبر کا جمعہ کی نماز کے بعد دیوبند کی جامع مسجد میں اعلان ہو گیا۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے خُدام متوسلین میں ایک اضطراب پھیل گیا۔ سبکدوانِ تیز گام تین بجے کی گاڑی سے دہلی روانہ ہو گئے اور ضعفاء گرانبار اپنی محرومی پر حسرت کرتے رہ گئے کہ دہلی کی حاضری بھی نصیب نہ ہوئی۔ لیکن اسی وقت ممبئی سے جناب مہتمم صاحب کا اطلاعی تار پہنچا کہ ۹ رجون کو نہیں ۱۰ رجون کو روانہ ہو کر بروز شنبہ ۱۲ رجون کو دہلی اور یکشنبہ کو دیوبند پہنچیں گے۔ اس خبر نے ضعیفوں کی کمر ہمّت بندھائی، ذرا جان میں جان آئی اور شب کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔ الحمدللہ کہ اس طرح حضرت مدّظلہم کے اکثر اقربا خدامِ دارالعلوم دیوبند کے وہ خدام و مدرسین جو ممبئی پہنچنے سے عاجز رہ گئے تھے، سب کے سب ۴ ۲ رمضان (۱۲ رجون) کی مُبارک و میمون صُبح کو دہلی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر نظر آنے لگے۔ اوران کے علاوہ مرادآباد، امروہہ، خورجہ، بجنور وغیرہ کے حضرات اور ساکنانِ دہلی عام و خاص فقیر و امیر، مدارس کے طلبہ، دفتروں کے ملازم، شائستہ لباس میں

جوق در جوق چلے آرہے تھے اور اسٹیشن کی رونق بڑھا رہے تھے اور راحت آمیز انتظار کو کچھ دیر نہ گزری تھی کہ جی۔ آئی۔ پی ریلوے نے اپنی تمام عمر بہترین کارنامہ دکھلایا اور آٹھ بجے سلطان القلوب کی گاڑی کو پلیٹ فارم پر پہنچایا۔

دہلی آمد

اس وقت کا جوش قابل نظارہ تھا بلا مبالغہ کسی کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا، ہر شخص بلا تحاشا اسی گاڑی کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ آخر ذرا وقفہ کے بعد اس مقدس ہستی نے اپنی پرانی وضع میں پلیٹ فارم پر متبرک قدم رکھا۔ نہایت سادہ کرتا پہنا زیب بدن تھا اور سر پہ ایک مختصر عمامہ بندھا ہوا تھا۔ عرصہ دراز کی صعوبات اور سفر کا تکان نورانی چہرہ پر نمایاں تھا اور حضرت مولانا نہایت ہی ضعیف نظر آتے تھے۔

گاڑی سے نیچے قدم رکھنا تھا کہ چار طرف سے اللہ اکبر کے مسرت خیز نعروں کی آواز نے اسلامی شان و ہیبت کا منظر دکھلا دیا۔ آدمیوں کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ اور بے قاعدہ انبوہ نے حضرت کو گھیر لیا، ایک دوسرے پہ گرا پڑتا تھا۔ کوئی مصافحہ کرتا تھا کوئی معانقہ کی آرزو رکھتا تھا۔ کوئی آپ کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتا تھا۔ غرض ہر ایک ممکن طریقہ سے مخلوق اظہار عقیدت کر رہی تھی اور حضرت مولانا بھی تا امکان خود مصافحہ اور مزاج پرسی اور کلمات تعارف سے دریغ نہ فرماتے تھے۔ اس کشاکش میں لوگوں کو سخت تکلیف ہونے کے علاوہ حضرت مولانا کو نہایت شدید جسمانی گزند پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے دہلی کے رضا کاروں نے ایک مضبوط حلقہ اپنے ہاتھوں کا بنا کر مولانا کو اس کے اندر لے لیا۔ اگرچہ سلام و مصافحہ کا بے پایاں سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ لیکن حضرت مولانا کسی قدر محفوظ ہو گئے۔ بہر حال نہایت دشواری کے ساتھ یہ مجمع اسٹیشن سے باہر ہوا۔ اس ابتری اور بے ضابطگی کی وجہ سے اکثر لوگ مصافحہ سے محروم رہ گئے اور بعض کو زیارت بھی نصیب نہیں ہوئی۔

باہر تشریف لانے کے بعد ڈاکٹر انصاری صاحب آپ کو موٹر پر سوار کر کے اپنی

کوٹھی پہ لے گئے جو شہر سے باہر نہایت بعید ہے مگر مشتاقانِ زیارت کسی نہ کسی طرح وہاں بھی پہنچے۔ بعض مستعار اور کرایہ کی سواریوں پہ اور بعض قدرتی بائیسکل پہ۔

حضرت مولانا کے رفقاء اسٹیشن پر اسباب کو بحفاظت روانہ کرنے کے لئے تھوڑی دیر ٹھہرے اور پھر ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر دریا گنج پہنچ گئے۔ باہر سے آنے والے لوگ اپنے تعارف کی جگہ مختلف مقامات پہ ٹھہر گئے اور تمام دن کوٹھی پہ لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں حضرت مولینا ایک وسیع مکان میں تشریف رکھتے تھے۔ اور لوگ حاضر ہو کر اطمینان کے ساتھ مصافحہ معانقہ مکالمہ سے مشرف ہوتے تھے اور حضرت مدظلہم قدیم تعلق کے مناسب ہر شخص سے اس سے مختصر حالات اہل و عیال کی خیریت اور اس کے اہل وطن اور دوستوں کی کیفیت دریافت فرماتے تھے۔

اسی مختصر قیام میں ایک مرتبہ قبل از دوپہر اور پھر شب کو حضرت مولانا اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد اور مقدس نمونۂ سلف یعنی مولانا عبد العلی صاحب مقیم مدرسہ عبد الرب کی ملاقات کو تشریف لے گئے جو بوجہ ضعف و معذوری خود تشریف نہیں لا سکتے تھے اور ظہر کے بعد مولوی امین الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ امینیہ کے مکان پر بہ تقریب تعزیت تشریف لے گئے اور واپسی میں ایک مشتاق دیدار مریض کی عبادت کو۔

رات کا اکثر حصہ بیداری میں بسر ہوا اور قبل نمازِ صبح دیوبند کی روانگی کا انتظام شروع ہوا۔ سب لوگ اپنی اپنی جائے قیام سے اسٹیشن پہنچ گئے صدہا اہل دہلی خوابِ شیریں کو چھوڑ کر حضرت شیخ الہند کی مشایعت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔

تشریف آوری کی بہ نسبت اس وقت اگرچہ حاضرین کی تعداد بہت کم تھی لیکن پھر بھی اس قدر ہجوم تھا کہ رخصت ہونے والوں کو بمشکل مصافحہ کا موقع ملتا تھا۔ یہاں بھی حضرت کے لئے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا گیا تھا مگر آپ نے ایک معمولی انٹر کلاس میں

اپنے خدام و دوستوں کے ساتھ سفر کرنے کو ترجیح دی ۔ پانچ بجے اللہ اکبر کی بلند آوازوں کے ساتھ دہلی سے گاڑی روانہ ہوئی ۔ بہت سے لوگ قریب کے اسٹیشنوں کے ٹکٹ خرید کر سوار ہوگئے ۔ بعض نے دیوبند تک ہمراہ رہنے کو غنیمت سمجھا ۔

درمیانی اسٹیشنوں پر بعض جگہ صدہا اور بعض جگہ ہزارہا بندگانِ خدا مشتاق دید کھڑے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا مصافحہ کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ حضرت مولانا کو بھی ان لوگوں کی تکلیف کا خیال اور آرزو کا لحاظ کرکے جب تک گاڑی کی رفتار تیز نہ ہو جاتی تھی ہاتھ نہ کھینچتے تھے ۔

بعض حضرات کی سفارش سے حضرت مولانا سے نیم رضا حاصل کرکے مولوی مظہر الاسلام صاحب نے نہایت اچھے لہجے میں اپنا قصیدہ پڑھ کر سامعین کو محظوظ کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

دھوم ہے محبوبِ محبوبِ خدا آیا ہے آج	وارثِ کل انبیاء و اولیا آیا ہے آج
جس قدر جاتا رہا اس سے سوا آیا ہے آج	کُل شہیدانِ وطن کا خوں بہا آیا ہے آج
لائے ہیں تشریف مولانا مبارک دیوبند	خوش ہو اے کنعاں کہ پھر یوسف ترا آیا ہے آج
وہ محدثِ دو جہاں استاد محمود الحسن	یعنی شیخ الہند اسیرِ مالٹا آیا ہے آج
اے تماشا دیکھنے والو خدا کی شان کا	بھیس میں درویش کے فرمانروا آیا ہے آج

کل تلک جو غیر ممکن تھا وہ ممکن ہو گیا
بیٹھ کر کشتی میں دریا علم کا آیا ہے آج

محل و موقع کا مناسب، خود مصنف کا بیان، لہجہ دلکش، ممدوح کی موجودگی، سامعین متاثر ہو رہے تھے ہر طرف سے داد مل رہی تھی ۔ سب کو سن کر اخیر میں حضرت نے فرمایا کہ ہاں صاحب یہ تو مشہور ہی ہے کہ شعر جتنا خلاف واقعہ ہو اچھا ہوتا ہے (منقولہ اشعرھم اکذبھم کی طرف اشارہ ہے اور ضمناً مضامین مدحیہ کی تردید ہے)

میرٹھ میں استقبال

مسلمانانِ میرٹھ نے اسٹیشن پر ایک سپاسنامہ پیش کیا ایک شخص نے گاڑی کے

اندر کھڑے ہوکر حضرت مولانا کے سامنے پڑھا اور اسی وقت مطبوعہ کاپیاں تقسیم ہوئیں۔ اس میں مولانا کی آزادی پر خدائے بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور حضرت کی جدائی میں اہل اسلام کے اضطراب و بیقراری اور ان کی سعی کا اظہار تھا اور گورنمنٹ کی بے انصافی کا شکوہ۔ حضرت کی صداقت و راستبازی، عزم و استقلال و للہیت کی توصیف کی توصیف کی گئی تھی۔ اور آپ کی تکالیف پر اظہار ہمدردی اور موجودہ زمانہ کے اسلامی حوادث و مصائب اور مسئلہ خلافت میں دشمنوں کے ارادوں کی صراحت اور احکام مذہبی کی رہنمائی میں حضرت مولانا سے استعانت کی گئی تھی۔

حضرت مولانا کی طرف سے آپ کے معزز و عزیز رفیق مولانا حسین احمد صاحب نے گاڑی کے دروازہ پر کھڑے ہوکر پلیٹ فارم کے موجودہ مسلمانوں کی طرف خطاب کرکے لکھا ہوا جواب پُر رعب لہجہ میں سنایا جس میں خدا تعالیٰ کا شکر، اہل اسلام کی ہمدردی کا شکریہ۔ مصائب و تکالیف کا منجانب اللہ ہونا اور گذشتہ مصائب کا ذکر غیر مفید ہونا۔ اہل اسلام کی تکالیف و مصائب کی واقعیت اور اپنی طرف سے اظہار حق اور عندالضرورت تعلیم و رہنمائی کی مستعدی وغیرہ بیان کی گئی تھی۔

جیسا پہلے بیان ہوچکا ہے ہر ایک چھوٹے بڑے اسٹیشن پر مسلمانوں کا ہجوم رہتا تھا اور بہت سے ہندو بھی درشن کرنے کے شوق میں چلے آتے تھے۔ مظفر نگر کے اسٹیشن پر اطراف و جوانب و دیہات کے لوگ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس لئے آپ کو ایک بلند چوکی پر کھڑا کردیا گیا۔ تاکہ سب زیارت کرسکیں۔ قریب کے ہزارہا لوگوں نے مصافحہ بھی کیا اور اس کوشش میں کئی آدمیوں کے خفیف چوٹ بھی لگ گئی۔

مظفر نگر کے بعد روہانہ کا بہت چھوٹا اسٹیشن آیا۔ یہ بھی مجمع سے خالی نہ تھا۔ یہ مقام دیوبند سے صرف آٹھ میل ہے اور درمیان میں کوئی اسٹیشن حائل نہیں اس کے گذرنے کے بعد حدود دیوبند شروع ہوجاتی ہیں۔ یہاں سے گاڑی چلی اور حضرت مولانا پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ دیوبند کی سرزمین پیش نظر تھی۔ اس کے متعلق سرسبز

کھیت آم وغیرہ کے باغ سامنے تھے۔ مولانا کی حقیقت شناس نظر اُدھر سے اُٹھتی نہ تھی اور دل میں کرشمۂ قدرت خُداوندی کا مضمون موجزن تھا کہ "کس طرح اپنے ایک ضعیف بندے کو ہزاروں میل کا سفر کرا کے کیسے کیسے بعید و عجیب ملک و شہر، کتنے کتنے دریا و سمندر دکھلا کر کیسی مضبوط و مستحکم نظر بندیوں سے چھڑا کر آج پھر اپنی اُسی پُرانی سرزمین میں واپس لایا ہے"۔ یہ پُرعظمت مضمون جس کے ادا کرنے کے لئے الفاظ میسر نہیں ہیں حضرت کی صُورت، شکل، طرز، ادا، نظر، سے بالکل ٹپکا پڑتا تھا اور ہدایت کے درجہ کو پہنچ گیا تھا لیکن خاکسار نے اپنی طالب علمانہ طبیعت کے انداز پر دو تین لفظ کہہ کر حضرت سے اس کی تصیح کرالی۔ والحمد للہ علی ذالک

دیوبند آمد

بالآخر نو بجے دیوبند کا اسٹیشن آگیا اور اسیر مالٹا پانچ برس کے بعد اپنے وطن پہنچے اسٹیشن کے چار طرف خلقت کا ہجوم تھا اور اسٹیشن کے اندر تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی گاڑی سے اُترنے نہیں پائے تھے کہ اللہ اکبر کے نعروں سے فضائے آسمانی گونج گئی۔ اور اس شمع ہدایت پر مخلوق خداوندی پروانوں کی طرح بے تحاشا گرنے لگی۔ وہی اظہارِ عقیدت اور وہی حالت جو دہلی اسٹیشن پر گزر چکی تھی یہاں بھی پیش آئی اور چند قوی الہمّت مخلص خدام نے حضرت کو حلقہ میں بلکہ گود میں لے کر بہ مشکل تمام گھوڑا گاڑی پر پہنچایا۔ پہلے یہ تجویز ہوئی تھی کہ ایک مخصوص سواری تام جھام میں حضرت سوار کئے جائیں اور خدام اس کو ہاتھوں ہاتھ اُٹھا کر لے چلیں لیکن حضرت مولانا نے اپنی طبعی تواضع سے نہایت سختی سے انکار فرمایا اور گاڑی میں سے گھوڑے کھول کر آدمیوں کو کھینچنے کی بھی اجازت نہ فرمائی۔

سب سے پہلے دارالعلوم تشریف آوری

حضرت مولانا کو دیوبند میں سب سے زیادہ عزیز اپنے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کی

یادگار اور احادیث و علوم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا سرچشمہ تھا یعنی دارالعلوم دیوبند جس طرح بوقت رخصت سب سے آخر میں مدرسہ کو رخصت کر کے تشریف لے گئے تھے اسی طرح سب سے پہلے اسٹیشن سے براہِ راست دارالعلوم کو اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرمایا۔ اور دارالحدیث کے سب سے بڑے (زیر تعمیر) کمرے میں تشریف فرما ہوئے تمام مجمع کے ساتھ مل کر دعا فرمائی۔ جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ مصافحہ اور زیارت سے مشرف ہوئے۔

تقریباً گیارہ بجے مولانا اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ جہاں پس پردہ صدہا مستورات اسلام مبارکباد کے لئے حاضر تھیں اور اہلیہ صاحبہ (جو بہت علیل تھیں) اور صاحبزادیوں اور دیگر اہل خاندان کو دیدار سے مشرف فرمایا، اور تسلی و تشفی دی۔ مردانہ مکان لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور جدید حاضرین آکر مجمع کو بڑھا رہے تھے اور مصافحے و معانقے کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا اس لئے حضرت کے بھائی صاحب حکیم محمد حسن صاحب نے آپ کو علیحدہ لے جاکر تہ خانے میں آرام کرنے کے لئے لٹا دیا اور مجمع منتشر ہو گیا۔

جو لوگ مختلف مقامات سے آکر زیارت و ملاقات کے لئے دہلی میں جمع ہو گئے تھے ان میں سے صدہا حضرت مولانا کے ہمراہ دیوبند چلے آئے تھے اور درمیانی اسٹیشنوں سے بہت مشتاقان دیدار ساتھ ہو گئے تھے۔ اس لئے دیوبند میں ایک معقول تعداد علماء و صلحا و دیندار طبقہ کی جمع ہو گئی تھی اور دیوبند پہنچ جانے کی اطلاع مل جانے کے بعد تو ہر روز ٹرین میں کثرت سے مہمان آگئے تھے کہ ایک عظیم الشان اسلامی جلسہ کی صورت نظر آنے لگی تھی۔ اوّل تو کسی کا جانے کو دل ہی نہ چاہتا تھا اور اگر اپنی ضرورت و مصلحت سے مجبور ہو کر دس مہمان کسی گاڑی سے رخصت ہوتے تھے تو بیس ان کی جگہ آجاتے تھے۔

حضرت مولانا کا توکل اور اعتماد علی اللہ ان سب کی مہمانداری کے لئے کافی تھا۔ لیکن ظاہری طور سے ایسے کثیر مجمع کے انتظام و اہتمام میں جو کچھ دشواری ہوتی ہے وہ

مخفی نہیں لہٰذا اس کو پہلے ہی ملحوظ رکھ کر حضرت کی تشریف آوری سے قبل جناب مہتمم صاحب دارالعلوم نے بمشورہ دیگر خدام و مخلصین یہ انتظام کر کے ایک طویل فہرست مرتب کر لی تھی کہ حسب حیثیت ہر شخص ایک یا دو وقت تمام مہمانوں کی ضیافت کے مصارف کا متکفل ہو اور انتظام اس کا مدرسہ کے مطبخ میں کر دیا جائے۔

اسی تجویز کے موافق سب سے پہلی اور بڑی دعوت بعد مغرب و بوقت سحر اس فرد فرید اور فخر زمانہ شاگرد رشید کے تمام مہمانوں کی حضرت مرشد و استاذ قاسم العلوم و الخیرات رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہوئی یعنی مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم نے اس کا اہتمام و تکفل فرمایا اور اس کے بعد بھی جناب موصوف نے چند مرتبہ حسب موقع نہایت سیر چشمی سے تمام مہمانوں اور بہت سے اہل شہر کی دعوت کی۔

اس کے بعد مدرسین و متعلقین دارالعلوم او حضرت مولانا کے مخلصین و تلامذہ اور بعض اعزہ و متوسلین کی طرف سے نوبت بہ نوبت ہر دو وقت دعوت ہوتی رہی۔ حضرت مولانا اگرچہ بالطبع اپنے متوسلین و مخلصین کی تکلیف کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان کے اخلاص و محبت اور دلی شوق کی رعایت سے اس انتظام کو قبول فرما لیا تھا اور نہایت بشاشت و فرحت سے خود بھی شریک ہوتے تھے اور آپ کے اکثر اقارب اور اعزا بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ کھانا اکثر مدرسہ کے مطبخ میں تیار ہوتا تھا، اور دارالعلوم کے طلبہ اور بعض اہل شہر اپنی سعادت سمجھ کر اسی خدمت میں لگے رہتے تھے اس لیے مہمانداری و ضیافت کا ایک مستقل محکمہ ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات دارالعلوم اور دارالحدیث کے جدید التعمیر اور وسیع کمروں میں مہمانوں کی بڑی بڑی جماعتوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا اور کبھی اگر مہمانوں کی تعداد ذرا کم ہوتی تھی تو حضرت کے مکان ہی پر کھانا پہنچا کر اہتمام و انتظام سے کھلا دیا جاتا تھا بعض مخلصین معمولی سادہ کھانے کا انتظام کر سکتے تھے اور بعض اصحاب وسعت مکلف کھانا تیار کراتے تھے یہ انتظام و اہتمام بدستور رہا یہاں تک کہ حضرت مولانا نے سفر کا قصد فرمایا اور بہت سے لوگ اس سعادت اور مہمانوں کی خدمت سے محروم رہ گئے۔

اگرچہ شدید گرمی کے روزہ کی تکالیف بھی مشتاقانِ دیدار کے لئے سفر سے مانع نہ تھی اور رمضان المبارک میں بھی مہمانوں کی آمد کچھ کم نہ تھی لیکن ماہ صیام کی قیود، قرآن مجید تراویح کی پابندی بہت سے دیندار لوگوں کو حاضری سے روک دیتی تھی اس لئے ماہ مبارک کے بعد مہمانوں کی آمد و رفت بہت زیادہ ہوگئی تھی اور رجب تک حضرت کے سفر (بجانب لکھنؤ و فتحپور ہسوہ) کا بخوبی اعلان نہیں ہوگیا، یہ کثرت بدستور رہی۔

بلا تمیز امیر و غریب رئیس و فقیر جن مہمانوں کی حضرت کے مکان پر وسعت ہوتی تھی وہ وہاں قیام کرتے تھے اور باقی دارالعلوم کی درسگاہوں کے وسیع کمروں میں۔ رسمی رضاکاری اور والنیٹری کا اس وقت انتظام نہ تھا لیکن حضرت مولانا کے خدام اور دارالعلوم کے طالب علم اس محنت و محبت سے مہمانوں کی خدمت کرتے تھے اور حتی الوسع راحت رسانی میں سعی کرتے تھے کہ باوجود کثرت کے انہیں کسی قسم کی تکلیف و شکایت نہیں ہوتی تھی چونکہ دارالعلوم میں تعطیل کا زمانہ تھا اس لئے طلبہ کو اور بھی زیادہ وقت مہمانوں کی خدمت میں صرف کرنے کا موقع ملتا تھا۔

دیوبند میں آپ کی مصروفیات

حضرت مولانا بہ تعمیل ارشاد سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ لِضَیْفِکَ عَلَیْکَ حَقًّا[1] مہمانوں کی ملاقات اور مدارات کو عبادت سمجھ کر ہر وقت اس کے لئے تیار رہتے تھے یہاں تک کہ آرام و راحت اور نوافل و وظائف کے لئے بھی گویا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ ہر وقت مجمع رہتا تھا اور مکان بھرا رہتا تھا صبح کی نماز کے بعد ایک ذرا وقفہ کرکے حضرت مجمع میں بیٹھ جاتے اور طرح اکثر اوقات بیٹھے رہتے حاضرین میں سے کبھی کسی اہل علم کے چھیڑنے پر مضامین علمیہ کی طرف پورے متوجہ ہو جاتے اور کبھی حسب موقع سفر کے واقعات مالٹا کے حالات، نہایت بشاشت و انشراح سے بیان فرماتے اور دوسرے

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو بہت سے حقوق کی تعلیم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے۔ ۱۲

اوقات میں جدید مہمانوں کے سامنے وہی واقعات کبھی مکرر نقل فرماتے کبھی مخصوص شاگردوں کے عرض کرنے پر اور کبھی کسی اہل علم کی تشریف آوری پر اپنے ترجمۂ قرآن مجید کا مقدمہ خود زبان مبارک سے نہایت دلچسپی سے پڑھ کر سناتے اور مناسب مواقع پر مختصر تقریر کر کے سمجھاتے اور جا بجا کسر نفسی اور تواضع کے کلمات فرماتے رہتے اور داد کے منتظر نہیں بلکہ معمولی شاگردوں سے بھی اصلاح کے متوقع رہتے۔ استاد رحمۃ اللہ علیہ[1] کا ذکر آجاتا تو محو ہو جاتے۔ نام پیچھے زبان سے نکلتا تھا پہلے آنسو بھر آتے۔ گھنٹوں یہی ذکر رہتا۔ آپ کے حالات، واقعات، علمی تحقیقات نقل فرماتے رہتے اور جب تک نماز کا وقت یا اور کوئی ضروری امر پیش نہ آجاتا یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔

رمضان المبارک کی متبرک راتوں میں تراویح کے بعد دارالعلوم میں تشریف لے جاتے۔ طلبہ، مدرسین، منتظمین سب جمع ہو جاتے۔ آدھی آدھی رات سے زیادہ گزر جاتی مولانا کے لطائف و فیوض سے حاضرین محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ آہ کس کو معلوم تھا کہ یہ آخری دور ہے۔

اہل اسلام کے گروہ نہایت جوش و خروش سے دور دراز اور قرب و جوار سے سفر کر کے سر آنکھوں کے بل حاضر ہوتے تھے معلوم نہیں کونسی کشش اور کیسا قوی اثر تھا کہ لوگ کھینچے ہوئے چلے آتے تھے اور خدا جانے وہ کونسا معنوی حسن و کمال تھا کہ عوام و خواص کی گردنیں یہاں خم کراتا تھا۔ بڑے بڑے مقتدا عالم، مقدس مشائخ، جو بجائے خود ہزاروں معتقد و مرید رکھتے تھے مولانا کی بارگاہ عالی میں بے ساختہ جبین نیاز جھکاتے تھے اور روزانہ بہت سے آدمی حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل ہوتے تھے۔

ہر وقت ایک اسلامی دربار لگا رہتا تھا اور دارالعلوم سے آپ کے مکان تک علما و صلحا کی جوق در جوق آمد و رفت سے ایک عجیب چہل پہل اور متبرک منظر رہتا تھا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی موجودگی کا زمانہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کی

---

[1] حضرت مولانا اپنے استاد مولانا محمد قاسم صاحب کا ذکر فرماتے تو استاد رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے ۱۲

گاہ گاہ دیوبند تشریف آوری کے مجمع بالکل پیش نظر ہو جاتے تھے پُرانے مخلص کبھی اُس زمانہ کو یاد کرکے روتے تھے اور کبھی اس پُربہار حالت کو دیکھ کر شادان و فرحاں ہوتے۔ حضرت مولانا کے معتقدین و متوسلین کے لئے اس زمانہ میں بلا مبالغہ دن عید تھا اور رات شب برات اور بار بار خیال گزرتا تھا کہ ایں چہ می بینم بہ بیداری است یارب بخواب۔ مگر افسوس کہ ؎

بزم میں ساقی بھی تھا اور مے تھی اور پیمانہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

آہ کس قدر جلد یہ سب باتیں خواب و خیال ہو گئیں ؎

آہ وہ راتیں کہاں اور ہائے ایسے دن کہاں — ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں آج ان ایام کو
خواب کی تھی اِک کہانی خواب کا تھا اک سماں — دیکھنے والوں نے کیا دیکھا بتائیں کس طرح

حضرت مولانا گنگوہی قُدس سرہٗ کی وفات سے کچھ زمانہ پہلے انتہائی رجوع و ہجوم اور بالکل کا مشاہدہ اور عیاناً افاضۂ انوار و برکات کو دیکھ کر حضرت ممدوح کے ایک مخصوص بزرگ خلیفہ نے اظہار اندیشہ و خطرہ کے طور پر اپنے خاص لوگوں سے فرمایا تھا کہ ”ایسی حالت میں بہت طویل زمانہ تک باقی نہیں رہا کرتی“۔ ان بزرگ کا یہ مقولہ فراست ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بالکل مشابہ تھا جو سورہ اذا جاء نصر اللہ کو سُن کر زار زار رُوتے تھے۔ ان کا یہ اندیشہ برمحل ثابت ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمۃ کی وفات ہو گئی۔ حضرت مولانا دیوبندی کے دورِ آخر کی بہاریں دیکھ کر کبھی کبھی وُہ واقعہ یاد آیا کرتا تھا اور اندیشہ ہوتا تھا کہ دیکھئے لیکن یہ محض ایک خطرہ ہوتا تھا جو اِدھر سے آیا اُدھر سے گزر گیا۔ مولانا تندرست تھے ہشاش بشاش رہتے تھے۔ سفر کا ضعف و تکان بھی تقریباً زائل ہو گیا تھا یہ کہاں خیال تھا کہ آفتاب غروب ہی ہو جائے گا۔

؎ وہ سمجھے تھے کہ کارِ تعلیم و تبلیغ ختم ہوا۔ لوگ فوجاً فوجاً اسلام میں داخل ہو گئے اب تسبیح و استغفار اور رخصت کا زمانہ آگیا۔ ۱۲

حضرت مولانا غایت تواضع و کسر نفسی سے کبھی امامت نہ فرماتے تھے ہزار دل نیاز مندان میں شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہو جس نے کسی موقع پر آپ کے پیچھے نماز پڑھی ہو لیکن تشریف آوری کے پانچ روز بعد عید واقع ہوئی۔ اس میں آپ نے مخصوص نیاز مند و خادم خطیب و امام عید کی استدعا اور اہل شہر کے اصرار پر امامت قبول فرمائی اور ہزارہا بندگانِ خدا کی دیرینہ آرزو بر آئی۔

فتحپور اور دیگر شہروں کا سفر

حضرت مولانا جس روز سے تشریف لائے تھے اپنے رفیق سفر واسیری مولوی نصرت حسین صاحب مرحوم کی تعزیت اور ان کی غمزدہ والدہ اور غمزدہ اہلیہ کی تسلّی اور یتیم بچّوں کے سر پہ دست شفقت پھیرنے کے لئے سفر کا ارادہ فرما رہے تھے لیکن مہمانوں کی روزانہ آمد و رفت سے مجبور رہتے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ

"جہاز میں یہ قصد تھا کہ ہندوستان پہنچتے ہی سیدھے مولوی نصرت حسین مرحوم کے مکان پر جائیں گے لیکن بمبئی میں اپنے لوگوں کی ایک بڑی جماعت دیکھ کر مجبور ہو گیا۔ ان سب کا چھوڑ کر خود چلا جانا بھی نامناسب تھا اور سب کو ساتھ لے جانا بھی باعث دِقّت و دشواری، اس لئے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔"

مہمانوں کی آمد و رفت کم نہ ہوتی تھی لیکن اخباروں میں سفر کا اعلان کر دیا گیا تھا اور لوگوں کی زبانی بھی رفتہ رفتہ سفر کی خبر مشہور ہو گئی تھی، اس لئے کثرت ذرا کم ہو گئی اور دس شوال کے بعد حضرت نے قصدِ سفر فرما ہی دیا اور دیوبند سے دہلی روانہ ہو گئے اور ایک روز قیام فرما کر وہاں سے بہ قصد فتحپور روانہ ہو گئے اگرچہ مقصود فتحپور کا سفر تھا لیکن مخلصین کی عرض و معروض اور دور دراز کے ہزارہا مشتاقانِ دیدار کی خوش قسمتی سے لکھنؤ، کانپور، الٰہ آباد، غازی پور، جونپور، فیض آباد وغیرہ میں بھی اُترنے کا اتفاق ہوا اور لوگ مخلصانہ عقیدت سے انتہائی طور پر مراسم تعظیم و تکریم بجا لائے۔ الٰہ آباد اور لکھنؤ میں مجمع بہت زیادہ تھا ان کے بعد مراد آباد

کا نمبر تھا۔ ان تمام حالات کی تفصیل اور ہر اسٹیشن پر رجوع وہجوم خلائق کا بیان باعثِ مزید طول ہوگا۔ اس لئے چھوڑ دیا گیا۔

بہت سے مقامات پر تشریف لے جانے کا وعدہ تھا اور لوگ نہایت مسرت اور شوق سے انتظار کر رہے تھے کہ مراد آباد میں دیوبند سے حضرت کی اہلیہ محترمہ کے شدید مرض کا تار پہنچا اور وہیں سے آپ ۲۵ شوال کو دیوبند واپس آگئے جن مقامات پر تشریف نہ لے جاسکے۔ وہاں کے لوگوں کی حسرت و افسوس کا اندازہ دشوار ہے لیکن دُنیا بامید قائم۔ اس امّید پر دل کو تسلی دیتے تھے کہ بمقتضائے وسعت اخلاق کسی دُوسرے موقع پر حضرت مولانا ضرور تشریف لائیں گے۔ ان کو کیا خبر تھی کہ یہاں تشریف لانا مقدر ہی نہیں اور ان کی یہ حسرت کبھی پوری نہ ہوگی ؎

بہت سی حسرتیں ایسی ہیں جن کا خون ہوتا ہے
بہت ارمان ایسے ہیں کہ دل کے دل میں رہتے ہیں

اگرچہ سفر کی اطلاع اخبارات وغیرہ سے ہوگئی تھی مگر بہت سے حضرات جن تک اطلاع نہ پہنچ سکی۔ حضرت مولانا کی عدم موجودگی میں تشریف لائے بعض نے سفر ہی میں جاکر نیاز حاصل کئے۔ اخیر میں آنے والے انتظار میں ٹھہرے رہے صرف دو چار محروم چلے گئے۔

دیوبند واپسی اور مولانا طاہر قاسمی کا عقدِ مسنون

اس سفر سے واپس آنے کے بعد اگرچہ اہلیہ صاحبہ کی زیادہ علالت سے حضرت کسی قدر متفکر رہتے تھے اور وُہ پہلی سی بشاشت انبساط نہ تھا تاہم ایسا شدید تغیر و انقباض بھی نہ تھا کہ حاضرین کو پژمردہ کردے حضرت بدستور سابق مہمانوں کے مجمع میں تشریف رکھتے، گفتگو فرماتے، سوالات کے جوابات توجہ سے بہ تفصیل عطا فرماتے۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم کے صاحبزادے حافظ قاری محمد طاہر سلمہٗ کی شادی عرصہ سے حضرت مولانا کی تشریف آوری کے انتظار میں بعض دیگر وجوہ سے مؤخر ہوتی چلی آتی تھی حضرت کی تشریف آوری کے بعد اس کے لئے ۲۸ شوال مقرر ہوئی اور جا بجا دعوت شادی کے خطوط بھیجے گئے لوگوں نے اس موقع کو نہایت غنیمت سمجھا اور شیخ وقت کی زیارت اور حضرت قاسم العلوم کے جگر گوشہ کے عقد نکاح کی شرکت کو ہم خرما و ہم ثواب سمجھکر امید سے بہت زیادہ مہمان اس تقریب مسعود میں حاضر ہوئے بہت سے حضرات جو شرف زیارت حاصل کر چکے تھے وہ دوبارہ شادی کے لئے تشریف لائے لیکن بڑا مقصد وہی قند مکرر تھا یعنی حضرت کی زیارت اس طرح اس موقع پر ایک کامل اسلامی جلسہ کی شان نمایاں ہوگئی، علماء صلحا اور ان کے متبعین و مخلصین کی متبرک صورتیں ہر طرف نظر آنے لگیں۔

جو تقریب قاسم العلوم والخیرات کے خاندان کی طرف منسوب ہو اور شیخ الہند جیسی مقدس ذات کا متبرک قدم درمیان میں ہو وہاں منکرات و رسومات کا کیا ذکر تھا۔ نماز عصر کے بعد سعادت مند دولہا حضرت شیخ کے مکان پر حاضر ہوا۔ حضرت بکمال شفقت بفرط انبساط اُٹھ کر ہمراہ ہوئے۔ تمام مجمع شاداں و فرحاں پیچھے ہولیا اسی کو بارات کہئے یا اسلامی لشکر سے تعبیر کیجئے۔ محلہ دیوان میں دلہن کے مکان پر پہنچے۔ حضرت شیخ نے خطبہ مسنونہ متوسط آواز سے پڑھنے کے بعد ایجاب و قبول کرایا۔ دعائے برکت فرمائی۔ خرمے تقسیم ہوئے اس تقریب پر حضرت مہتمم صاحب مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی طرف سے علاوہ عام دعوت ولیمہ کے جس میں تمام طلبہ و مدرسین اور صدہا اہلِ شہر شریک تھے چار وقت تمام مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔

حضرت مولانا کے مردانہ مکان میں مہمانوں کی آمد و رفت رہتی تھی اور دربار پُر انوار لگا رہتا تھا اور زنانہ میں حضرت کی اہلیہ صاحبہ (مرحومہ) انتہائی ضعف اور مرض کی تکلیف برداشت کر رہی تھیں۔ صاحبزادیاں اور اعزہ خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ حضرت بھی کبھی مستورات کے بلانے پر اور کبھی خود ہی حال دیکھنے

کے لئے تشریف لے جاتے۔ باہر تشریف لاکر غایت علم و صبر سے حسبِ عادت گفتگو فرماتے۔ ہر شخص کا حال دریافت کرتے۔ البتہ کسی وقت شدتِ مرض اور تکالیف کو دیکھ کر دیر تک سکوت میں رہتے اور خفیف آثار فکر و رنج کے چہرہ پر عیاں ہوتے تھے مگر پھر کچھ دیر کے بعد مقتضائے حسنِ خلق زائرین و اضیاف سے طلاقتِ وجہ اور بشاشت سے گفتگو فرمانے لگتے۔

اہلیہ محترمہ کا مرضِ وفات اور انتقال

حضرت کی اہلیہ صاحبہ مرحوم کا مرض وفات بھی ایک کرامت اور عجائب احوال میں سے ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ارادۂ حج فرمانے سے پہلے ہی آپ علیل تھیں نشست و برخاست کی طاقت نہ تھی کبھی حالت نازک ہوجاتی تھی کبھی کچھ افاقہ ہو جاتا تھا۔ یہ روتی تھیں اور ڈرتی تھیں کہ حضرت کی عدم موجودگی میں میرا انتقال نہ ہوجائے اور حضرت کی شرکت تجہیز و تکفین کی برکت سے محروم رہوں اور حضرت نے برعایت حقوقِ صحبت و رفاقت ان کی صحت کے انتظار میں روانگی میں عرصہ تاخیر بھی فرمائی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کرشمۂ قدرت دکھلانا منظور تھا۔ ہر چند دوا و علاج کئے گئے، مگر صحت نہ ہوئی اور حضرت کو داعیۂ جذبہ الٰہی لبیک کہنے پر مجبور کر رہا تھا اور مولانا کو یہ امید تھی کہ حج کر کے ایک سال یا چھ ماہ میں واپس ہوجاؤں گا۔ آخر ان کو مریض چھوڑ کر اور آخری ملاقات میں یہ الفاظ کہہ کر ان کو رخصت کیا کہ "گھبراؤ نہیں انشاء اللہ ایسی ہی آکر دیکھ لوں گا" اور زبان حال سے فرمایا کہ ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

حضرت مولانا تشریف لے گئے اور دوسرا حج کر کے واپس آنے کا خیال تھا کہ اسیر ہوگئے۔ زمانہ مفارقت طویل ہوگیا۔ بلکہ بعض ایام میں تو واپسی کی کوئی امید ہی نہ رہی۔ یہ صدمات ان مخدومہ کے لئے مرض سے بڑھ کر سوہانِ روح تھے

اور تمام متعلقین و متوسلین سے زیادہ ان کے لئے تکلیف دہ تھے۔ شب و روز دُعا کرتی تھیں اور ظاہری تدابیر میں بھی مقدور بھر کوتاہی نہ کرتی تھیں ایک مرتبہ بعض ذرائع سے مولانا کو مصارف کی تکلیف و دِقّت کی خبر سُنی تو بے چین ہو گئیں۔ باقاعدہ درخواست مرتب کرا کر وائسرائے کی خدمت میں بھیجی کہ یہاں سے روپیہ بھیجنے کی اجازت دی جائے مگر افسوس کہ منظور نہ ہوئی۔

پانچ سال کی طویل مدّت تکالیف و صدمات ہی میں گذری کبھی اُمّید بندھ جاتی تھی کبھی مایوس ہو جاتیں مرض میں کبھی خفت ہو جاتی کبھی شدت ہو جاتی۔ بلکہ آخری ایام میں ایک درجہ تک اچھی صحت حاصل ہو گئی تھی۔

خبریں تو اُڑتی ہی رہتی تھیں ایک مرتبہ رہائی کی کچھ افواہ سُنی اور بعض ذرائع سے اس کی تصدیق بھی ہوئی تو نہایت خوشی سے مولانا کی راحت اور مہمانوں کی ضیافت کا بہت کچھ سامان مہیّا کیا اور وسعت حوصلہ سے بڑے بڑے ارادے فرمائے مگر یہ خبر درجۂ افواہ تک ہی رہی اور اس کے بعد عرصہ دراز تک کوئی اطلاع نہ آئی۔

خُدا تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ عدن سے حضرت کی تشریف آوری کا تار پہنچا ہی تھا کہ یہ پھر بدستور مریض ہو گئیں اور تقریباً وہی کیفیت ہو گئی جو مولانا کی روانگی کے وقت تھی۔ مولانا مکان پر تشریف لائے تو ان کو ہوش تو تھا مگر نہ اس قدر کہ پوری مسرّت حاصل ہو سکے یا زبان سے کچھ اظہار کر سکیں بہر حال تقدیر خداوندی نے وہ الفاظ پوری طرح صادق کرا دیئے جو آپ نے بوقت رخصت فرمائے تھے اور حضرت مولانا نے ان کو حالتِ مرض ہی میں آکر دیکھ لیا۔ بقول شخصے

خُدا کا شکر ہے تم آگئے ہو میری بالیں پر
مری قسمت میں تھا یہ آخری دیدار ہو جانا

جس کی آنکھیں پانچ برس سے ترس رہی تھیں اور جس کا دل دن رات منتظر رہتا تھا اس کا اس وقت اظہار مسرّت کے موقع پر بے اختیار و بے بس پڑا رہنا اور شدت مرض سے سامان رخصت نظر آنا ضرور خون کے آنسو رلانا اور زبان حال

سے یہ کہلاتا ہوگا ؎

امّید بستہ بر آمد ولے چہ فائدہ زانکہ — اُمید نیست کہ عمرِ گذشتہ باز آید

شب فرقت سر بالیں مرثیہ اس گھڑی پہنچے — کہ شمع عمر بجھتی تھی طلوع صبح تھی غم کی

علاج معالجہ تو پہلے سے بھی ہو رہا تھا لیکن حضرت کی موجودگی اور مرض کی زیادتی سے اس وقت اہتمام بہت زیادہ تھا مختلف اطبّا کی رائے شریک رہی اور ہر قسم کی تدابیر کی گئی لیکن وقت پورا ہو چکا تھا، کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور صدہا عزیز واقربا اور ہزارہا منتسلین شیخ کو روتا چھوڑ کر بوقت چاشت ۱۷، ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ روز سہ شنبہ کو دنیا سے رخصت ہوئیں۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون ط

وفات کے بعد فوراً دارالعلوم دیوبند کے علما و طلبہ نے کلمہ شریف کا ختم اور قرآن خوانی شروع کی اور نماز ظہر تک برابر ایصال ثواب ہوتا رہا۔ بعد نماز ظہر دارالعلوم میں مجمع کثیر نے نماز جنازہ پڑھی اور مولانا محمّد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر انوار کے جوار میں دفن ہوئیں۔

مرحومہ ایک نہایت عاقلہ، منتظمہ، دیندار، سیر چشم، مہمان نواز عورت تھیں۔ ان کی صحت میں تمام عمر حضرت مولانا کو کبھی گھر کے انتظام کے متعلق کوئی فکر اور اپنے مہمانوں کے متعلق کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ اور ان کی بیماری میں اور وفات کے بعد بھی صاحبزادیوں نے اپنے حسن انتظام سے مہمانوں کو تکلیف اور مولانا کو فکر کی نوبت نہیں آنے دی۔

پچاس سال کی شریک رنج وراحت، رفیق عسر ویسر، صالحہ اور فرمانبردار اہلیہ کی مفارقت کا صدمہ کوئی معمولی رنج نہ تھا ایسے واقعات پر حزن و ملال طبعی امر ہے مولانا بھی آخر انسان تھے صدمہ ہوا مگر آپ نے سب دل ہی پر برداشت کیا، جزع و فزع کا تو گمان بھی نہیں کبھی زبان سے ذکر تک نہیں فرمایا۔ کوئی دوسرا شخص بھی کبھی بطور تعزیت اظہار رنج و ملال کے لئے کچھ ذکر کرتا تو آپ ادھر ادھر کی لطیف باتوں میں ٹلا دیتے البتہ کئی روز تک خاموش رہے بہت کم گفتگو فرماتی چہرہ پر رنج

کا اثر ہوتا رہا۔ خدّام و حاضرین خود بھی اس رنج سے متاثر تھے اور بلحاظ ادب زائد از ضرورت بات کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

وفات کی خبر شائع ہوئی تو تعزیت کے لئے خدام و احباب کی آمد شروع ہوئی اور مہمانوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا۔ زیادہ تعلق و تعارف رکھنے والے لوگوں کی یہ تیسری حاضری تھی ایک مرتبہ تشریف آوری پر حاضر ہوئے، دوبارہ قاری محمد طاہر صاحب کی شادی کی تقریب میں، تیسری مرتبہ اب۔

تشریف آوری کے ابتدائی ایّام جس فرحت و نشاط کے ساتھ گذرے تھے وہ حالت اگرچہ اب نہ تھی تاہم فیوض و برکات میں کچھ کمی نہ تھی اور صبح سے شام تک حاضرین و زائرین سے مولانا کو فرصت نہ ہوتی تھی۔ البتہ آرام کے لئے اب کسی قدر وقت مل جاتا تھا۔

سلسلہ حالات اسی طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ عید الاضحیٰ آگئی اور حضرت مولانا نے حسب دستور کئی روز پہلے سے اہتمام و انتظام فرما کر جان نثاران احکام الٰہی کی طرح بہت خوشی سے قربانیاں کیں اور عید سے تیسرے روز حضرت امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے مزار پر انوار کی زیارت اور صاحبزادہ مولانا حکیم مسعود احمد صاحب کی ملاقات کے لئے گنگوہ تشریف لے گئے اور راستے میں سہارنپور و رامپور بھی فرمایا۔

اس سفر میں بہت سے علماء و صلحا خدام و مخلصین ہمراہ تھے اور گنگوہ میں اس اسلامی قافلہ نے پہنچکر حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانۂ حیات کی یاد تازہ کر دی۔ اس سفر میں حضرت مولانا نے رائے پور (ضلع سہارنپور) جا کر بکمال حسرت و افسوس اپنے قدردان اور مخلص بزرگ اور تشریف آوری کے نہایت منتظر حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب قدس سرہٗ کے مزار پر انوار پر بھی فاتحہ پڑھی جن کی ملاقات کا شوق آپ کو مالٹا میں بے چین کئے ہوئے تھا۔ رائپور صرف ایک شب ٹھہر کر حضرت اس سفر سے جلد تشریف لے آئے اور بدستور مکان پر اقامت فرمائی۔

جیسا کہ آپ سُن چکے ہیں حضرت مولانا کو اپنے شناسا و مخلصین کی تکلیف کسی طرح گوارا نہ تھی خود تکلیف برداشت فرماتے مگر حتی الوسع دوسروں کو دِقت سے بچاتے۔ زیادہ ضعیف یا بیمار لوگ جو شوق میں چلے آتے تھے ان سے کلماتِ معذرت فرماتے اور ان کی تسلّی کرتے۔

مولانا محمد فاضل صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نہایت پُرانے خادم و شاگرد پھلت ضلع مظفر نگر میں رہتے ہیں نہایت ضعیف اور بالکل شیخ فانی ہو گئے ہیں۔ ان کا ارادہ ملاقات کے لئے دیوبند آنے کا معلوم ہُوا، تو حضرت نے خود پھلت تشریف لے جاکر ملاقات فرمائی۔

معلوم ہُوا کہ میرٹھ سے ڈاکٹر رحیم اللہ صاحب باوجُود اپنے ضعف وغیرہ کے ملاقات کے لئے تشریف لانے کو تیار ہیں اور ان کو اس میں نہایت تکلیف اور دِقّت ہوگی۔ بلکہ ان کا ایک تار بھی حاضری کی اطلاع پہنچا حضرت نے بذریعہ تار مطلع کر دیا کہ ہم خود فلاں روز پہنچیں گے۔ خود اپنے مجمع کے ہمراہ میرٹھ تشریف لے گئے۔ اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہزاروں مشتاق زیارت سے سیراب ہو گئے حضرت کی صحت و حیات کے زمانہ کا یہ سب سے آخری سفر تھا۔

حضرت کی پہلی علالت اور صحت

شروع ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ سے دیوبند میں مرض تپ لرزہ کا آغاز ہو گیا تھا، اور روزانہ اس میں ترقی ہوتی جاتی تھی۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں دو چار مریض نہ ہوں بعض گھروں میں کوئی خبر لینے والا اور پانی دینے والا نہ تھا، مرد، عورت، بچہ، بوڑھا کوئی اس سے نہ چھوٹتا تھا بعض لوگ دو چار روز کے بعد تندرست ہو جاتے بعض کا مرض طویل ہو جاتا تھا، غرض ایک پریشانی کا وقت تھا۔ دارالعلوم میں بہت طلبہ مریض تھے اور مدرسین مریض ہونے شروع ہو گئے تھے اس لئے عیدالاضحیٰ کی

تعطیل بجائے معمولی پانچ یوم کے بارہ روز تک بڑھادی گئی تھی اور جب یہ کافی نہ ہوئی تو دوبارہ اٹھارہ روز کی تعطیل کر دی گئی تھی ۔

حضرت مولانا تندرست تھے اور حسب عادت قدیمہ اپنے متوسلین و خدام کا تفقد احوال فرماتے رہتے ۔ حاضرین سے غائبین کا حال دریافت فرماتے ۔ زیادہ مرض کی خبر ملتی تو بلاتمیز امیر و فقیر خاص و عام کئی کئی مرتبہ خود تشریف لے جاکر عیادت فرماتے دعا فرماتے ۔ زیادہ تکلیف کی خبر آتی نہایت متاثر ہوتے ، چہرہ پر غم کے آثار نمایاں ہو جاتے ۔

مرض اگرچہ عام اور نہایت تکلیف دِہ تھا دو چار روز صحت کے بعد پھر عود کر آتا تھا لیکن اکثر لوگ تکلیف برداشت کر کے شفایاب ہو جاتے تھے ضائع ہونے کی نوبت بہت ہی کم آتی تھی ، حضرت مولانا کی موجودگی اور تندرستی تمام جماعت کے لئے باعث تقویت و طمانیت تھی ۔ اپنی مصیبت بیان کرتے تھے ، دعا کے لئے کہتے تھے ۔ آپ تسلّی و تسکین فرما دیتے تھے بعض مریض ہلتے کانپتے ہوئے حاضر ہوتے ۔ آپ کو بیٹھا ہوا دیکھ کر دِل قوی ہو جاتے ۔ مرض بھول جاتے ۔

عشرہ محرم کے بعد مولانا کو بھی بخار آگیا اور ترقی کرتے کرتے درجۂ شدّت پر پہنچ گیا ۔ رات بھر تکلیف رہی صبح کو سکون ہوا ۔ مگر دن بھر ضعف کی وجہ سے خاموش لیٹے رہے ۔ حضرت کے منجھلے بھائی مولانا حکیم محمد حسن صاحب نے دوا تجویز فرمائی ۔ ابتدا میں کچھ انکار فرمایا مگر پھر بہ طیب خاطر نوش فرمائی ۔

زمانۂ طاقت و قوت میں حضرت کی عادت تھی کہ تپ لرزہ اور بخار کے علاج میں تعمیل ارشاد فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے تازہ پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے اب اگرچہ بدن میں وہ طاقت نہ رہنے کی وجہ سے یہ علاج بظاہر کچھ مناسب نہ معلوم ہوتا تھا لیکن حضرت نے کمال اتباع سنت کی وجہ سے اب بھی اس علاج کو نہ چھوڑا ۔ اور ایک روز کنوئیں کے قریب بیٹھ کر پچاس ڈول آب تازہ سے غسل فرمایا ۔ ایک روز افاقہ رہا لیکن رات کو بے ہوشی کی حالت

نظر آنے لگی۔ چوتھے روز پھر خفّت ہوئی بعد عشا بیٹھ کر بہت دیر تک حاضرین سے گفتگو فرماتے رہے۔

ان ایام میں مسجد جانے کی بالکل طاقت نہ تھی اکثر کھڑے ہو کر اور گاہ بیٹھ کر نماز مکان ہی میں باجماعت اور بعض اوقات تنہا ادا فرماتے تھے باوجود تکلیف اور شدت مرض کے نماز شروع کرنے کے بعد اسی طمانیت اور وقار کے ساتھ ادا فرماتے تھے جس کی صحت میں عادت تھی۔ دیکھنے والے کو خیال ہی نہ ہوتا تھا کہ مولانا مریض ہیں اور بالکل جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ[1] کا نقشہ نظر آتا تھا۔

دہلی سے مرض کی خبر سنکر ڈاکٹر انصاری صاحب عمدہ سے عمدہ دوائیں لے کر تشریف لائے لیکن غالباً ایک یا دو دفعہ سے زیادہ حضرت نے انگریزی دوا کو استعمال نہیں فرمایا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کے بھائی حکیم عبدالرزّاق صاحب تشریف لائے اور مولانا حکیم محمد حسن صاحب کے ساتھ علاج اور مشورہ میں شریک ہوئے۔

ظاہری اور باطنی تدبیر ہورہی تھی حضرت مولانا رضامندی سے دوا پی لیتے تھے۔ متعلّقین دوست خدّام مخلص ہر طرف دعا میں مشغول تھے۔ دارالعلوم میں آپ کے تلامذہ نے بخاری شریف کا ختم کیا تھا تمام مجمع نے یا سلام کا وظیفہ پڑھا۔ غرض ہر شخص کا دل و زبان مصروف دعا تھا بخار یا اور کوئی شدید تکلیف ان ایام میں معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن علامت ضعف کی وجہ سے حضرت بالکل خاموش آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹے رہتے تھے اور بعض دفعہ یہ حالت بالکل خطرناک نظر آنے لگتی تھی۔

دارالعلوم دیوبند سے انتہائی گہری وابستگی

اپنے مخدوم استاد کی یادگار دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا کو ایسی وابستگی اور اس قدر تعلقات تھے کہ سفر و حضر صحت و مرض عسر و یسر میں بھی کبھی دل سے فراموش نہ ہوتا تھا حضرت ایک زمانہ میں اس کے سب سے پہلے طالب علم رہے

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں کی گئی ہے ۱۲

پھر کبھی مدرس کبھی صدر مدرس اور پھر سرپرست ہ تذکرہ آجاتا تو فرمایا کرتے کہ میاں کبو لی موت الکبراء، رفتہ رفتہ سب اُٹھ گئے مجھے لوگ بڑا سمجھنے لگے

ذھبَ[1] الکرام فسدت غیر مسوّدٍ

ومن الشقاء تفردی بالسودَدِ

دارالعلوم دیوبند کے متعلق اور وابستگی کا کسی قدر اندازہ ذیل کے اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جس کو احقر اپنے انہیں الفاظ میں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہے جو ۱۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کے روزانہ اخبار ہمدم میں شائع ہوئے ۔

گذشتہ ہفتہ حضرت شیخ الہند شدید بخار میں مبتلا ہوگئے تھے غذا دوا سے نفرت تھی ضعف بڑھتا جاتا تھا۔ خاموش لیٹے رہتے تھے ضعف کی وجہ سے تشویش تھی جا بجا خبریں پہنچ گئیں ۔ دُور دُور سے خادم و احباب آگئے بعض جگہ نہایت وحشت ناک غلط خبر مشہور ہوگئی اس لئے صدہا لوگ حیران و پریشان دیوبند آئے بہت سے تجربہ کار طبیب جمع ہوگئے دہلی سے ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھائی صاحب تشریف لائے مگر حضرت نے ڈاکٹری دوا استعمال نہیں فرمائی۔ ابتدا میں پچاس ڈول آب تازہ سے غسل فرمایا کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا ہی علاج روایت کیا گیا ہے اور آخر میں یونانی دوا استعمال فرمائی۔

کل حالت مرض ضعف ہی میں آپ کو محل انوار و برکات رشیدیؒ قاسمی یعنی دارالعلوم کا خیال آیا۔ اس پر آپ کو پالکی میں لٹایا گیا اور بڑے بڑے علماء و مدرسین آپ کو اپنے کاندھوں پر فخر مباہات سے اٹھالے گئے۔ جس جگہ آپ درس حدیث شریف دیا کرتے تھے وہاں

---

[1] کرام صاحب کرم لوگ مرگئے تو میں بدون بنائے ہوئے سردار بن گیا اور یہ نہایت بدبختی کی بات ہے کہ صرف میں ہی سردار رہ گیا ۱۲۔

لیجا کر مولانا کو چارپائی پر لٹایا۔ صغیر و کبیر، بیمار و تندرست علما و طلبہ جمع ہو گئے۔ شہر کے لوگ بھی زیارت کے لئے جمع ہوئے۔ آیت کریمہ وغیرہ وظائف واسطے صحت کے سب نے جمع ہو کر پڑھے (ایک روز پہلے بخاری شریف اور یا سلام کا ختم ہوا تھا) اور ایک گھنٹہ کے قریب تمام حاضرین نے بخلوص قلب دعائے صحت مانگی خدا تعالیٰ کے فضل سے غفلت میں کمی ہوئی اور چند گھونٹ چائے کے آپ نے نوش فرمائے (اسی شکریہ میں جناب مہتمم صاحب دارالعلوم نے تمام مہمانان موجودہ کی اپنے ذاتی خرچ سے عمدہ ضیافت کی) گیارہ بجے تمام اہل علم شاداں فرحاں پالکی کو اپنے کندھوں پر مکان واپس لے گئے۔ آج ۱۰۔ اکتوبر یوم یکشنبہ کو الحمدللہ مولانا کی طبیعت بہت اچھی ہے تشویش اور خطرہ نہیں رہا۔ گفتگو فرماتے ہیں تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ قریب بعید مہمان خوشی اور مسرت سے واپس ہو رہے ہیں "

جیسا کہ اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جس روز کا یہ واقعہ ہے اُسی روز سہارنپور میں وفات کی خبر مشہور ہو گئی جو جس جگہ کھڑا تھا ششدر و حیران وہیں کھڑا رہ گیا۔ اور دس بجے کی گاڑی میں صدہا لوگ دیوبند پہنچ گئے۔ بعض لوگوں نے تصدیق کے لئے تار دیا تھا جس کا عین گاڑی روانہ ہونے کے وقت جواب پہنچ ورنہ ہزارہا آدمی آ جاتے۔

اس کے بعد حضرت میں رفتہ رفتہ طاقت و توانائی آنے لگی حسب عادت مسجد میں تشریف لے جانے لگے۔ جب طبیعت ذرا بحال ہوتی پالکی میں لیٹ کر دارالعلوم میں تشریف لاتے کبھی صحن میں چارپائی پر آرام فرماتے کبھی اوپر دارالمشورہ تک پہنچ جاتے کبھی پیادہ تشریف لاتے۔ اور دوسروں کے اصرار سے پالکی میں سوار ہو کر واپس تشریف لے جاتے۔

حالت اور زیادہ قابل اطمینان ہوئی تو ۲ صفر روز جمعہ کو مخصوص خدام نے

بتقریب صحت جلسہ وعدہ رسیلین دارالعلوم اور حضرت سے خاص تعلق رکھنے والے اہل شہر کو ایک مکلف دعوت دی۔ اللہ اللہ عجیب زمانہ تھا خدام خوشی سے جامہ میں نہ سماتے تھے باہم خوشی خوشی بچائے اور شیرینی کی دعوتیں کرتے تھے کارکنان قضا وقدر ہنستے ہوں گے اور کہتے ہوں گے ؎

کیا شاخِ گل پہ پھول کے بیٹھی ہے عندلیب
ایسا نہ ہو کہ چشم فلک کو بُرا لگے

حضرت کی دُوسری علالت اور وفات

لو محبو سنیو اب غم کی کتاب آنیکو ہے — چشم گریاں سے مرے اب خون ناب آنیکو ہے
جس کے علم و فضل کی ارض و سما میں دھوم تھی — آج وُہ تابُوت میں عالی جناب آنے کو ہے
کر دیا جس نے منوّر ملک ہند اور عالم
آج وہ شمس الہدیٰ زیر سحاب آنیکو ہے

آخر بہار ہو چکی خزاں کے دن قریب آئے ضعف تو تھا ہی ۶ صفر ۱۳۳۹ھ کو حضرت کو دوبارہ بخار ہو گیا۔ ایک ہی روز کے بخار میں صاحب فراش ہو گئے اکثر لوگوں کو بار بار بخار آتا تھا صحت ہو جاتی تھی حضرت کی نسبت بھی یہی خیال کیا گیا کہ ضعیف ہیں بخار ہو گیا ہے آج نہیں کل اُتر جائے گا۔ آہ کس کو خبر تھی کہ یہی بخار جنت کا بلاوا اور موت کا سلام ہے کس کو خیال تھا کہ یہی علالت مرض الموت کی صورت اختیار کر لے گی۔ حسب دستور سابق مولانا حکیم محمد حسن صاحب نے مناسب دوا تجویز فرمائی۔ بخار کچھ کم ہُوا تو پیچش ہو گئی اور ضعف نے نشست و برخاست بھی دشوار کر دی اور مرض کو ترقی ہونے لگی۔ اطبّا نے تجویز کیا کہ پہلی علالت کے اثر سے حضرت کا جگر بڑھ گیا ہے۔

اگرچہ ہر وقت لیٹے رہتے تھے لیکن اس علالت میں ہر وقت غفلت اور

خاموشی نہیں رہتی تھی۔ شدید ضعف کی وجہ سے آواز بلند نہیں نکلتی تھی مگر ضروری گفتگو فرما لیتے تھے اور وارد و صادر سے سلام و مزاج پرسی کر لیتے تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا واقعہ اور اس میں شرکت

اسی حالت مرض میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ پیش آیا۔ مولانا محمد علی صاحب اور دیگر حضرات نے تحریک فرمائی اور حضرت مولانا نے اس کو ایک دینی اور مذہبی کام خیال فرمایا اور اپنے تشریف لے جانے کو مولانا محمد علی صاحب اور ان کے معاونین کے لئے باعث تقویت اور ترک موالات کی تحریک کے لئے موجب تائید خیال فرمایا۔ حالت مرض کو دیکھنے والے آپ کے ارادۂ سفر سے متعجب و حیران رہ جاتے تھے اور بہت سے شخص ارادہ فسخ کرنے کا باادب مشورہ دیتے تھے لیکن حضرت نے اپنے مرض و ضعف کی اصلاً پرواہ نہ کر کے سفر کی شدید تکلیف گوارا فرمائی اور ۱۵ صفر کو بروز پنج شنبہ چند مخصوص حضرات کی ہمراہ علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ ۱۶ صفر (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء) کو بروز جمعہ سواری میں کالج تشریف لے گئے اور لوگوں نے بغایت فخر و مباہات آپ کو ہاتھوں ہاتھ لے جا کر مولانا محمد عبد اللہ صاحب انصاری ناظم دینیات کے کمرہ میں لٹا دیا۔ نماز جمعہ بہ تکلیف ادا فرمانے کے بعد آپ نے جلسۂ افتتاح یونیورسٹی میں کرسی صدارت کو معزز فرمایا اور سہارا لگا کر بہ تکلف بیٹھے خطبۂ صدارت (جو آپ کی طرف سے لکھا گیا تھا اور آپ نے حرف بحرف سن کر پسند فرمایا تھا) پڑھا گیا۔ باوجود تکلیف کے حضرت کسی قدر اور بیٹھنے کی ہمت رکھتے تھے لیکن اطبا و مخلصین نے آپ کو زیادہ تکلیف دینا مضر اور نامناسب سمجھا اور بعزت و احترام تمام آرامگاہ میں پہنچا دیا اور مولانا عبد الباری صاحب صدر جلسہ قرار پائے اور حضرت تیسرے روز دیوبند واپس آ گئے۔

اس موقع پر حضرت مولانا نے حسب عادت قدیمہ دینی خدمت کے مقابلہ پر آرام و صحت کو ہیچ سمجھا اور لوجہ اللہ یہ تکلیف گوارا فرمائی تھی جس میں نہ کسی مخفی غرض

کا احتمال ہے نہ کسی نام و نمود کا شائبہ[1]۔

ڈاکٹر انصاری صاحب و حکیم اجمل خاں صاحب وغیرہ معززہ حضرات نے علی گڑھ ہی سے حضرت سے بغرض علاج دہلی چلنے کے لئے باصرار استدعا کی تھی لیکن ایک مرتبہ پھر حالت حیات میں دیوبند میں تشریف لانا مقدر ہو چکا تھا۔ اس وقت حضرت نے عذر فرما دیا تھا لیکن جب دیوبند پہنچ کر مرض میں تخفیف نہ ہوئی اور ڈاکٹر صاحب اور سب خیرخواہوں کی یہی رائے ہوئی کہ دہلی کا قصد فرمائیں تو حضرت نے منظور فرما لیا۔ شنبہ کو علی گڑھ سے واپس آئے تھے چار روز قیام فرما کر ۲۱ صفر روز چہارشنبہ کو دہلی کا ارادہ کر لیا

دیوبند میں آخری قیام اور دہلی روانگی

آہ وہ نقشہ آنکھوں میں پھرتا ہے جب حضرت اپنی آرامگاہ سے باہر آکر پالکی میں سوار ہونے لگے معلوم نہیں حیرت کا عالم تھا یا حسرت کا، در و دیوار پر ایک غلط انداز نظر ڈالتے تھے پالکی کے قریب آکر چند منٹ اسی حالت میں کھڑے رہے اور سوار ہونے کے بعد پانچ سات منٹ توقف فرمایا مریضوں کو مصافحہ کر کے یہیں سے رخصت کر دیا۔

یہ تو کون جانتا تھا کہ دیوبند سے آج حضرت ایسے جاتے ہیں کہ پھر زندگی میں لوٹنا مقدر ہی نہیں ہے تاہم ایک وحشتناک خیال بدن کو لرزا دیتا تھا اور ایک احتمالی خطرہ قلوب کو بے چین کر دیتا تھا۔ شدید مرض اور ضعف و ناتوانی اور پیرانہ سالی کی حالت میں آپ کے وطن مالوف اور مجمع خدام و مخلصین سے جدا ہونے کا منظر

---

[1] بعض دنیا پرست اخباروں نے حضرت کی اس شرکت کے واقعہ کو استہزاء و تمسخر کے لہجہ میں بیان کر کے اپنی عاقبت خراب کی ہے وہ غالباً سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کی تکلیف میں صحابہ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں بغرض شرکتِ جماعت تشریف لے جانے کے حوصلہ افزا قصہ سے ناواقف ہیں اور رجلاہ تخطان فی الارض کی تکلیف دہ حالت ان کو پیش نظر نہیں رہی۔

دیکھ کر قلوب بے قرار تھے اور آنکھیں اشکبار۔ آخر جاں نثار طلبہ و علما نے پالکی کا ندھوں پر اُٹھائی اور مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کی دینی بہار ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

اسٹیشن تک بہت بڑا مجمع ہمراہ گیا۔ اور گاڑی چھوٹنے تک لوگ مصافحہ اور دست بوسی میں مصروف رہے۔ مولانا کو گاڑی میں براحت و آرام سوار کیا گیا۔ آپ کے بھائی مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور مخصوص خدام و رفقا ہمراہ تھے گیارہ بجے گاڑی روانہ ہوئی اور حضرت نے دیوبند کو الوداع کہا۔ رخصت کے وقت مرض و ضعف کے علاوہ حزن و ملال سے آپ متاثر نظر آتے تھے۔

اگرچہ دہلی میں بہت سے معزز و مستطیع لوگ حضرت کو اپنے مکان پر ٹھہرانے کے آرزو مند تھے لیکن آخری خدمت و تیمار داری کی سعادت بھی ڈاکٹر انصاری صاحب کی خوش قسمتی سے انہیں کے لئے مقدر ہو چکی تھی چونکہ دہلی تشریف لانے میں زیادہ دخل ڈاکٹر صاحب ہی کی استدعا کو تھا اور گویا حضرت مولانا ڈاکٹر صاحب کے مدعو اور مہمان ہو کر تشریف لائے تھے اس لئے دریا گنج میں ڈاکٹر صاحب ہی کی کوٹھی پر مع مجمع خدام قیام فرمایا۔

مخصوص حضرات کی زبانی حضرت نے ڈاکٹر صاحب سے کہلا بھی دیا تھا کہ میرے ساتھ چونکہ کئی آدمیوں کا مجمع ہے اور آئندہ بھی مہمانوں کی آمد و رفت ضرور رہے گی۔ اور آپ کے مکان پر خود آپ کے کئی کئی مہمان روزانہ رہتے ہیں اس لئے ہم اپنی ضروریات طعام وغیرہ کا تکفل خود کرنا چاہتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کو کسی طرح منظور نہیں فرمایا اور آخر دن تک بکمال سیر چشمی حضرت مولانا اور حاضرین خدمت خدام و مخلصین و اقارب کے دو وقتہ طعام اور ناشتہ وغیرہ کا انتظام اپنے ہی ذمہ پر رکھا اور گھر والوں نے جس خلوص سے اس کا اہتمام کیا وہ انہیں کا حق تھا۔

علاج ابتداء میں جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کا ہوتا رہا اور اخیر میں

ڈاکٹر صاحب کا اور حضرت کے بھائی صاحب اور مولانا جمیل الدین صاحب کا مشورہ بھی شریک رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے علاج معالجہ اور راحت و آرام کے سامان میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حضرت کے ہمراہ کافی سے زیادہ خدام تھے لیکن ڈاکٹر صاحب اور ان کے ملازم خود بھی ہر وقت خدمت کے لئے تیار رہتے تھے ڈاکٹر صاحب کے ایک معتمد صاحب اس خدمت پر مامور تھے کہ ملاقات کرنے والے لوگ دیر تک آپ کے ساتھ گفتگو نہ کریں۔ کیونکہ یہ نہایت ہی مضر سمجھا جاتا تھا ایسی قیود اگرچہ مولانا کے خلاف طبع تھیں لیکن ضرورتاً گوارا فرماتے تھے اور حتی الوسع تو آپ کو ایسی قیود کی اطلاع بھی نہ دی جاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب اور جناب مسیح الملک نے حضرت مولانا کی خدمت اور معالجہ میں جو کچھ توجہ اور مصروفیت اختیار فرمائی وہ محض بہ حسن عقیدت ایک اسلامی خدمت اور اپنے لئے باعث سعادت سمجھ کر کی ہے جن کا اجر ان کے لئے انشاء اللہ تعالیٰ کفارہ سیآت اور ذخیرہ آخرت ضرور ہوگا۔ تاہم ان حضرات کی اس سعی و توجہ سے حضرت کے تمام اقربا و متوسلین اور دارالعلوم دیوبند کے تمام متعلقین نہایت مشکور ہیں۔

صحت و شفا قسمت سے ہے اور موت و حیات مقدر۔ لیکن بلا مبالغہ حضرت مولانا کو وہ علاج و دوا میسر آئی کہ بادشاہوں کو نہیں آسکتی ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب کا علاج اور پھر خلوص و محبت سے بھرا ہوا مولانا محمد یعقوب صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے مولانا محمد قاسم صاحب (قدس سرہٗ) کے علاج معالجہ کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ حرف بحرف حضرت مولانا کے متعلق صادق آتا ہے فرماتے ہیں۔ اگر دوا و تدبیر پہ کام ہوتا تو مولانا کو بیشک صحت ہو جاتی۔ وہ دوائیں مولانا کو میسر آئیں جو اُمرا کو بھی شاید بدشواری میسر آویں اور ایسا علاج ہوا جو بادشاہوں کو بھی نصیب ہو کہاں طمع اور خوف کی بات اور کہاں عقیدت قلبی۔

حضرت مولانا بہ تعمیل یَا عِبَادَ اللّٰہِ تَدَاوَوْا[1] اور بحکم اَعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ[2] ظاہری

---

[1] اے اللہ کے بندو دوا دارو کیا کرو۔ [2] رسی سے باندھ اور پھر توکل کر۔

تدابیر و معالجات کو قبول فرماتے تھے اور بمقتضائے مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ اپنے مخلص معالجوں اور خدمت گزاروں کے لئے مشکور و دعا گو تھے لیکن جیسا کہ ایک عارف کامل کی شایان شان ہے کبھی ان اسباب پر اعتماد نہ فرماتے تھے اور نظر اپنے حقیقی مسبب الاسباب پر رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دہلی سے وطن واپس ہونے کا کچھ خیال ہوا تو حاضرین خدام نے معالجوں کے اخلاص و توجہ اور دوا و علاج کی سہولت کو ذرا اہتمام سے بیان کر کے عرض کیا کہ "یہ باتیں دیوبند میں کہاں میسر ہوں گی"۔ تبسم کر کے ارشاد فرمایا کہ بھائی سب بچوں کا کھیل ہے"۔

وطن (دیوبند) سے محبت

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے تمام اوصاف حسنہ سے حصہ دیا تھا، اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مظہر بنایا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن سے جس قدر محبت تھی وہ مخفی نہیں اس لئے ارشاد فرمایا ہے "اے بلد مکہ تو خدا تعالیٰ کے تمام شہروں سے بہتر ہے اور سب بستیوں سے زیادہ خدا تعالیٰ کو محبوب ہے اگر میں تجھ ہی سے زبردستی نہ نکالدیا جاتا تو نہ نکلتا"۔ کبھی فرمایا کہ اگر میری قوم مجھ کو نکال دیتی تو تیرے سوا کسی جگہ سکونت نہ کرتا۔ (ترمذی شریف)

جمعیۃ العلمائ کے اجلاس میں شرکت

حضرت کو بھی وطن سے ایک خاص انس تھا دہلی میں ہر طرح کی راحت وطن سے زیادہ میسر تھی لیکن بار بار وطن کا ارادہ فرماتے تھے مگر احکام قضا و قدر کے لئے ظاہری اسباب موجود ہو جاتے ہیں۔ کسی قدر دوسروں کا اصرار اور زیادہ تر جمعیۃ العلماء کے جلسے کی شرکت کا خیال واپسی سے مانع رہا۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس سے حضرت کو ایک ایسی خاص دلچسپی معلوم ہوتی تھی جیسے دنیا دار لوگوں کو اپنی اولاد و اقارب کی تقریبات شادی کے سامان و سرانجام سے ہوا کرتی ہے خطبۂ صدارت

خود لکھنے کی طاقت نہ تھی خاص شاگردوں نے لکھا۔ انتہائی درجہ کے معزز اور ثقہ حضرات شاہد ہیں کہ ان کے سامنے حضرت نے ایک ایک حرف نہایت توجہ سے سنا بعض الفاظ اور جملوں کے زیادہ اور کم کرنے کی فرمائش کی۔

جمعیۃ العلما کا صرف نام تھا مقصد علما کا مقصود اعظم حضرت کی زیارت تھی اور طبعاً شرکت جلسہ جو حضرات اس موقع پر حاضر ہوتے حضرت ان سے نہایت بشاشت اور بہت ہی فرحت کے ساتھ ملتے۔ بعض سے فرماتے کہ "آپ کا تو انتظار رہی تھا" بعض سے کہا کہ "بھائی بہت انتظار دکھلا کر آئے"۔ حضرت کے بعض شاگرد جن کی مقبولیت و شہرت کی وجہ سے جمعیۃ العلماء کو خاص تقویت کی امید تھی جب بالکل یکسوئی اور بے تعلقی کے ساتھ شرکت سے علیحدہ اور مجتنب رہے تو آپ کو نہایت حسرت ہوئی اور غایت افسوس کے ساتھ اپنے ایک ہمنام الہ آبادی کی زبان سے گویا یہ فرمایا ؎

کسی کا میری بزم غم سے اے محمود یوں اُٹھ کر
قیامت ہے شریکِ محفلِ اغیار ہو جانا

حضرت کا شوق اور دلچسپی اور جس کام کی سرپرستی کا وعدہ کیا ہے اس کی اہمیت کا خیال اور نگرانی کا خیال تو اسی کو متقضی تھا کہ مقام جلسہ پر جا کر حضرت شریک ہوتے لیکن اطبا نے اس کو مضر سمجھا اور با صرار کے ساتھ عرض کیا۔ حضرت نے بھی ان کے خلافِ رائے عمل کرنا پسند نہ فرمایا۔ اور ظاہری شرکت سے مجبور رہے، لیکن محض جلسہ کی رعایت سے حضرت کا ان ایام میں دہلی قیام فرمانا بھی ایک اعلیٰ درجہ کی شرکت تھی۔ اور منتظم اور کارکن لوگوں کے لئے باعثِ عزت۔

جلسہ میں عجیب قدرت خداوندی نظر آتی تھی۔ مختلف الخیال علما ایک جگہ ایک مقصود کے لئے جمع تھے اختلاف کو بھول گئے تھے اور یہ سب بکمال خلوص عقیدت حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر آداب نیازمندی بجا لاتے تھے جلسہ کامیابی اور خیر خوبی کے ساتھ ختم ہونے سے حضرت کو ایک ایسی مسرت و طمانیت حاصل

ہوئی جیسے کسی سپہ سالار اعظم کو فتح عظیم ہے

۹ ربیع الاول کو جلسہ ختم ہوا اور ۱۱ ربیع الاول کو مخصوص خدام علماء باطمینان حضرت سے رخصت ہوکر اپنے مقامات کو واپس ہوئے یہ کس کو معلوم تھا کہ یہ اسلام کا قائد اعظم اور دنیا کا بہترین شیخ اب دنیا میں صرف ایک ہفتہ کا مہمان ہے اور اس کا یہ دیدار آخری دیدار ہے۔

حضرت مولانا جلسہ کے بعد بہت جلد دیوبند کی معاودت کا ارادہ فرما چکے تھے مگر مشیت ایزدی چاہتی تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سچے جانشین محدث کی روح بھی اسی سرزمین سے آسمان اور علیین کی طرف جائے جہاں سے محدثین و فضلا کی ایک عظیم الشان جماعت کی ارواح عالم بالا کو گئی ہیں قرب صحت کی امید پر معالجوں نے اصرار کیا حضرت نے واپسی میں عجلت نہ فرمائی۔

حضرت کے امراض میں بین افاقہ نظر آتا تھا اطبا کی تشخیص میں جگر کی بھی اصلاح ہوگئی تھی چہرہ کا ورم بھی جاتا رہا تھا البتہ ضعف تھا اور ثقل سماعت ہوگیا تھا جس کی نسبت معالجوں کا خیال تھا کہ صحت اور قوت کے بعد جلد زائل ہوجائے گا۔ نہ ایسے آثار تھے جن سے قرب اجل کا گمان غالب ہوجائے اور نہ حضرت نے کبھی کوئی کلمہ فرمایا جو متوسلین کے لئے باعث مایوسی ہوجائے۔

مرض کی شدت اور وصال

۱۴ ربیع الاول یوم جمعہ تک بھی اطمینانی حالت تھی۔ شنبہ کے روز حضرت کو لرزہ کے ساتھ نہایت تیز بخار ہوگیا تکلیف بڑھ گئی اور حالت تشویشناک ہوگئی اس سے پہلے اطمینان بخش حالت دیکھ کر اور دیوبند میں اپنی صاحبزادی کی شدید علالت سنکر مولانا حکیم محمد حسن صاحب دیوبند تشریف لے گئے تھے علالت کی زیادتی دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے دیوبند آدمی روانہ کیا۔ دوشنبہ کو بوقت عشا نو بجے حکیم صاحب دہلی پہنچے تو مولانا کی تکلیف نہایت بڑھی ہوئی تھی اور حالت

خطرناک تھی تاہم ہوش و حواس بجا تھے آدمی کو پہچانتے تھے بہت ضعیف آواز سے آواز سے کوئی بات فرماتے تھے۔

رات پھر یہی حالت رہی سینہ پر بلغم تھا جس کو ضعف کی وجہ سے دفع نہیں کر سکتے تھے صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف اُمید حلق میں اتر گیا چھ بجے کچھ اجابت ہوئی اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ ضعف لحظہ بڑھتا جاتا تھا اور باوجود ہوش بجا ہونے کے ایک استغراقی حالت طاری تھی مخصوص لوگ چارپائی کے گرد موجود تھے دل دھڑک رہے تھے طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھئے۔

سات بجے کے بعد (۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو) بہت تغیر ہوگیا اور حضرت دُنیا سے بالکل غافل ہوگئے تنفس طویل اور غیر طبعی ہوگیا۔ اور انقطاع عن الدنیا و توجہ الی الرفیق الاعلیٰ کا گمان غالب ہونے لگا چارپائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اس غیر فانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا جس کے نام پر اپنے آپ کو محو کر دیا تھا یعنی بلند آواز سے تین مرتبہ۔ اللہ اللہ اللہ فرمایا۔

مولانا کفایت اللہ صاحب نے سورۂ یٰسین شروع کی۔ مگر وہ جوشِ گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس لئے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا سورۂ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کر لیا ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کر لی اور آٹھ بجے جبکہ مولوی صاحب بالکل اخیر سورت پہ پہنچے تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کے لئے زبان کو حرکت دی اور خاص اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ کی آواز پر قبلہ رُخ ہو کر ہمیشہ کے لئے آنکھ بند کر لی یُسر و سہولت سے سانس منقطع ہوگیا اور رُوح مقدس رَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ کی بہار دیکھنے کے لئے تمام اہل اسلام کو یتیم و بیکس چھوڑ کر دُنیا سے رخصت ہوئی اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

غمزدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق و بیقراری کا اندازہ آسان نہیں کچھ دیر تک تو وہ حالت رہی کہ ایک کو ایک کی خبر نہ تھی کسی کی آہ نکلی کوئی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسے جانکاہ حادثات پر آہ و نالہ اور چیخ و پکار ایک معمولی بات ہے مگر حضرت کا فیض صحبت کام آیا اور رضا بالقضا کا مضمون غالب ہوا۔

تجہیز و تکفین اور جنازہ کی دیوبند منتقلی

نصف گھنٹہ کے بعد منزل اوّل کا فکر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ کے بھائی صاحب اور خدام سے استفسار کیا۔ فرمایا کہ اگر دہلی میں دفن کرنا آپ مناسب سمجھیں تو محدثین کے مزارات ہیں سامان کیا جائے اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آوے حضرت مولانا کی آرزو بھی اپنے مخدوم استاذ کے جوار با کرامت کی سب کو معلوم تھی اور یہی کشش دوسری دنیا (یعنی مالٹا) سے کھینچ کر یہاں لائی تھی اور دو صاحبزادیاں بھی اب تک دہلی نہ پہنچی تھیں اس لئے یہی رائے ہوئی کہ دیوبند لے چلنا بہتر ہے۔

دہلی میں تو اس سانحۂ جانگداز کی خبر بجلی کی طرح ایک دم میں پھیل ہی گئی تھی دیوبند کو ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کا مفصل تار روانہ کیا کہ "وفات ہوگئی جنازہ شام کو دیوبند پہنچے گا" اور بعد بعض اخبارات کو بھی تار دیئے۔ دہلی سے اور بھی صدہا شخصوں نے بذریعہ تار اپنے عزیزوں اور مولانا کے معتقدین کو اس مصیبت کی اطلاع دی اور دوسرے مقامات پر تار پہنچے تو وہاں سے بھی لوگوں نے اپنے متعارف اشخاص کو حتی الوسع جلد مطلع کیا اور پولیس اور خفیہ پولیس نے بھی اپنے محکموں میں اطلاع دہی میں کوتاہی نہیں کی۔ اس طرح مغرب کے وقت ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس قیامت خیز واقعہ کی اطلاع پہنچ گئی۔ خیال نہیں ہوتا کہ ہندوستان میں کبھی کسی بڑے سے بڑے معتقد اور مقتدر یا قومی لیڈر کی وفات کی خبر اس سرعت کے ساتھ شائع ہوئی ہو۔

ڈاکٹر صاحب اطلاع دہی اور کفن اور تابوت اور ریل کے انتظام میں مصروف ہوئے۔ ادھر خدام نے غسل کا انتظام کیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور حضرت کے مخصوص شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون غسل دیا کفن پہنا کر تابوت میں رکھا (جو نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کرایا گیا تھا) اور ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سارٹیفکیٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہو گئے جن کی تعمیل میں دوسروں کو بہت اور تاخیر پیش آتی۔

ڈاکٹر صاحب نے جس طرح اپنے اس مخدوم مہمان کی مہمانداری اپنے ذمہ رکھی تھی اسی طرح تجہیز و تکفین اور ریل کے متعلق تمام مصارف بھی خود ہی برداشت فرمائے اور حضرت مولانا کے اعزہ کی طرف سے اس کے خلاف اگر کچھ اشارہ بھی معلوم ہوا تو ناگوار گزرا۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

نمازِ جنازہ اور لوگوں کا اصرار

دہلی میں وفات کی خبر مشہور ہونے کے ساتھ ہی تمام اہل اسلام اور ہنود نے بھی دوکانیں بند کر دیں اور ہزاروں مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ایک مرتبہ کوٹھی کے سرسبز وسیع میدان میں نماز ہوئی اور جنازہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا راستے میں ہزاروں اہل اسلام شریک ہوتے جاتے تھے جنازہ کو کاندھا دینے کا تو کیا ذکر ہے ہاتھ لگانا بھی نہایت دشوار تھا تمام مجمع آہستہ آہستہ ذکر اللہ کرتا جاتا تھا اور بعض دفعہ اللہ اکبر کے نعرے دل ہلا دیتے تھے بہت بیقرار اور اشکبار چلے جا رہے تھے۔ جامع مسجد کے قریب پہنچ کر لوگوں کا اصرار ہوا کہ جامع مسجد میں دوبارہ نماز ہو لیکن وقت کی تنگی کا عذر کر کے بہ مشکل تمام اسٹیشن پہنچتے پہنچتے ادنیٰ اندازہ سے بیس ہزار آدمیوں کی تعداد ہو گئی یہاں ایک مرتبہ پھر نماز جنازہ پڑھی گئی اور انجن کے قریب ایک نہایت صاف و شستہ مال گاڑی لگا کر تابوت اس میں رکھا گیا مسلمانوں کے چہروں پر حسرت برستی تھی اور تمام جگہ افسردگی کا عالم نمایاں تھا صدہا

لوگوں نے ٹکٹ لے کر اسی گاڑی میں دیوبند کا قصد کیا اور مخصوص حضرات جنازہ کے گرد مال گاڑی میں سوار ہو کر خاموشی سے ذکر اللہ کرنے لگے۔ اڑھائی بجے کے بعد دہلی سے اس قطب زمان کے جسد عنصری کو لے کر گاڑی روانہ ہوئی۔

جن مقامات پر خبر پہنچ گئی تھی وہاں کے اسٹیشنوں پر مخلوق کا نہایت ہجوم تھا کچھ لوگ حسرت سے جنازہ کی زیارت کر کے چلے جاتے تھے اور بعض اصحاب دیوبند تک ہمراہ رہنے کے لئے سوار ہو جاتے تھے شہر میرٹھ اور چھاؤنی میرٹھ پر نماز جنازہ پڑھی گئی جنازہ باقاعدہ قبلہ کی طرف گاڑی میں رکھا ہوا تھا امام اور دس بیس مقتدی گاڑی پر آجاتے تھے اور باقی تمام مجمع باہر سے اقتدا کرتا تھا۔

دیوبند سے چند حضرات کئی روز سے دہلی حاضر ہونے کا قصد کر رہے تھے۔ دوشنبہ کو کسی قدر صحت کی خبر سن کر ٹھہر گئے لیکن سہ شنبہ کو (یعنی وفات کے روز) گیارہ بجے دن کی گاڑی میں دیوبند سے حضرت مولانا کی صاحبزادیاں اور ایک داماد اور حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب۔ حضرت مہتمم صاحبان دہلی کو روانہ ہوئے۔ چار بجے یہ گاڑی غازی آباد پہنچی تو دیکھتے ہیں کہ دہلی سے آنے والی گاڑی (جو اسی وقت غازی آباد پہنچتی ہے) دہلی کے اہل اسلام اور حضرت کے خدام سے بھری ہوئی ہے۔ ابتداءً تعجب ہوا اور پھر خیال آیا کہ شاید حضرت وطن واپس آرہے ہیں۔ یہ لوگ ہمراہ ہیں اس خیال کو ایک لمحہ گذرا تھا کہ اس گاڑی میں سے بعض حضرات نے اتر کر اس واقعہ فاجعہ کی اطلاع کی کہ روح مبارک وطن حقیقی میں پہنچ چکی اب جسد خاکی اپنے ظاہری وطن میں آرہا ہے یہ حضرات حیران و پریشان رہ گئے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی بے ساختہ سب کی زبان سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ نکلا گاڑی چھوٹنے کا وقت قریب تھا یہ حضرات بعجلت تمام اتر کر دیوبند آنیوالی گاڑی میں باچشم گریاں سوار ہو گئے لیکن صاحبزادیاں اور ان کے کفیل سوار نہ ہو سکے۔ غازی آباد ہی بہ مایوسی و حیرانی ٹھہر گئے۔

جنازہ کی دیوبند آمد اور تدفین

ڈاکٹر صاحب کے نو بجے روانہ کئے ہوئے تار نے ساڑھے نو بجے اس مصیبت کبریٰ کی خبر پہنچا کر ایک قیامت قائم کر دی دم کے دم میں تمام شہر میں خبر پھیل گئی جس جگہ خبر سنی ایک سکتہ کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ کوئی شدتِ صدمہ سے مدہوش تھا کوئی بحالِ پریشان ساکت کھڑا تھا۔ حضرت مولانا کے مکان پر بہت لوگ جمع ہو گئے۔ اکابر دارالعلوم میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبند میں موجود تھے آپ کی تجویز سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے مزار پُر انوار کے قریب اور حضرت شیخ الہند کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے بالکل متصل اس فخر آباد واکابر کے لئے قبر تیار ہونے لگی اور یہ تمام مقبرہ جو نامی گرامی مُقدّس علماء و اولیا و صالحین اور صدہا غریب الوطن طلبہ اور نامی گرامی مدرسین کے قابل قدر اجساد سے معمور ہے ایک معزز مہمان کا انتظار کرنے لگا اور مُقدّس ارواح استقبال کے لئے تیار ہو گئیں۔ تمام دیوبند میں خصوصاً دیندار طبقہ میں آج گھر گھر ماتم تھا عورتیں اور بچے تک رنج و غم میں مبتلا تھے بہت سے گھروں میں اس رات کو کھانا نہیں پکا اور صدہا لوگوں نے اس وقت سے حضرت کے دفن ہونے تک ایک دانہ نہیں کھایا۔

مغرب کی نماز کے بعد بلا کسی تحریک و ترغیب کے محض جذبۂ الٰہی سے دیوبند کے تقریباً تمام مسلمان (اور بعض ہندو) انتہائی رنج و ملال کے ساتھ ایک حسرت و عبرت کا منظر دیکھنے اور اپنے مُقدّس مقتدا و پیشوا کے تابوت کا استقبال کرنے کے لئے حاضر ہو گئے۔ مالٹا سے حضرت کی تشریف آوری دیوبند میں دن کو ہوئی تھی اور کئی روز پہلے سے خبر مشہور ہو گئی تھی مگر اس قدر مجمع نہ تھا خدا جانے آج کہاں یہ کثرت ہو گئی تھی کہ مجمع کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

پورے وقت پر ساڑھے سات بجے گاڑی اسٹیشن پر پہنچی اس کے بعد کی حالت لکھنے کی نہ قلم میں طاقت ہے نہ زبان کو یارا۔ دروازہ کھلی ہوئی گاڑی میں حضرت کا تابوت نظر آتا تھا کہ اسٹیشن پر ایک کہرام مچ گیا۔ بے اختیار و بے قرار لوگ رونے تھے کسی کی

چیخ نکلتی تھی کوئی آہ کرتا تھا ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ اللہ اکبر کے نعرے جو فرحت و مسرت کے جوش کو دوبالا کر دیا کرتے ہیں آج بالکل مایوسی بخش اور بے موقع نظر آتے تھے آہ وہ مردِ خدا جو چار ماہ ہوئے تشریف آوری کے وقت اسٹیشن پر تبسم کر کے مصافحے کرتا تھا آج تابوت میں بے خبر سوتا ہے۔

اژدہام کی وجہ سے تابوت بمشکل تمام اسٹیشن سے باہر نکلا اور پھر دوبارہ ایک بیقراری اور جوشِ غم کا عالم طاری ہو گیا۔ مجمع کی کثرت سے انتظام قائم رکھنا دشوار تھا، اور جنازہ کو ہاتھ لگانا سخت مشکل جس کا ایک دفعہ ہاتھ پہنچ گیا وہ چھوڑنا ہی نہ چاہتا تھا بعض لوگ صرف ہاتھ لگانے کو غنیمت سمجھے ہوئے تھے اور بعض ضعفا محض ساتھ چلنے کو سعادت۔

اسٹیشن سے گزر کر جنگل کا راستہ ختم ہوا۔ شہر میں بازار کے راستہ سے جنازہ گزرا۔ تمام مجمع سے اسلامی شان و شوکت نظر آتی تھی اور تابوت سکینہ کا نمونہ معلوم ہوتا تھا دونوں اور چھتوں پر ہندو مسلمان بصد تعظیم بچشم پرنم بحسرت تمام کھڑے ہوئے تھے اژدہام کی وجہ سے راستہ بہت دیر میں قطع ہوا اور رفتہ رفتہ جنازہ حضرت کے مکان کی نشستگاہ کے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت مجمع اپنے جوش گریہ کو ضبط نہ کر سکا۔ آہ و بکا کی آواز بلند ہوئی لوگوں کے بدن پر لرزہ پڑ گیا۔

افسوس جس مکان میں شیخ الہند ہر وقت رونق افروز رہتے تھے اور پالکی میں سوار ہو کر لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے جس جگہ سے رخصت ہوئے تھے آج وہاں بالکل ساکت و صامت تابوت میں لیٹے ہوئے جامۂ کفن پہنے ہوئے آ رہے ہیں واحسرتا و واویلاہ۔

تابوت کاندھوں سے اتار کر سہ دری میں رکھا گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد جب لوگوں کا گریہ و زاری کم ہوا دفن کے متعلق گفتگو ہوئی قبر تیار ہو چکی تھی بعض حضرات کی رائے تھی کہ تعجیل مسنون و مستحب ہے ابھی دفن کرنا مناسب ہے دوسرے اصحاب زیادہ لوگوں کی شرکت کی سعادت نصیب ہونے کی مصلحت سے تاخیر پسند کرتے تھے چونکہ

صاحبزادیاں اور داماد غازی آباد میں گاڑی سے رہ گئے تھے جن کے رنج و صدمہ کا بہت خیال تھا اس لئے تاخیر ہی پر اتفاق ہُوا۔ اور بعد نماز صبح نماز جنازہ اور دفن کا اعلان کر دیا گیا۔

مکان آدمیوں سے بھرا ہُوا تھا کوئی جانا نہیں چاہتا تھا۔ بمشکل تمام اس عذر سے لوگوں کو رخصت کیا کہ اب مکان کی عورتیں آکر زیارت کریں گی۔ بمجبوری سب متفرق ہو گئے عشا کی نماز ادا کر کے بہت حضرات تسبیح و تہلیل و قرأت قرآن میں مصروف ہوئے بعض دن بھر کے تکان اور کوفت کی وجہ سے معذور ہو کر آرام کرنے لگے۔

صدہا مہمان جو دہلی وغیرہ سے جنازہ کے ساتھ صرف نماز کے لئے آئے تھے، اور ایک بجے کی گاڑی میں واپس ہو سکتے تھے وہ بھی صبح تک ٹھہرنے پر مجبور ہوئے اور دارالعلوم کے مکانات میں یا جس جگہ موقع ملا بہ رنج و غم کی رات کروٹیں لے کر بسر کر دی۔

رات کی گاڑیوں میں سہارنپور کی طرف سے بھی بہت لوگ شرکت نماز کے لئے حاضر ہو گئے اور صاحبزادیاں بھی دُوسری گاڑی سے دیوبند پہنچ گئیں۔

جنازہ کو تابوت سے نکال کر چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا۔ مخصُوص حضرات و خدام جنازہ کے گرد کلمہ طیبہ کا ذکر اور قرآن خوانی کرتے ہوئے تمام شب بیدار رہے۔

بیقراری اور بے چینی کی رات خُدا خُدا کر کے ختم ہُوئی نماز فجر کے بعد جُوق جُوق لوگ ہر طرف سے آنے شروع ہوئے مختصر مجمع کو ایک مرتبہ مکان پر چہرہ کھول کر زیارت کرائی گئی۔ جنازہ اُٹھایا گیا اور مولانا اپنی نشستگاہ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے لگے۔ در و دیوار زبانِ حال سے الوداع والفراق پکار کر دم میں بے رونق ہو گئے

حضرت کے مکان سے دارالعلوم تک گلی کوچے آدمیوں سے بھرے ہُوئے تھے بمشکل تمام آہستہ آہستہ جنازہ دارالعلوم میں پہنچا اور صحن میں رکھ دیا گیا۔ مجمع کثیر تھا اور ہر شخص شوقِ زیارت میں بے تاب ہو کر ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا۔ کوئی تدبیر خیال میں نہ آتی تھی کہ بسہولت زیارت ہو جائے نہ یہ گوارا ہوتا تھا کہ آخری نظارہ کی حسرت سب دل میں لئے ہوئے محرُوم رہ جائیں بہت دیر کے بعد یہ تدبیر کی گئی کہ غربی جانب

کی درسگاہ متصل نودرہ یعنی قدیم دفتر و کتبخانہ کے کمرہ میں جنازہ رکھ کر چہرہ کھول دیا گیا درسگاہ نودرہ کے پاس سے لوگ داخل ہوکر زیارت کرتے تھے اور جدید دروازہ سے دارالحدیث کی طرف نکل جاتے تھے۔

اگرچہ انتظام مناسب تھا لیکن اس آمد و رفت میں بہت زیادہ تاخیر ہوتی جاتی تھی بہ مجبوری بہت سے لوگوں کو محروم و مشتاق چھوڑنا پڑا اور جنازہ اٹھا کر درس گاہ نودرہ کے درمیانی کمرہ میں (جس جگہ حضرت نے تمام عمر حدیث شریف کا درس دیا ہے) رکھا گیا۔ نودرہ اور باہر صحن مدرسہ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہ مشکل تمام صف بندی ہوئی اور حضرت کے ولیٔ اقرب اور برادر اور عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب (جنہوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی) با قلب مضطر و چشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے تمام مجمع پر ایک پُرکیف سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت و نورانیت مشاہد ہو رہی تھی خواہ اس کو جذبات حسرت سمجھئے یا واقعیت و حقیقت۔

نماز ختم ہوئی اور اس مکان نے جس کو مولانا ہی کے ذات کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ نے دارالعلوم و دارالحدیث کے مرتبہ پر پہنچایا ہے اور جہاں مولانا نے چالیس برس علوم نبویہ کے اضافہ و اشاعت میں گزارے تھے۔ آخری الوداع کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کل شیٔ ھالک الا وجھہ۔ لہ الحکم والیہ ترجعون۔ ؎

روتا ہے باغباں در گلشن پہ زار زار
یعنی چمن سے ہوتی ہے رخصت بہار آج

علماء و صلحاء زہاد اور صالحین، معتقدین کے سروں اور ہاتھوں پہ جنازہ اٹھا اور چشم زدن میں مدرسہ کے دروازہ سے نکل گیا۔ دارالعلوم خالی ہوگیا۔ ہر طرف اداسی چھاگئی اور حسرت و مایوسی برسنے لگی۔ افسوس ؎

مدرسہ میں پڑ رہا ہے آج کیسا زلزلہ
قاسم الخیرات کا ثانی اٹھا جاتا ہے آج
باغباں رخصت ہوا گلزار سونا ہوگیا
رونقِ دارالحدیث و مدرسہ جاتا ہے آج
گونجتا تھا جس کی تقریروں سے سارا مدرسہ
وہ مقرر ساکت و صامت چلا جاتا ہے آج

مدتوں روئیگا جس کو آپ کا دار العلوم ہائے اُستاذِ علومِ انبیا جاتا ہے آج
آپ کیا جانتے ہیں جاتی ہے بہارِ مدرسہ عالمِ فانی سے سب نور و ضیا جاتا ہے آج
آئے ہیں لینے رشید و قاسم امداد ور فیع سوئے جنت سرپرستِ مدرسہ جاتا ہے آج
کون سکھلائے گا اب ہم کو علوم انبیا عالمِ علمِ حدیثِ مصطفےٰ جاتا ہے آج
ان کے جانے سے مٹی جاتی ہیں پہلی صورتیں وہ رشیدی قاسمی نقشہ مٹا جاتا ہے آج
بیکسی دیکھی نہیں جاتی ترے خدام کی بیقراری سے کلیجہ شق ہُوا جاتا ہے آج
سخت جانی ہے اگر جیتے رہے تو کیا جیئے زندگی کا لطف جینے کا مزا جاتا ہے آج
یاد کرتا تھا اسیر مالٹا کو مالٹا لیجیئے ہندوستاں خالی ہوا جاتا ہے آج
قیدِ ہستی سے رہا ہو کر بصد فرح و سرور ثانیٔ قاسم اسیرِ مالٹا جاتا ہے آج
جس کے دم سے کل تلک گلزار تھا اپنا وطن چھوڑ کر بستی سوئے صحرا چلا جاتا ہے آج
دفن ہوتا ہے زمیں میں آج وہ شمس العلوم تیرہ و تاریک اک عالم ہُوا جاتا ہے آج

اہلِ عالم آج کیوں چھوٹے بڑے ہیں اشکبار
مرشدِ کامل ولی رہنما جاتا ہے آج

دیوبند میں آج تک بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر مجمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازے سے قبرستان تک آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا ہر شخص کو شوق تھا کہ جنازہ اٹھانے کی سعادت نصیب ہو لیکن مجمع کی کثرت نے اس کو دشوار کر دیا تھا بمشکل تمام چارپائی یا چادر کو ہاتھ لگانے کا موقع ملتا تھا۔

مقبرہ مدرسہ سے کچھ دُور نہیں، چند ہی منٹ میں جنازہ مقبرہ میں پہنچا اور بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دُنیا کی کشاکشی سے استراحت کے لئے یہ شاگرد و فخرِ اُستاد اپنے مقدس مرشد و استاد کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ قبر تیار تھی جنازہ قریب لاکر رکھا گیا۔ مولینا حکیم محمد حسن صاحب اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اُترے چاشت کا وقت تھا نو بجے تھے کہ قدوۃ الواصلین قسلبِ عالمِ علوم و کمالاتِ مجسم کو لحد میں اُتارا اور مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ کا منظر پیشِ نظر

ہوگیا۔ باوجود صبر و ضبط کے بیقراروں کے گریہ وزاری اور آہ ونالہ کی آوازیں بے اختیار بلند ہوگئیں۔ اور ایک غمزدہ کی زبان سے بھرائی ہوئی آواز میں یہ شعر نکل گیا ؎

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو گنجینۂ علوم ہے یہ گنج زر نہیں[1]

وَلِلّٰہِ درمن قال ؎

وکیفما سترو ہ فی التراب وما
یکون للشمس من ستر و تدفین

بطرز مسنون خشتِ خام لگا کر لحد بند کردی گئی۔ وہ نورانی صورت ہمیشہ کے لئے نظروں سے پوشیدہ ہوگئی اور ستر برس افاضۂ انوار کرنے کے بعد آفتاب رشد وہدایت غروب ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ط

ہر شخص بحال زار حیران کھڑا تھا نظروں میں دُنیا تاریک نظر آتی تھی بالآخر حسب دستور قبر خام ڈیڑھ بالشت اونچی بنائی گئی اور سب لوگ دُعا کے بعد خالی ہاتھ جھاڑتے ہوئے کفِ افسوس ملتے ہوئے بچشم گریاں واپس ہوئے۔ وللّٰہ درمن قال کانہ یرثیہ ؎

شمع انجمع شد و محفل ما شد تاریک — رفت خود زیر زمین ارض وسما شد تاریک
ہادی ما بشد و راہِ ہدیٰ شد تاریک — خانۂ شرع و طریقت بخدا شد تاریک
بعد از وکیست کہ زین سان غم اسلام خورد — فکر ایام کہنہ یا غم ناکام خورد
اے غم غمزدگان ہیچ نخوردی رفتی — رحم بر خستہ دلاں ہیچ نکردی رفتی
گرم چو شبیت چنیں بود بسروی رفتہ — چست وچالاک کنوں راہ نوردی رفتی
عجب از خلق کریم تو کہ بے ما رفتی — دوستاں با تو کمر بستہ و تنہا رفتی
جان ما بے تو بجا نیم تو بے ما چونی — شہر وحشت کدہ شد بے تو بہ صحرا چونی
اے کہ خورسند بما بودہ تنہا چونی — در تہِ خاک بگو اے گل رعنا چونی
جامۂ علم و عمل بر قد زیبائے تو راست — خلعتِ فکر بیالائے نکو بیت زیباست

---

[1] کسی نے کیا خوب کہا ہے میرے ممدوح کو کس طرح مٹی میں چھپا رہے ہے حالانکہ آفتاب کو نہ پردوں میں چھپاتے ہیں نہ دفن کرتے ہیں۔

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر چھوڑ کر سب کو | چھپا چاہِ لحد میں وائے قسمت ماہ کنعانی
جو تھا موصل الی اللہ ہوگیا واصل بحق ہے ہے | پھریں ہیں ڈھونڈتے سرگشتگان تیہ حیرانی
زمانے نے دیا اسلام کو داغ اس کی فرقت کا | کہ تھا داغ غلامی جس کا تمنائے مسلمانی
نہیں ہے سینۂ مجروح کم گنج شہیداں سے | تمنائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہے سب کی قربانی
فضائلہائے شتی ہیں سے کوئی ایک کھلاتے | کئے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی
فقط اک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ | بخاری و غزالی بصری و شبلی و نعمانی

جنہیں چھوڑا تھا ہم پر حضرت امداد و قاسم نے
کریگا کون ان سب بیکسوں کی ہائے چوپانی

افسوس بخاری زمانہ اُٹھ گیا ابو حنیفۂ ثانی رخصت ہوگیا۔ مسلمانوں کا مسلمہ شیخ الہند چل بسا۔ قافلۂ علماء و طلبہ کا قافلہ سالار کوچ کر گیا۔ موجودہ مسلمانوں کا افضل الناس منتند دارالبقا کو چلا گیا۔ دنیا بہترین شیخ الحدیث سے خالی ہوگئی۔ حضرت مولانا کی موت کوئی معمولی موت نہیں۔ سلف صالحین اور اولیائے کرام کی موت کا نمونہ ہے جس سے بلا مبالغہ سرزمین ہند میں ایک معنوی زلزلہ پڑ گیا ؎

لَا تَحْسَبُوهُ مَاتَ شَخْصٌ وَاحِدٌ | فَمَا كَانَ شَيْخٌ حَتْفُهُ حَتْفَ وَاحِدٍ
فَمَاتَ كُلُّ الْعَالَمِيْنَ مَمَاتُهُ | وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

سانحۂ وفات کا اثر عام مسلمانوں پر

حضرت کی وفات سے دارالعلوم دیوبند کا سرتاج اُٹھ گیا۔ یہ اسلامی کارخانہ بے سرپرست رہ گیا۔ ارکان منتظمین کا پُشت پناہ ماوا و ملجا جاتا رہا۔ طلبہ و مدرسین بےکس و یتیم ہوگئے۔ دیوبند کی شان و عظمت و رونق جاتی رہی۔ لطف خداوندی کا وہ مجسم سایہ اُٹھ گیا۔ آپ کی وفات سے عام اہلِ اسلام کو نہایت ناموافق زمانہ میں نقصانِ عظیم پہنچا۔ تحریک خلافت میں ابتری اور فتور آجانے اور لوگوں کی کمرِ ہمت ٹوٹ جانیکا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ مگر خدا کے فضل سے اُمید ہے کہ مسلمان صبر و سکون کے ساتھ

ثابت قدم رہیں گے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی کھوئی ہوئی قوت پالینے کی کوشش کریں گے ؎

فتی عیش فی معروفہ بعد موتہ کما کان بعد السیل مجراہ مرتعا

دفن سے فراغت کرنے کے بعد دوپہر تک اکثر مہمان رخصت ہوگئے۔ فصلِ بہار ہو چکی۔ گل نہ رہا۔ بلبلیں اڑ گئیں۔ چمن سونا ہوگیا۔ جو کچھ ہونا تھا ہوگیا۔ قَضَاءُ اللّٰہِ غَالِبٌ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ ویحکم مایرید دم مارنے کی جگہ نہیں کیا تھا اور کیا ہوگیا ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

مولانا محمد علی جوہر کی دیوبند آمد

فخرِ قوم مشہور لیڈر مولانا محمد علی صاحب وفات کی خبر پر دیوبند تشریف لے آئے تھے ابتداء سے انتہا تک بچشم پرنم شریکِ مجمع رہے ظہر کے بعد دارالعلوم کی مسجد میں تقریر فرمائی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اوصافِ حسنہ بیان کر کے غمزدہ قلوب کو بے قرار کیا اور حضرت کے اتباع اور تخلق بالاخلاق کی تاکید کی۔

شام کو منڈی میں ہندو مسلمانوں کے عام جلسہ میں تقریر فرمائی اور شب کو رخصت ہوگئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا ممدوح سے نہایت انس تھا ان کو اپنے مقصد کا ممد و معاون اور اپنا دست و بازو سمجھتے تھے شدتِ مرض میں بھی باعزاز و احترام تعظیم و معانقہ کے لئے ہاتھ پھیلا دیتے تھے۔

وقتِ وفات سے اس وقت تک جابجا متفرق طور پر ہر شخص بقدرِ طاقت ایصالِ ثواب کر رہا تھا اور شدتِ غم و رنج اور مشغولی تجہیز و تکفین میں موقع کسی عام اجتماع کا نہ ہوا تھا دفن سے اگلے روز پنجشنبہ کو دارالعلوم میں طلبہ و علما جمع ہوئے۔ نہایت شوق اور خلوصِ قلبی سے ایک لاکھ پچیس ہزار کلمہ شریف کا ختم تین مرتبہ ہوا، اور باترتیب قرآن مجید پچیس پڑھے گئے۔ متفرق پڑھنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ اسی

طرح جمعہ اور شنبہ کے روز بھی دارالعلوم میں اجتماع ہوتا رہا اور مختلف اوقات میں بھی متفرق لوگ اپنی سعادت سمجھکر ایصال ثواب میں کوشاں رہے۔

یکشنبہ کو جامع مسجد میں بعد نماز صبح شہر کے عام مسلمان اور دارالعلوم کے تمام طلبہ و مدرسین و متعلقین جمع ہوئے۔ اکثر لوگ قرآن شریف پڑھتے رہے اور کچھ آدمی کلمۂ طیب۔ اس طرح باقاعدہ ترتیب وار بیس قرآن مجید ختم ہوئے اور مختلف لوگوں نے بلا ترتیب بھی بکثرت حفظ اور ناظرہ پڑھا اور کلمہ شریف کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ دس بجے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کی مختصر پُر درد تقریر کے بعد ایصال ثواب اور دُعا ہو کر جلسہ ختم ہُوا۔

بعد ازاں بھی تنہا تنہا اور اجتماع کر کے دارالعلوم میں طلبہ و مدرسین ایصال ثواب کرتے رہے اور اب بھی کرتے ہیں اور انشاءاللہ تعالیٰ عمر بھر کرتے رہیں گے۔

یہ دیوبند کا حال تھا۔ اور تمام ہندوستان میں (سوائے بعض دیسی ریاستوں کے) جس جگہ تھوڑے سے بھی مسلمان آباد تھے۔ ہر ہر شہر اور قریہ میں اسی طرح مجمع کر کے کلام مجید اور کلمۂ طیبہ کا ایصال ثواب کیا گیا۔ اخبارات دیکھنے والے حضرات جانتے ہیں۔ کہ ایسے ایسے غیر مشہور مقامات میں کہ جن کا کبھی نام بھی نہ سُنا تھا بلا کسی مرکزی تحریک کے خود بخود مسلمانوں نے اجتماع کر کے ایصال ثواب کیا۔ ہندوستان میں ہزاروں اولیاء اللہ، علماء مشائخ محدثین کی وفات ہوئی۔ عالم میں زلزلہ پڑ گیا۔ لیکن امید نہیں کہ کبھی کسی بزرگ کے لئے اس قدر ایصال ثواب ہُوا ہو۔

عمّت فضائله فعمّ مصابه
فالنّاس فيه كلهم ماجور

بلا مبالغہ ہزارہا کلام مجید کا ثواب پہنچایا گیا اور صدہا ختم کلمۂ طیبہ کے ہُوئے اس میں شک نہیں کہ خلافت کمیٹیوں کے جابجا قیام کو بھی اس عام ایصال ثواب میں بہت دخل ہے لیکن اصلی اور حقیقی محرک حضرت مولانا کی وُہ خداداد عام عقیدت و محبت ہے جو قلوب میں جاگزین تھی۔ سچ ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔

ہندوستان کے اکثر بڑے اور چھوٹے شہروں میں عام ہندو مسلمانوں نے اظہار رنج کے جلسے منعقد کئے تقریریں ہوئیں اور عرصہ تک عام قلوب میں حزن و ملال رہا۔

مضیٰ شیخ ھند حین لم یبق مشرق ولا مغرب الّا لہ فیہ مادح

موت اہل دل کی زندگی جاوداں ہوئی برسوں ہر ایک بزم میں ذکرِ وفا رہا

حضرت قدس سرہٗ کے عزیز و اقارب اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحبان کی خدمت میں بہت سے تار ہزاروں خطوط تعزیت کے آئے۔ اخباروں نے مختصر اور طویل مضامین میں حضرت کی وفات اور اسلامی خدمات کا بعنوان شائستہ ذکر کیا۔ اخباروں میں عرصہ تک قطعات تاریخ شائع ہوتے رہے علوم دینیہ کا نشر و اشاعت کرنیوالے مدارس ہندوستان کے مہتمم و مدرس صاحبان اکثر حضرت ہی کے بلاواسطہ یا بالواسطہ تلمیذ یا خادم ہیں اِلّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔ اس لئے اس قسم کے تمام مدارس میں حزن و ملال کی وجہ سے چند روز کے لئے تعطیل ہوگئی دارالعلوم دیوبند میں نہ تو کسی کا پڑھنے کو دل چاہتا تھا نہ پڑھانے کو۔ ایک عام اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ آہ سہ

بزم علم و ندلہ سنجی گشت برہم یک بیک ساقی از محفل شد و بشکستہ شد جام و سبو

محفل علم و ادب شد بے نمک از رفتنش کام جاں شد بے مزہ از تلخیٔ ہجران او

اکثر اہل مدرسہ تنہائی میں قرآن مجید پڑھ کر ایصال ثواب کرتے یا باہم بیٹھ کر حضرت کے کمالات کے تذکرے کرتے رہتے جو کچھ کام کرتے تھے وہ بدرجۂ ضرورت و مجبوری۔ حضرت مولانا رُوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ میں پہنچ گئے اور جماعت مقربین میں جاکر شامل ہوگئے مگر (بقول ایک متبرک بزرگ کے) ہم کو تو اپنی بیکسی اور درماندگی پر حسرت اور اس کا رونا ہے۔ ہائے جس سچے ہادی نے ہماری ہدایت میں توجہ تام اور جد و جہد مالا کلام مبذول فرمائی اور جملہ مضار دینی و دنیوی اور ہر مصیبت و کلفت میں میں اپنی مقبول دعا اور توجہ و عنایت سے ہماری دستگیری اور پشت پناہی اور اعانت و تسلی میں دقیقہ نہ چھوڑا آج اس طبیب روحانی کے مرضِ مفارقت میں کس

سے چارہ جوئی کی توقع کریں اور کس سے اُن نقصانات و حوائج کے جبر و انسداد کی کی توقع رکھیں ؎

اس نورِ چشمِ فضل کو کیونکر نہ روئیے — آنکھوں میں رہو سے اب کوئی ایسا نہیں رہا
دامن پکڑ کے روتے نہ کیوں ایک ایک کا — جب چھوڑ جاتے بیکس و تنہا ہمیں قضا

اولاد وغیرہ اور بعض دیگر حالات

جیسا کہ ابتداء میں تحریر ہوا ہے حضرت مولانا ۱۲۶۸ھ میں عالم ظہور میں تشریف لائے اور ۱۳۴۵ھ میں آپ کے ظاہری فیوض سے دنیا محروم ہوئی۔ اس حساب سے آپ نے اکہتر سال کی عمر پائی۔ بائیس سال کی عمر میں محترم والد ماجد نے اپنے ہمسر اور معزز شریف خاندان میں اس زمانہ کے متوسط الحال رئیس منشی فہیم الدین صاحب کی صاحبزادی سے اپنی عزت و وجاہت کے شایانِ شان انتظام و اہتمام سے حضرت مولانا کی شادی کر دی، ادھر اہلیہ صاحبہ کی دانائی اور انتظام، مزاج شناسی اور اطاعت ادھر حضرت کی دینداری، طہارت اخلاق، حقوق شناسی اور حسن معاشرت تمام عمر نہایت اتفاق و راحت سے بسر ہوئی اور حضرت مولانا کو امور دنیاوی اور ضروریات زندگی کے تفکرات میں پڑنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ کامل پچاس سال کی معیت کے بعد حضرت کی وفات سے صرف چار ماہ پہلے (جنت میں سامان راحت انجام دینے کے لئے) دنیا سے رحلت فرمائی (جس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں)۔

یوں تو تمام خدام کو آپ کی روحانی اولاد ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن نسبی تعلق سے قابل ذکر اولاد صرف آپ کی چند صاحبزادیاں ہیں اولاد کی تعداد و اصناف اگرچہ غیر اختیاری ہے لیکن حق تعالیٰ نے حضرت مولانا کو اس میں بھی اتباع سنت نصیب کیا تھا یعنی ابتداء میں ایک صاحبزادے اور کئی صاحبزادیوں کا بہت چھوٹی عمر میں انتقال ہوگیا۔ صرف چار صاحبزادیاں بڑی ہوئیں جن کی شادیاں اور نکاح ہوئے۔

چار صاحبزادیاں

پہلی صاحبزادی کا نکاح حضرت کے بڑے بھانجے مولوی محمد حنیف صاحب سے ہوا۔ کئی بچے صغیر سن انتقال کر گئے۔ پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے عثمان اور پیارے دو فرزند اور ایک لڑکی خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ حضرت نے شادی کے بعد ان صاحبزادی کو اپنے مکان ہی پر رکھ لیا تھا۔ اور مولوی محمد حنیف صاحب کو مثل بیٹے کے سمجھتے رہے یہ صاحبزادی حضرت کے سفر اور نظر بندی سے پہلے انتقال فرما گئی تھیں حضرت ان کی آخری بیماری میں نہایت پریشان اور غمگین نظر آتے تھے لیکن وفات کے بعد ایک عجیب سکون ہو گیا تھا۔ اگرچہ قلبی رنج و الم کچھ کم نہ تھا۔ صاحبزادی کی وفات کے بعد بھی حضرت کی شفقت داماد اور نواسوں پر بدستور رہی۔ اور نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی ان کو معہ اہل و عیال اپنے مکان پر شریک حال رکھا اور سعادت مند بھانجے نے بھی اخیر عمر تک حضرت کو اپنے نیاز مندانہ طرز سے خوشنود رکھ کر دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کی۔

دوسری صاحبزادی کی شادی حضرت کے چچازاد بھتیجے مولوی حافظ محمد شفیع صاحب مدرس دہلی مدرسہ اسلامیہ عبدالرب سے ہوئی۔ یہ صاحبزادی بھی بفضلہ تعالیٰ صاحب اولاد ہیں۔ مولوی محمد رفیع اور چند لڑکیاں موجود ہیں حضرت کی وفات کے حالات میں غازی آباد کے اسٹیشن پر انہیں صاحبزادی کے ریل سے رہ جانے کا ذکر ہوا ہے۔

تیسری صاحبزادی کے شوہر حضرت مولانا کے قریب محلہ ابوالمعالی کے رہنے والے منشی محمد قاسم صاحب ہیں یہ اگرچہ باضابطہ مولوی نہیں۔ مگر اپنی صلاحیت و دینداری اور حضرت کی اطاعت و طلب رضا میں عالموں سے کم نہیں۔

چوتھی اور سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت مولانا کے بھانجے اور مولوی محمد حنیف صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی قاضی مسعود احمد صاحب (حال نائب مفتی دارالعلوم دیوبند) سے منسوب ہوئیں اور شادی ہونے کے بعد اکثر حضرت ہی کے مکان پر رہ کر والدہ صاحبہ کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں۔ اور ان کے شوہر بھی اپنی قابل

تعظیم خوشدامن اور ممانی صاحبہ کی خدمت واطاعت بہترین اولاد کی طرح کرتے رہے جس سے حضرت مولانا کی خوشنودی مزاج میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

کمال ایمان اور طریقۂ انبیاء علیہم السّلام یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت کے تابع ہو کر ہر ایک مستحق سے اس کے درجہ کی محبت ہو۔ حضرت کو صاحبزادیوں سے نہایت محبت تھی اور نواسوں پر بے انتہا پیار۔ محمدؐ رفیع اور پیارا جب تک بچے تھے یہی ہر وقت مورد شفقت رہتے تھے اب وہ بفضلہ تعالیٰ جوان ہیں عثمان چونکہ سب سے چھوٹا اور ابھی بچہ ہے آخری زمانہ میں اسپر زیادہ شفقت تھی۔ وہ بھی ہر وقت اَبّا اَبّا کہتا رہتا تھا۔ اور حضرت بھی خدا جانے دن میں کتنی مرتبہ عثمان، عثمان پکارتے تھے۔ اور کبھی باتباعِ سنّت اس کو پیار میں پاجی کہتے تھے نواسوں کی طفلانہ حرکات کا ہنس کر ذکر فرماتے۔ عثمان کی شوخی و شرارت کو بیان کرتے کبھی انہیں باتوں سے علمی پہلو واضح فرما دیتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ "لکھا کرتے ہیں کہ وضو امر تعبدی ہے اس میں قیاس کو دخل نہیں۔ آج اس نے (پیارے نے) خوب وضو کیا کپڑے پہنے اور اسی وقت پیشاب کے لئے بیٹھ گیا سب نے کہا تیرا وضو جاتا رہا تو خفا ہو کر کہتا ہے کہ واہ میں نے تو پیشاب کیا ہے۔ ہاتھ منہ تو ویسے ہی دھلے ہوئے ہیں۔ ابھی خشک بھی نہیں ہوئے وضو کیسے ٹوٹ گیا۔

مالٹا سے صاحبزادیوں اور ان کی اولاد کو نام بنام دعا پیار مضامین شفقت تسلّی آمیز جملے تحریر فرماتے۔ مرحومہ صاحبزادی کے لئے ایصال ثواب کی گھر میں تاکید تحریر فرماتے اور عالم آخرت کو یاد دلاتے۔

صاحبزادیوں نے اپنی محترمہ والدہ کی طویل علالت میں پوری خدمت کی۔ اور مالٹا سے تشریف آوری کے بعد جب حضرت فتحپور مسوہ اور لکھنؤ وغیرہ کے سفر سے واپس ہوئے تو روزانہ مہمانوں کی مہمانداری بھی انہیں صاحبزادیوں کے حسنِ انتظام سے خوب ہوتی رہی حضرت کی وفات کے بعد بھی صاحبزادیاں عرصہ تک حضرت ہی کے مکان پر رہیں اور خاص خدام اور رفقا اور تعزیت کے لئے حاضر ہونے والے

لوگوں کی تواضع و مدارات میں قصور نہ آنے دیا۔ اب بھی چھوٹی صاحبزادی (اہلیہ مولوی قاضی مفتی مسعود احمد صاحب حضرت کے مکان پر رہتی ہیں جن کی وجہ سے حضرت کے نام سے آنیوالے خادموں کو راحت کا ٹھکانا اور دو گھڑی اشک حسرت بہانے کا موقع مل جاتا ہے۔

شادیوں کے موقعہ پر سادگی اور اتباع سنت کا اہتمام

حضرت مولانا نے ان چاروں صاحبزادیوں کی شادی اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر ایسی ہی سادگی اور اتباع سنت سے کی جو حضرت جیسے محدث اعظم اور عاشق سنت کے شایان شان تھی کبھی جامع مسجد میں نماز کے بعد اعلان کر کے داماد کو بٹھلا کر نکاح پڑھ دیا۔ کبھی مدرسہ میں علماء طلبہ کے مجمع میں بطریق مسنون عقد کر دیا۔ اور معمولی کپڑے پہنا کر معمولی ڈولی میں بٹھلا کر لڑکی کو رخصت کر دیا۔

موقع بموقع ان کے ساتھ احسان وسلوک فرماتے تھے اور بعض لڑکیوں کو شادی کے وقت بھی کچھ ضروری چیزیں عطا فرمائیں لیکن دنیاوی رسوم کا کہیں نام و نشان نہ تھا حضرت نے شادیاں کیا کیں دوسروں کو عملی سبق پڑھا دیا۔ حضرت مولانا اور آپ کے مقدس استاد ہی کی برکت ہے کہ دیوبند میں عموماً اور حضرت کے اقارب اور برادری میں خصوصاً صدہا رسوم چھوٹ کر شادیاں بالکل بقاعدۂ شرعیہ ہونے لگیں حضرت کی برابر سادگی اور اتباع سنت تو مشکل ہے تاہم اسقدر اصلاح ہوگئی ہے کہ دوسرے مقامات کے مہمان دیکھ کر حیران ہوتے ہیں اور اپنے دیار کی رسوم اور ان کی دقتوں اور مضر نتائج پر حسرت و افسوس کرتے ہیں۔

حضرت کی عام گھریلو زندگی اور ہر فعل میں اتباع سنت کا اہتمام

حضرت تمام عمر مصداق وضع لِبنَةً علیٰ لَبِنَةٍ کے مصداق رہے نہ کوئی

تعمیر کرائی نہ کوئی مکان بنایا والد ماجد کے تعمیر فرمودہ پختہ مکانات موجود تھے انہیں میں سکونت رہی ۔ البتہ مالٹا سے واپس تشریف لا کر گھر میں باورچی خانہ کی انتہائی تکلیف دیکھ کر پھونس کے چھپر ڈلوانے کا قصد فرمایا لیکن خدام و حاضرین خدمت نے سمجھایا کہ حضرت آج کل چھپروں میں ضرر زیادہ ہے اور آگ لگ جانے کا اندیشہ رہتا ہے آگ بھی نہ لگے تو تیسرے سال گل ضرور جاتا ہے ۔ اس لئے بعجلت تمام اینٹوں کی نہایت ہی سادہ اور معمولی تعمیر کرادی تھی ۔

خود ابتدائی عمر میں اپنے مکان میں رہتے تھے پھر عرصہ دراز تک اپنے مکان کے قریب مسجد کے حجرے میں مطالعہ وکتب بینی و عبادت الٰہی میں مصروف رہتے ۱۲۱۷ھ میں جبکہ سنن ابی داؤد کی تصحیح کر رہے تھے ۔ مدرسہ کے قریب چھتہ کی مسجد کے بڑے حجرے میں (یہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، اور مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے بزرگان کا عرصہ تک دارالاقامت رہا ہے) آپ نے قیام فرمایا پھر آخر زمانہ میں اپنے والد ماجد کے تعمیر کردہ مردانہ مکان میں مستقل اقامت فرمائی تھی اس میں اگرچہ دوسرے بھائیوں کے بھی حصے تھے لیکن حضرت کی حیات میں وہ سب حضرت ہی کے مہمانوں اور خادموں کے استعمال و تصرف میں رہے اور بھائیوں نے اس کو بہ طیب خاطر پسند فرمایا ۔ بلکہ اس کو اپنے لئے باعث اجر و فخر سمجھا ۔

کھانے پینے میں سادگی

اپنے خورد و نوش میں حضرت مولانا نے تمام عمر کبھی تکلف و اہتمام نہیں فرمایا ۔ کھانا وقت پر جیسا موجود ہوا نہایت شوق و رغبت سے تناول فرمایا ۔ مکان پر اور دعوتوں وغیرہ میں اگر عمدہ سے عمدہ کھانا ہوتا تو اس کو بھی بلا تکلف کھا لیتے نہ کچھ زیادہ اظہار رغبت سے تناول فرماتے کہ دیکھنے والے کو گمان ہوتا کہ مولانا کو یہ چیز نہایت مرغوب ہے ۔

مکان کے اندر کھانا کھانے کا اگر کبھی اتفاق ہوا تو بلا کسی اعتبار کے بے تکلف

کسی جگہ بیٹھ کر (بلکہ بعض دفعہ چولھے کے قریب اوکڑوں بیٹھ کر) کھانا کھا لیتے۔ مجمع میں سب کی ساتھ شروع فرماتے مگر ایسی طرح کھاتے کہ سب کے بعد تک کھاتے رہتے۔ اور کان آخرھم اکلاً کا نمونہ دکھلا دیتے کبھی ذرا سا شوربا پی لیا کبھی دال یا چٹنی چاٹ لی کبھی گوشت اٹھا لیا۔ سرسری نظر میں کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا تھا کہ بہت کم کھایا ہے البتہ خیال اور بغور سے دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ ابھی ایک روٹی بھی تمام نظر نہیں ہوئی۔

قرآن مجید اور احادیث سے جن چیزوں کی فضیلت اور تعریف ثابت ہوتی ان کو بہت کثرت سے استعمال فرماتے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سرکہ کو نعم الادام (عمدہ سالن) فرمایا گیا ہے اس لئے سرکہ یا چٹنی اگر دسترخوان پر ہوتا تو سب چیزوں سے زیادہ اس کی طرف توجہ فرماتے بلکہ بعض دفعہ لگا کر ایک دو ریزہ نوش فرما لیتے۔ ایک مرتبہ مادہ سوداوی کی تکلیف میں مبتلا ہوئے۔ بدن پر پھنسیاں اور بغل میں دنبل نہایت تکلیف دے رہے تھے اطبا سرکہ سے منع کرتے تھے مگر مولانا کبھی کبھی ذرا سا استعمال کر ہی لیتے تھے۔

لحم کو جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطیب الطعام (بہترین کھانا) فرمایا ہے اس لئے مولانا گوشت کو بہت پسند فرماتے۔ معمولی گوشت کے علاوہ جوانی میں خود شکار کرتے اور آخری عمر میں دوسروں کے شکار کئے ہوئے گوشت میں سے لیتے اور کھاتے۔ اگرچہ بہت زیادہ نہ کھاتے تھے مگر بہت رغبت و شوق سے قربانی کے لحم کو دعوت رب العالمین سمجھ کر دن میں کئی کئی مرتبہ تناول فرماتے اور حاضرین کو کھلاتے اور اسی کے باریک پارچے نمک لگا کر دھوپ میں خشک کرا کے رکھ لیتے پھر کبھی کبھی انگیٹھی پر سینک سینک کر خود کھاتے اور اپنے خدام کو کھلاتے جاتے۔ الٹا میں باقاعدہ حلال ذبیحہ کا گوشت نہ ملنے سے عرصہ تک گوشت کھانے کا اتفاق نہ ہوا مگر پھر زندہ خرگوش خرید کر رفقا و خدام ذبح کرتے اور کھاتے پکاتے تھے۔

کوئی شخص تحفہ میں شہد پیش کرتا بہت خوشی سے قبول فرماتے اور مختلف

طریقوں سے استعمال فرماتے کیوں نہ ہو خود حق تعالیٰ اس کی نسبت فیہ شفاءٌ
للناس فرماتے ہیں۔ آب زمزم کا تبرک نہایت قلبی فرحت سے قبول فرماتے
اور اہتمام سے منگاتے کبھی کبھی مولانا حسین احمد صاحب وغیرہ خدام مدینہ کے بڑے
بڑے ڈبوں اور کنستروں میں آب زمزم بھر کر بھیجدیتے اور حضرت بار بار احترام اور
رغبت سے نوش فرماتے حاضرین و زائرین کو عطا فرماتے۔

جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر شام میں پنیر تناول فرمایا تھا حضرت
مولانا کے مرغوبات میں داخل تھا خصوصاً مکہ معظمہ کا بنا ہوا۔ مزاج شناس اہتمام سے
خرید کر ہمراہ لاتے یا کسی آنے والے کے ہاتھ بھیجتے۔ زیتون کے درخت کو ایک جگہ
نعمتہائے خداوندی میں شمار کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ شجرۃً
تخرج من طور سیناء تنبت بالدھن وصبغ الاکلین۔ دوسری جگہ
ارشاد ہے من شجرۃٍ مبارکۃٍ زیتونۃٍ۔ یہ درخت سدہا برس پھل دیتا رہتا
ہے اور درختوں میں زیتون ایسی کثیر المنافع چیز ہے جیسے چارپایوں میں اونٹ۔
یہی وجہ ہے کہ دونوں کا خدا تعالیٰ نے خاص طور سے ذکر فرمایا ہے کوئی جز اس کا
بیکار نہیں اس کا تیل روشنی کے لئے جلایا جاتا ہے سالن کی طرح روٹی سے کھایا جاتا
ہے۔ دواؤں میں استعمال ہوتا ہے بدن پر ملا جاتا ہے چمڑے کی دباغت میں کام
آتا ہے۔ تیل کی کھلی چوپایوں کو کھلانے میں اور لکڑی جلانے میں کام آتی ہے۔ راکھ
بھی بیکار نہیں جاتی بلکہ ریشم کو صاف کرنے اور دھونے میں استعمال کی جاتی ہے۔
مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ درخت دنیا میں سب سے پہلے اُگا ہے اور بڑے بڑے
ستر انبیاء نے اس کے لئے دعا فرمائی ہے یہاں تک کہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ بارک فی الزیتِ والزیتونِ (یا خداوند
تعالیٰ زیتون کے تیل اور درخت میں برکت عطا فرما)۔

---

[۱] یعنی حق تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک وہ درخت پیدا کیا جو کہ کوہ طور میں اُگتا ہے جس سے تیل نکلتا ہے اور وہ کھانے والوں
کے لئے ترکاری۔ دوسری آیت اسی کو بابرکت درخت فرمایا ہے ۱۲
[۲] زیتون کا تیل کھاؤ اور بدن پر لگاؤ کیونکہ وہ بابرکت ہے (جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے) ۱۲ منہ

اور احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔ کلوا الزیت و ادھنوا بہ فانہ من شجرۃٍ مبارکۃٍ۔ پھر حضرت مولانا اس کے استعمال میں کیسے کمی فرماتے۔ مالٹا میں تیل بہت میسر ہوا۔ تین روپیہ کو ایک ڈبہ ملتا تھا۔ تیسرے چوتھے روز سب رفیقوں کے استعمال میں ختم ہو جاتا تھا۔ گوشت کی اصلاح اسی سے ہوتی۔ پلاؤ میں یہ ڈالا جاتا۔ سالن کی جگہ روٹی سے کھایا جاتا۔ حضرت فرماتے تھے کہ ہندوستان سے لوگ گھی بھی بھیج دیتے تھے لیکن اس کے مقابلہ میں مجھے اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔" فرماتے تھے کہ ایک "پیالی میں میرے پاس رکھا رہتا تھا کبھی انگلی بھر کر کان میں لگالی کبھی ناک میں کبھی سر پہ۔ وطن میں بھی کسی قدر موجود رہتا تھا کبھی سر پہ لگاتے کبھی انگلی کھانے میں استعمال فرماتے۔ غرض آپ نے کُلُوا وَ ادَّھِنُوا کی پوری تعمیل فرمادی۔ یہی شان ولایت ہے کہ شرعی امور مرغوبات طبعی ہو جائیں انھیں میں لطف حاصل ہونے لگے۔

چاء کی عادت اور التزام نہ تھا لیکن جب خدام بنا کر پیش کرتے تو نوش فرمالیتے مولانا حسین احمد صاحب نفیس و لطیف سادہ چاء تیار کرتے تو اصرار کر کے کئی کئی فنجان پلا دیتے مخصوص مہمانوں کے لئے اہتمام سے چاء پکوا کر ان کی عادت کے موافق وقت پر پلاتے۔

پان کی بہت عادت تھی اور اس کے ساتھ خوشبودار بنا ہوا تمباکو استعمال فرماتے۔ پان کا ڈبہ اور چھالیا کا بٹوہ اکثر سفر و حضر میں ہمراہ رہتا تھا۔ اثناء درس میں بھی کئی مرتبہ پان کھاتے اور منہ میں پان لئے ہوئے بلا تکلف تقریر فرماتے رہتے۔ مالٹا میں پان چھوڑ دینے کا قصد فرما لیا تھا مگر ہندوستان سے چھالیا اور خشک پان وہاں پہنچتے رہتے۔ عادت چھوڑنے کی تکلیف برداشت کرنے کی ضرورت نہ ہوئی رفقاء سے ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر کچھ عرصہ کے بعد پان کھانا ترک کر دیں گے۔ قضائے یہ ارادہ ایسے حسن اسلوب سے پورا کر دیا کہ حضرت سرِ خود بھی رخصت ہوئے اور خود بخود پان چھوٹ گیا کچھ تکلیف بھی کرنی نہ پڑی تیمار جنت

ؔ زیتون کا تیل کھاؤ اور بدن پہ لگاؤ کیونکہ وہ برکت سے ہے (جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے) ۱۲ منہ

کے مقابلہ میں پان کا پتہ کیا چیز ہے۔ صحت حضرت کی عموماً اچھی رہتی تھی۔ سوء ہضم اور ضعفِ معدہ وغیرہ کی وجہ سے پرہیز اور احتیاط اور دواؤں کے دائمی استعمال کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ ضعفِ دماغ اور ضعفِ بصر کے شاکی نہ رہتے تھے نظر قوی اور تیز دُوربین تھی۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے حفاظت بصر کے لئے چشمہ استعمال فرماتے تھے۔ خونی بواسیر کا کبھی کبھی دورہ ہوتا اور خون نکلنے سے آپ ضعیف ہوجاتے لیکن مخلص طبیبوں کی مجرب دواؤں کے اثر سے خدا تعالیٰ نے اس مرض سے عرصہ دراز ہوا کہ نجات دے دی تھی۔

نظربندی اور اسیری میں صحت اچھی رہتی تھی اور توجہ الی اللہ غالب۔ عالمگیر وبائی بخار کے زمانہ میں رفیقوں کو بخار آیا مگر حضرت محفوظ رہے۔ البتہ مالٹا سے واپس ہوکر سویز کے قیام میں دردِ دنداں کی بہت تکلیف اُٹھائی۔

پہننے اوڑھنے میں سادگی اور طالب علمانہ وضع

سُنا ہے کہ جوانی میں حضرت مولانا لباس نفیس اور مکلّف پہنتے تھے لیکن چند ہی روز کے بعد نہایت سادہ بالکل طالب علمانہ ملّانی وضع کا ہوتا تھا۔ نہ ایسا پھٹا پُرانا کہ دیکھنے والے نفرت و کراہت کریں یا محتاج سمجھیں، نہ ایسا شاندار کہ امتیاز از خصوصیّت کا شائبہ ہو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے نہ دیکھا ہو تو آپ کو دیکھ لے اتفاقیہ کہیں قیمتی کپڑا میسّر ہوگیا تو وہی پہن لیا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ موجود ہُوا تو اس میں بھی عار نہیں کبھی بیلدار چکن کا کرتہ زیب تن کئے ہوئے جارہے ہیں اور کبھی معمولی دھوتہ اور گزی کا پیراہن پہنے ہوئے دارالعلوم کی صدر مدرسی کی مسند پہ بیٹھے ہوئے حدیث پڑھا رہے ہیں نہ اس میں افتخار نہ اس میں عار۔ مالٹا کے سفر سے پہلے بھی دیسی کپڑے کو زیادہ پسند فرماتے تھے اور اب آخری زمانہ میں تو اس طرف نہایت ہی توجہ ہوگئی تھی اور دوسروں کی ترغیب و تحریص کے لئے معمولی دیسی کپڑے اہتمام سے تیار کرائے تھے۔

نیچا کرتہ۔ سینہ پر کھلا ہوا گریبان اور شرعی مغلئی پاجامہ ہوتا تھا دوپلی ٹوپی پہنتے یا عرب کی طرف کی سوزنی گول۔ عمامہ بہت کم باندھتے اور باندھتے بھی تو شملہ بمقدار علم سمجھ کر مزین منتین و شاندار نہیں بلکہ نہایت سادہ۔ سفید یا دھاری دار اور مختصر۔ مالٹا سے واپسی پر کبھی کبھی کرتہ پر سفید صدری بھی پہن لیتے موسم سرما میں روئی دار نیمہ آستین یا روئی دار چوغہ (یعنی لبادہ) اور سر پر روئی دار کن ٹوپ۔ سبز کاہی یا کشمشی رنگ کی روئی دار دلائی اکثر استعمال کرتے۔ فرماتے تھے کہ مالٹا کی سردی میں ان ہماری زائیوں نے بڑا کام دیا۔

حضرت کا توکل علی اللہ

حضرت مولانا کا توکل اور اعتماد علی اللہ۔ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ظاہری سامان معیشت اگرچہ نہ بھی ہوتے تو آپ کو کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ تاہم دارالعلوم دیوبند کی طرف سے جو کچھ آپ کی خدمت ہوتی تھی وہ اور والد ماجد کی حصہ رسد جائیداد ذریعہ معیشت تھی۔ مگر روزانہ اضیاف کی مدارات اور فقراء و مساکین کی خبر گیری اور بہت سے ذوی القربیٰ اور رشتہ داروں کا تکفل اسقدر مصارف بڑھا دیتا تھا کہ بہت دفعہ قرضدار ہونے کی نوبت آجاتی۔ تحفہ و نذر بہت کم اور کسی بہت ہی مخلص کے اصرار سے قبول فرمالیتے تھے اس لئے یہ کوئی معتدبہ ذریعہ نہ تھا۔ البتہ آخری مرتبہ حج کو تشریف لے جانے سے قبل اور مالٹا کی اسیری سے نجات پانے کے بعد جس طرح مصارف نہایت ہی بڑھ گئے تھے اسی طرح اس مد میں خدا تعالیٰ نے وسعت فرما دی تھی۔

گھر کے انتظام یا نقد و نسیہ کے حسابات سے حضرت نے کبھی کچھ واسطہ و سروکار ہی نہیں رکھا مدرسہ کا مشاہرہ اور جائیداد کی آمدنی مکان میں وصول ہوتی تھی اور وہیں سے حسب موقعہ سلیقہ کے ساتھ صرف ہوتی۔ اس طویل سفر حج اور اسیری مالٹا اور وہاں سے واپسی کے بعد وفات تک آمد و صرف سب کچھ رفیقوں کے ہاتھ میں رہا۔ خازن اور رفیق امانت و دیانت سے خرچ کرتے تھے لیکن (خدانخواستہ) اگر چاہتے تو صدہا کو

روپیہ ہضم کر لیتے۔ حضرت کو خبر بھی نہ ہوتی۔ یہ بات لاکھوں میں بہ مشکل ایک کو میسر ہوتی ہے کہ مال و دولت سے کچھ تعلق ہی نہ ہو۔

حضرت کے خدام راوی ہیں کہ بعض لوگ کئی کئی نوٹ پیش کرتے تھے تو حضرت کھول کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ کتنے روپیہ کے نوٹ ہیں اسی طرح کبھی تکیہ کے نیچے رکھ دیتے کبھی پکار کر مولوی عزیز گل صاحب کے سپرد کر دیتے۔ دینی ضروریات و مصارف میں حضرت یہ خیال نہیں فرماتے تھے کہ ذاتی روپیہ خرچ ہو رہا ہے یا اسی مد کا وصول شدہ ذخیرہ۔ بلکہ جس طرح ہو سکتا اور جہاں سے ممکن ہوتا جمع کر کے دینی ضروریات کو پورا فرماتے کوئی اس کے خلاف گفتگو یا اشارہ کرتا تو پیشانی پر بل پڑ جاتے اس قسم کے امور میں حضرت کی وہ حالت تھی کہ اس زمانہ میں یقین آنا دشوار ہے اور ایسی نظیر ملنا محال۔

حضرت کے اخلاق و عادات، تواضع و انکسار

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے دریافت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بیان فرماؤ جواب دیا کہ جو کچھ قرآن مجید میں ہے وہی آپ کے اخلاق تھے اسی طرح حضرت مولانا کے اخلاق و عادات وہی تھیں جو احادیث صحیحہ میں مروی اور سنن نبویہ سے ثابت ہیں نور معرفت سے سینہ معمور اور کتاب و سنت کے علوم سے دل۔ زبان آباد تھے۔ دیگر اعضا و جوارح بھی انہیں کے تابع تھے جو حرکت تھی حکم خداوندی کے موافق اور جو فعل تھا سنت صحیحہ کے مطابق۔ سنت سنیہ اور اخلاق کا نمونہ مجسم اگر حضرت کو کہا جائے تو بجا ہے اور انتہائی درجہ کے متبعین سنت صحابہ کی زندگی کا نقشہ آپ کی حیات کو سمجھا جائے تو زیبا ہے۔

کوئی قول و فعل خلاف شریعت ہونا تو درکنار۔ مدتوں خدمت میں رہنے والے خادم بھی یہ نہیں بتلا سکتے کہ کوئی ادنیٰ سا فعل بھی آپ سے خلاف سنت سرزد ہوا۔

دن ہو رات، صحت ہو یا مرض۔ سفر ہو یا حضر۔ خلوت ہو یا جلوت۔ ہر حالت میں حضرت کو اتباعِ سُنت کا خیال تھا۔ خود بھی عمل کرتے اور اپنے متبعین و متوسلین کو بھی قولاً و عملاً اسی کی ترغیب دیتے اور رفتہ رفتہ عمل بالسنۃ حضرت کے لئے ایک امر طبعی ہو گیا تھا جس میں کسی تکلف و تحریک کی ضرورت ہی نہ تھی نہایت سہولت و متانت سے سنن و مستحبات کو ملحوظ رکھتے تھے مگر یہ نہیں کہ ہر وقت ہر ہر فعل پر حاضرین کے جتلانے یا ان سے داد لینے کے لئے حدیث پڑھ کر سُنائیں اور عمل کریں۔ بعض دفعہ تو ایسی سادگی سے عمل فرماتے کہ پاس بیٹھنے والے اہل علم کو بھی یہ مشکل احساس ہوتا۔ نیا پھل کسی نے پیش کیا۔ کبھی خوشبو سونگھ لی اور کہہ دیا۔ کبھی آنکھ سے لگایا۔ پھر کسی بچّہ کو پکارا اور اس کو دیدیا کبھی یہ دیکھنے کے حیلے سے کہ بارش ختم ہوگئی یا نہیں دو چار قطرے سر اور جسم پر لے کر حَدِیْثُ عَھْدٍ رَبِّیْ[1] کا لطف اٹھا لیا کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ مولانا کیا کر رہے ہیں۔ البتہ جب خیال فرماتے کہ دیکھنے والا سمجھ گیا ہے تو مسرّت کے ساتھ تصریح فرما دیتے ایک روز احقر کی عیادت کو تشریف لائے اور صرف مصافحہ کر کے واپس ہونے لگے۔ مَیں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو بھی آج ہی حدیث پر عمل کرنا تھا تبسّم فرما کر فوراً پڑھ دیا کہ العیادۃُ کفُواقِ ناقۃٍ۔

غرض چلنا پھرنا لیٹنا بیٹھنا کھانا پینا سونا جاگنا جو کچھ بھی تھا کمال اتباع کے ساتھ تھا۔ مگر نہایت خاموشی سے درجہ اخفا تک پہنچا ہوا۔ سفر میں رفیقوں سے ایسی بے تکلفی اختیار فرماتے کہ وہ سب کلفت سفر بھول جاتے اور حکایات و واقعات سُنا سُنا کر لَاسَمَرَ اِلَّا لِمُصَلٍّ اَوْمُسَافِرٍ کی حکمت واضح فرما دیتے۔

سادہ اور بے تکلف طالب علمانہ صفت کے لوگوں کی صحبت سے نشاط پاتے اور رئیسانہ ساز و سامان اور بے موقع تکلفات سے نہایت منقبض ہوتے۔ کسی تقریب سے ریاست رامپور جانے کا اتفاق ہوا اور کسی معزز شخص کی ہمراہ

---

[1] حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بارش کے قطرے بدن پر مل لیتے اور فرماتے کہ تازہ تازہ میرے پروردگار کے پاس سے آیا ہے ایسی ہی باتوں میں اہل محبت ہی کو کچھ لطف آتا ہے۔

بطور سیر کے نواب صاحب کے مکلف سجے ہوئے کمرہ میں پہنچے۔ انتہائی زیب و زینت تھی۔ جا بجا نقشے اور تصویریں لگی تھیں۔ مکلف قالین اور بستر لگے ہوئے تھے، خود فرماتے تھے کہ "اس قدر انقباض ہوا کہ قریب تھا کہ دم گھٹ کر نکل جائے۔ فوراً باہر آگئے" رئیسوں سے مناسبت اور لگاؤ نہ تھا لیکن بزرگی جتلانے کے لئے اظہار نفرت یا ان کی توہین ہرگز نہ کرتے۔ بدرجۂ مناسب تعظیم فرماتے۔ اخلاق سے ملتے اگر وہ لوگ حضرت کے بزرگوں سے نسبت یا عقیدت رکھنے والے ہوتے تو حضرت اور بھی زیادہ تعظیم سے پیش آتے۔

ایک مناظرہ کے جلسہ میں ریاست رامپور میں حضرت مولانا احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ اور بڑے بڑے علماء بلائے گئے حضرت کی خدمت میں تار آیا۔ کچھ عذر فرما دیا لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت دوسرا تار آوے گا۔ فرما دیا کہ پھر آویگا تو لکھوا دیں گے کہ "آنے کے لئے تیار نہیں" وہ خود سمجھ لیں گے کہ ایسے مولوی کو کیا بلائیں جو مناظرہ کے لئے کتابیں دیکھنے کا محتاج ہے۔ اور اگر یہ سمجھ لیا کہ حاضری کے قابل کپڑے موجود نہیں تو اور بھی خوب ہے۔

مولانا اشرف علی صاحب کے اصرار سے ایک مرتبہ مدرسہ جامع العلوم کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں وعظ شروع فرمایا۔ حضرت مولانا ایک بڑا عالی مضمون بیان فرما رہے تھے جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی رحمہ اللہ اثنائے وعظ میں آکر شریک جلسہ ہوئے حضرت کی ان پر نظر پڑی تو فوراً درمیان میں سے وعظ قطع فرما کر بیٹھ گئے اور آپ کے بے تکلف ہم سبق مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے جب کہا کہ مولانا کیا کیا یہی تو وقت تھا تو فرمایا کہ ہاں یہی خیال مجھ کو آیا تھا اسی لئے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہار علم کے لئے ہوگا نہ خالصاً لوجہ اللہ۔

مہمانوں کی خدمت خود فرماتے۔ کبھی کھانا زنانہ مکان سے لاکر مہمانوں کے کے سامنے رکھتے۔ عشاء کے بعد کھڑے ہیں اور سب کی ضروریات کو دریافت فرما رہے ہیں۔ خادم اور مہمان شرم سے پانی پانی ہوئے جاتے ہیں اور حضرت مکان

ہیں سے بستر اور لحاف اُٹھا کر لا رہے ہیں۔ مالٹا سے واپسی کے بعد حضرت بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ مجمع بھی بے تعداد رہتا تھا پھر بھی ہر شخص سے اس کی راحت و آرام و قیام کا حال کچھ نہ کچھ دریافت فرما لیتے تھے رخصت ہونے والوں کے لئے ریل کے وقت سے پہلے بہت اہتمام و تاکید سے کھانا تیار کراتے تھے نا واقف مہمانوں کی بے تمیزی پر صبر فرماتے تھے۔ بے وقت تکلیف دہی کی کبھی شکایت یا اس پر سرزنش نہ فرماتے تھے۔

ظاہرداری اور کسر نفسی سے نہیں بلکہ واقعی طور سے حضرت اپنے آپ کو نہایت حقیر اور ادنیٰ مسلمان سمجھتے تھے اور شانِ عبدیت کے غلبہ سے اپنے تمام کمالات ہیچ نظر آتے تھے۔ ژولیدہ حال پھٹے پرانے بوسیدہ لباس والوں سے بھی ایسی بشاشت سے ملتے تھے کہ ان کے دل باغ باغ ہو جاتے تھے خدام و متوسلین میں غایت شفقت اور حسن سلوک سے ہر شخص یہی خیال کرتا تھا کہ مجھ پر زیادہ شفقت ہے کافروں اور بد دینوں سے طبعی نفرت تھی اور اہل ایمان و دینداروں سے نہایت انس اور مناسبت۔ صاحب زادہ حضرت مولانا مسعود احمد صاحب گنگوہی کو ایک مرتبہ بہت مکلف بیل گاڑی میں رخصت کیا۔ بہلیان ہندو تھا اس کے کھانے کا فکر ہوا لوگوں نے عرض کیا نقد دیدیا ہے فرمانے لگے خیر۔ بھائی اگر ٹوٹی سی ٹوٹی گاڑی ہو اور بہلیان مسلمان ہو مجھے تو وہ پسند ہے۔

دارالاشاعت لاہور کے منتظم اور بہت سی کتابوں کے مؤلف و مترجم مولوی سید ممتاز علی صاحب دیوبندی کے والد صاحب حضرت مولانا کے والد ماجد کے ہمنام تھے اور ان دونوں ذوالفقارین میں نہایت قدیم شائستہ ملاقات تھی، مولوی ممتاز علی صاحب بھی جب کبھی وطن آتے تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی رہتے۔ اور اگرچہ عقائد میں زمین و آسمان کا فرق تھا پھر بھی حضرت کے مذکورہ روابط اور ان کی علم دوستی کی وجہ سے ان کی طرف توجہ فرماتے ایک مرتبہ مولوی صاحب آئے اور دو شخص کوٹ پتلون پہنے ہوئے ترکی ٹوپیاں سر پر اوڑھے ہوئے

ان کے ہمراہ آئے۔ حضرت نے بالکل رُخ نہ کیا وہ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے خود فرماتے تھے کہ میں نے سمجھا کوئی نیچری ہوں گے !! لیکن جب مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت یہ ترک ہیں اتفاقیہ ہندوستان آئے ہیں تو حضرت فوراً کھڑے ہو گئے اور خود ان کے لئے مونڈھے لاکر تعظیم سے بٹھلایا۔

جو دریدہ دہن لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت کو نیچروں سے مناسبت ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں کھول کر اس واقعہ کو دیکھیں حضرت کو نیچریوں سے انس نہ تھا البتہ اگر اس لباس میں کوئی خوش عقیدہ صالح الاعمال ایمانی جوش اور اسلام کا درد رکھنے والا اُن کو مل جاتا تھا تو وہ اس کو گدڑیوں کا لعل سمجھ کر قدر کرتے تھے اور سے اسلامی خدمت اور عمدہ نتائج کے متوقع رہتے تھے احقر کی کتاب کا اختصار اجازت نہیں دیتا ورنہ معلوم نہیں کس قدر مثالیں اور اس قسم کے کتنے واقعات آپ کی نظر سے گزرتے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے مشابہت و مناسبت

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و کمالات واسطہ در واسطہ دُنیا میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ خلفاء راشدین مختلف خصوصیتوں کے ساتھ آپ کے کمالات کا مظہر تھا، اور پھر یہی کمالات اولیاء امت کو بالواسطہ نصیب ہوئے اور ایک دُوسرے کے کمالات کا (جو حقیقت میں کمالاتِ محمدی تھے) مظہر بنتا رہا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے علوم و کمالات مختلف فیض یافتہ اور خوشہ چینوں کو نصیب ہوئے۔ مگر مظہر تام اپنے اُستاد کے کمالات کے حضرت مولانا شیخ الہند ہی تھے۔ اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کا وصف خصوصی جس میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں خاکساری اور نیازمندی تھا۔ یہی وصف مولانا میں ایسا نمایاں اور جلوہ گر تھا کہ نہ دلیل کی ضرورت نہ بیان کی حاجت۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ایک ادنیٰ

اور معمولی انسان سمجھتے تھے۔ علوم و کمالات نے ان کے ذہن میں اپنے لئے نہ کوئی تشخص پیدا کیا تھا نہ امتیاز۔ ایک واقعہ میں حضرت کا حد سے زیادہ تواضع و انکسار دوستوں کو ناگوار گزرا تو رقت آمیز لہجہ سے فرمایا کہ " میاں دل تو یہ چاہتا ہے کہ کوئی جوتیاں مارے تو اُف نہ کروں لیکن رائے و مشورہ میں سب کا تابع ہوں۔

اعلیٰ درجہ کا ضبط و تحمل اور حالات و مقامات اور امورِ قلبیہ اور واردات غیبیہ کو انتہائی درجہ میں مخفی رکھنا اور اپنی نوافل و عبادت کو بدرجۂ غایت پوشیدہ کرنا اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کی دائمی عادت تھی یہی طرز حضرت مولانا کا تھا کہ دیکھنے والوں کو محض زاہد خشک نظر آتے تھے اور اپنے درُود و وظائف کو بہ لطائف الحیل مخصوص خدام سے بھی حتی الوسع چھپاتے تھے۔ دینی ضروریات کے مقابلہ میں جیسے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ اپنے جان و مال راحت و آرام صحت و مرض کی کچھ پروا نہ کرتے تھے یہی حال حضرت مولانا کا تھا روڑکی میں پنڈت دیانند کے تشریف لانے اور مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کا حال سن کر اُستاد مکرم جس طرح اہل روڑکی کے عرض و معروض پر نہایت مرض و ضعف اور ضیق النفس کے دروں میں اسلام کی حمایت کرنے کے لئے روڑکی جاکر سینہ سپر ہو گئے تھے اور پنڈت صاحب کے میرٹھ جانے پر انہیں امراض میں وہاں پہنچے تھے اسی طرح حضرت مولانا اپنے مرض وفات میں اسلامی یونیورسٹی کے قیام کو دینی ضرورت سمجھ کر منتظمان وغیرہ کے اصرار پر صعوبتِ سفر برداشت کر کے علی گڑھ تشریف لے گئے اور منع کرنیوالوں کی عرض و معروض اور معاندین کے اعتراض کی کچھ پروا نہیں فرمائی۔

فراست و ذہانت۔ علو ہمت۔ جفاکشی، چستی و چالاکی جیسے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کو خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ انہیں کے قریب قریب حضرت مولانا میں موجود تھی آخری زمانہ کی حالت دیکھنے والوں کو شائد بعض اوصاف کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہو لیکن پہلے حالات دیکھنے اور سننے والے اس میں ہرگز شبہ نہیں کر سکتے۔ شکار کے لئے شہر سے تین چار بلکہ چھ سات کے میل کے فاصلہ پر نکل جاتے جمعہ کا وقت

قریب ہوتا تو ساتھیوں کو چھوڑ کر دوڑتے جامع مسجد میں جمعہ پڑھ کر واپس جاتے اور شکار میں مشغول ہو جاتے ، اور یہ تو گویا نہایت ہی سہل معمول تھا کہ پنجشنبہ کے روز عصر کی نماز سے قبل پا پیادہ گنگوہ تشریف لیجاتے ۔ شب کو کسی وقت پہنچتے ، دن کو حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت و زیارت کی مسرت حاصل فرماتے اور شام کو واپس ہوتے ۔ پچیس میل کی منزل طے فرما کر مکان پر پہنچتے اور شب کو آرام کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے صبح کی نماز کے بعد مدرسہ میں درس دینے کے لئے موجود ہو جاتے ۔

تصنیف و تالیف تحشیہ و تصحیح کا شوق حضرت استاد کی طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ایام طالب علمی ہی سے چلا آتا تھا اور شعر و شاعری کا مذاق اور نظم کا شوق اور موزونیت طبع بلا کسی باضابطہ شاگردی کے اپنے استاد مکرم کے مانند حضرت مولانا میں بھی قدرتی تھا ۔ اردو اشعار اور آپ کی نظمیں رسالوں کی صورت میں طبع ہو گئی ہیں جن کے الفاظ میں قرآن و احادیث کے مضامین کی طرف لطیف اشارات ہوتے ہیں ۔ اور فارسی اشعار ایک بیاض میں محفوظ ہیں ۔ قدیم اساتذہ اور مستند شعرائے کے صدہا اردو فارسی اشعار حضرت مولانا کو ازبر تھے ۔ غالب کے اشعار بکثرت یاد تھے اور استاد ذوق کے ان سے بھی زیادہ ۔ اثنائے گفتگو میں کبھی برمحل پڑھ دیتے تھے اور تالیف و تصنیف میں نہایت با موقع استعمال فرماتے تھے ۔ آپ کے والد ماجد نے جب علم معانی کی کتاب تذکرۃ البلاغت اردو میں تصنیف فرمائی تو قواعد علم معانی کی مثالیں شعرائے اردو کے کلام سے تلاش کر کے دینا حضرت مولانا کا کام تھا ۔

بزرگوں اور دوستوں کی وفات پر اظہار درد کے لئے تھوڑے سے اشعار یا پورا مرثیہ لکھتے ۔ مجمع میں سناتے رقت طاری ہو جاتی ۔ خود ضبط فرماتے اور سامعین کی ہچکیاں بندھ جاتی اور دامن تر ہو جاتے ۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا غلام رسول صاحب مدرس دارالعلوم کی وفات کی خبر مالٹا کے زندان میں پہنچی تو وہیں سے پُر درد مرثیے لکھ کر ہندوستان بھیجے ۔ اپنے رفیق حکیم سید نصرت حسین کی وفات پر قلبی غم والم کے ساتھ جو اشعار تحریر فرمائے ہیں وہ آپ پڑھ چکے ہیں ۔ اسی

طرح اور بہت سے احباب کی وفات پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے[1] حالانکہ زیادہ اشغال نہ تھا۔ لیکن تاریخ وفات کے موزوں فرماتے کہ مشتاق دنگ رہ جاتے نمونہ کے لئے مولانا احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ "حک ہوئی تصویرِ قاسم صفحۂ دُنیا سے تو" ۱۳۳۰ھ اور آپ کے رفیقِ اسیری مولوی نصرت حسین صاحب کی "رہائی یافتہ از ہر دو قید در بکدم" ۱۳۳۰ھ کافی ہیں۔

غرض اپنے استاد قدس سرہٗ کے علوم وکمالات سے مناسبت تامہ ہونے کے علاوہ زوائد امور میں بھی حضرت مولانا کو نہایت ہی مشابہت حاصل تھی جس کی جزئیات کی مزید تفصیل باعث طول کلام ہے بس آخری درجہ یہ ہے کہ مرض وفات میں بھی جس قسم کے جان نثار اور مخلص طبیب اور بے مثل شاہانہ معالجات استاد رحمۃ اللہ علیہ کو میسر ہوتے تھے بالکل اسی درجہ کے بے ریا مخلص اطبا و ڈاکٹر اور انواع واقسام کی بیش بہا دوائیں حضرت مولانا کو حق تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔

سیاسیات اور حالاتِ حاضرہ سے تعلق

حضرت مولانا حقیقی طور پر ایک تارک الدُّنیا راغب فی الآخرہ گوشہ نشین عالم تھے۔ ظاہری درس وتدریس اور تعلیم حدیث اور باطنی ہمت وتوجہ اور تعلیم ذکر وفکر سے تمام عمر اصلاح خلق میں مصروف رہے۔ اسباب شہرت کو نہ کبھی اختیار کیا نہ پسند، اور امور سیاسیہ میں نہ کبھی دخل دیا نہ بلا ضرورت اس درجہ کو اپنے منصب عالی کے شایاں سمجھا۔ آپ کی اس یکسوئی کا اثر تھا کہ آپ کے ہزار ہا ہم خیال اور زیر اثر مریدوں معتقدوں، شاگردوں کو بھی اس قسم کے امور سے اجتناب رہا آپ کا جس کسی سے جس قدر بھی تعلق تھا۔ تھوڑا ہو یا بہت، اور جس شخص سے بھی علاقہ تھا محبت کا ہو یا بغض کا وُہ سب اسلام اور شریعت کے تابع اور ثمرات ایمانی میں داخل تھا۔

---

[1] یہ سب مرثیے اور اشعار احقر نے کلیات شیخ الہند میں نقل کر دیئے ہیں ۱۲۔ اصغر حسین عفا عنہ

غیر مسلم حکومت اور غیر اسلامی سلطنت خواہ کتنی ہی انصاف پرور اور معدلت گستر ہو مسلمان کے لئے اس کے ماتحت رہنا ایک انتہائی کلفت ہے اور دینی مصیبت۔ کتنے احکامِ شرعیہ ہیں جو بغیر مسلمان حاکم کے نافذ ہی نہیں ہو سکتے اور کتنی ضروریات دینیہ اور قضایائے مہمہ ہیں جو بدوں با اختیار قاضی کے فیصل ہی نہیں ہو سکتے۔ مگر باینہمہ حضرت مولانا رضینا بقضاء اللہ کہہ کر نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ ہندوستان میں بسر کرتے رہے۔ دل میں خواہ کتنی ہی کلفت و کراہت ہو مگر زمانہ شاہد ہے کہ کبھی تحریراً یا تقریراً کوئی اظہار و اعلان اس قسم کا نہیں کیا جس کو حکومت بہ نظر اشتباہ دیکھ سکے۔ ایک زمانہ میں آپ کی محدود و قلیل آمدنی پہ سرکاری حکام نے ٹیکس تشخیص کر دیا۔ جب مطالبہ ہوتا تھا بلا چون و چرا ادا فرماتے تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے نام سے ایک زمانہ میں بضرورت شرعی جو فتاویٰ عدم جواز عذر با معاہدین اور حرمت قتل معاہدین کے شائع ہوتے وہ حضرت مولانا کے تصدیق فرمودہ اور دستخط سے مزین تھے۔

مگر اسی کے ساتھ حضرت اپنے پہلو میں ایسا قلب سلیم رکھتے تھے جس میں اسلامی درد تھا اور ایسی جان رکھتے تھے جو ایمان پہ فدا تھی۔ اہل اسلام کے مصائب و تکلیف آپ کو بے چین کر دیتے تھے اور دشمنوں کی دست درازیوں کو وہ کبھی ٹھنڈے دل سے نہیں دیکھ سکتے تھے جناب سید العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال المؤمنون کرجلٍ واحدٍ ان اشتکیٰ عینہٗ اشتکیٰ کلّہٗ وان اشتکیٰ راسہٗ اشتکیٰ کلّہٗ [1] اور المؤمنون یدٌ علیٰ من سواھم [2] آپ کے پیش نظر تھے مشہور جنگ روم و

---

[1] تمام مسلمانوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کے اعضائے جسمی اگر اسکی آنکھ میں درد ہوتا ہے تو تمام اعضا کو تکلیف پہنچتی ہے اسی طرح اگر سر میں درد ہوتا ہے تو سب اعضاء بے چین ہو جاتے ہیں شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث کا مضمون اشعار میں ادا کر کے فرمایا ہے

بنی آدم اعضاء یک دیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

[2] اہل ایمان کو اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح مجتمع رہنا چاہیئے حدیث طویل ہے اور سب اسی قسم کا مضمون ہے ۱۲۔

روس میں ہزارہا کوس کے واقعات سُن کر آپ ہی نہیں آپ کے مرشد قدس سرہٗ بھی بیقرار ہوگئے وہ لوگ جو قال اللہ و قال الرسول کے سوا دُوسرا شغل ہی نہ رکھتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد اخبار کے منتظر بیٹھے ہیں۔ خادم تیزی سے ڈاکخانہ جاتا ہے اخبار میں دشمنوں کی قوت اور مسلمانوں کے ضعف کا حال پڑھ کر اور روس کے غلبہ کی خبر سُن کر نورانی چہروں کی مقدس ڈاڑھیاں سیلِ اشک سے تر ہو رہی ہیں۔ خُدا کا نام لے کر اُٹھے اور جو کچھ وسعت میں تھا کیا۔ دن کو بخاری شریف کے ختم ہو رہے ہیں۔ حصن حصین کے اوراد پڑھے جاتے ہیں علماء و صلحاء کا مجمع ہاتھ اُٹھائے ہوئے صدقِ دل سے دُعائیں کر رہا ہے۔ اندھیری رات میں بزرگانِ دین سجدوں میں پڑے ہیں۔ تاریک حجرے دُعاؤں کے نور سے معمور ہیں یا ربی یا ربی کی صدائیں عرش اعظم تک پہنچ رہی ہیں۔ وہ خاصان خُدا جو اپنے لیے حرف سوال کو کفر کا مرادف سمجھے ہوئے تھے اسلام کے نام پر کھڑے ہو گئے اور کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیا۔ نقد و جنس قلیل و کثیر جو کچھ کسی نے دیا، خوشی سے قبول کیا اور رفتہ رفتہ ہزار ہا روپیہ مظلوم مسلمانوں کی اعانت کے لئے روانہ کیا۔

سنہ ۱۳۳۰ھ میں سلطنت عثمانیہ کو بلقان کی مہیب جنگ پیش آئی تو حضرت مولانا اور آپ کے متبعین نے پھر اپنے اسلامی تعلق کا پُوری طرح حق ادا کیا اور مثل سابق اپنی ہر قسم کی دُعاؤں کے علاوہ آفت زدہ، جلاوطن، فاقہ کش ترکوں کی مالی اعانت کا بھی انتظام کیا۔ ہر قسم کی مناسب تحریکات کی۔ مجامع اور جلسے منعقد فرمائے اور خلاف عادت خود حضرت مولانا نے تقریریں فرمائیں۔ دارالعلوم میں ایک مجلس بنام ھلال احمر کھول دی گئی اور جناب مہتمم صاحب مدظلہم کی جانب سے ایک فتویٰ اور اشتہار لاکھوں کی تعداد میں طبع کرا کر ہندوستان میں جا بجا تقسیم کیا گیا اور چند رُوز کے لئے دارالعلوم میں کار تعلیم بند کر دیا گیا۔ مدرسین نے شہر بشہر جا کر عام جلسوں میں اس کی اہمیّت کو بیان کیا اور حضرت کے تلامذہ یعنی دارالعلوم کے طلبہ نے ہندوستان کا دَورہ کر کے ہر جگہ اس دینی تحریک کی اشاعت کی اور پھر پُوری حمیّت و ہمدردی کا ثبوت اس طرح دیا کہ اپنے امتحان سالانہ کے انعام کی تمام رقم اس چندہ میں دینے کے علاوہ زرِ نقد اور اپنی ضروری استعمالی اشیا بھی چندے میں دے ڈالی۔

باوجودیکہ تحریک کرنے والے طلبا و علما کی ہدایت کے بموجب اکثر مقامات کے مسلمانوں نے فراہم شدہ روپیہ قابل اطمینان ذرائع سے براہ راست قسطنطنیہ بھیجدیا۔ تاہم بیرونی چندوں اور حضرت مولانا کے طلبا و علما کے عطیوں کو ملاکر خاص دارالعلوم کے ذریعہ سے بمبئی نیشنل بنک کی معرفت تقریباً ایک لاکھ روپیہ روانہ کیا۔ اس قسم کے چندوں کی مشغولیّت کی وجہ سے دارالعلوم کی آمدنی کا بہت سا نقصان بھی گوارا فرمایا لیکن خُدا کی راہ میں سر کٹانے والے بھائیوں کی اعانت کے فرض کی ادائیگی میں قصور نہ آنے دیا۔

گورنمنٹ کی کوئی غلطی ہو یا فروگذاشت اور عمداً ارتکاب کیا گیا ہو یا اتفاقیہ کوئی واقعہ پیش آگیا ہو۔ جس معاملہ میں اہل اسلام کی توہین اور تکلیف کا شائبہ بھی ہوتا تھا حضرت مولانا کو بمقتضائے قوتِ ایمانی اس سے نہایت صدمہ پہنچتا تھا اور عمال و حکّام سے ایک ناگواری کی شان پیدا ہوجاتی تھی لیکن اس قسم کے تمام امور میں حضرت مولانا نے قلبی احساس اور باطنی صدمات سے آگے قدم نہیں بڑھایا اور ہمیشہ فان لم یستطع فبقلبہ کی رُخصت پر عمل فرماتے رہے چنانچہ کانپور کی مسجد کا المناک اور رنج افزا واقعہ پیش آیا تو حضرت مولانا کو نہایت شدید احساس ہُوا۔ اور ان ایاّم میں مخصُوص طور سے کئی روز تک زبان سے حسرت اور چہرہ سے ملال کا اظہار ہوتا رہا۔ اور باوجودیکہ بعض مشاہیر وقت لے مفید سمجھ کر حسب استطاعت تحریر و تقریر وغیرہ سے کچھ عملی حصّہ بھی لیا لیکن حضرت مولانا نے اس فرض کفایہ میں ان حضرات کی ہمّت کو کافی سمجھا۔ یا عدم استطاعت کی وجہ سے کسی عملی سعی کو بے سود۔ بہرحال خاموش رہے۔

۱۳۳۲ھ میں یورپ کی تباہی و بربادی بخش جنگ عظیم شروع ہُوئی اور جرمنی اور برطانیہ کی آدیزش نے بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ آٹھ کروڑ مسلمانان ہند کے جذبات و احساسات کے خلاف برطانیہ نے ایک ایسی سلطنت کی مراعات و مودّت کی وجہ سے جو گذشتہ زمانہ میں برطانیہ کا مدّمقابل بلکہ ہیبت ناک دشمن شمار ہوتی تھی اس لئے قابل رحم ترکی سلطنت کی امداد و اعانت کے طریق بھی ہندوستان کی طرف سے مسدود ہوگئے اور مسلمان اپنا زخمی جگر تھام کر رہ گئے۔ اس پرآشوب اور سخت صبر آزما زمانہ میں گورنمنٹ

کے دِل خوش کن وعدہائے حفاظتِ مقاماتِ مقدسہ اور حمایت اقتدار خلافت کے اعتماد پر اہل علم اور منتقدار حضرات نے اور اہل ہندوستان کے مقتدر لیڈروں نے جس صبر و استقلال اور خاموشی سے کام لیا۔ اور عوام میں جس قسم کا سکون رہا وُہ اس وقت عدم استطاعت کے سہل الوصُول عذر پر اگرچہ جائز تھا لیکن آئندہ زمانہ میں بنظر کراہت نہیں دیکھا جائے گا تو بنظرِ تعجب ضرور۔

حضرت مولانا اس وقت تک ہندوستان میں تشریف رکھتے تھے مگر بالکل خاموش قلبی صدمات اور رُوحانی کلفتوں کا اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اور گرانی اور ناگواری بڑھتی جاتی تھی لیکن سب برداشت کرتے رہتے تھے اور سیاسی امور میں قولاً و عملاً کوئی حِصّہ نہیں لیتے تھے، گویا پالٹکس کے لئے دُوسروں کو اہل سمجھ کر خود اس میں دخل نہیں دیتے تھے کیونکہ (جیسا سابقاً معروض ہُوا ہے) آپ کے تمام تعلقاتِ حبُ و بغض تابع شریعت تھے اور شرعاً بھی آپ سکوت کی گنجائش سمجھتے تھے یہاں کی کلفتوں نے حرمین کی خاکبوسی کے شوق کو دوبالا کر دیا اور آپ نے ارادہ سفر فرما دیا اس میں شک نہیں کہ ان ایّام میں قلبی ناگواری بہت بڑھ گئی تھی اور غالباً اسی کا اثر تھا کہ آپ کی روانگی سے چھ ماہ قبل جب سر جمیس لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ دارالعلوم میں رونق افروز ہوئے تو حضرت مولانا نہ شریک جلسہ ہوئے اور اپنے مکان پر رہے۔

ہندوستان چھوڑ کر حرمین شریفین میں پہنچے تو شریف صاحب کی بغاوت اور گورنمنٹ برطانیہ کی اعانت کو بچشم خود ملاحظہ فرمایا۔ وہاں سے مظلومانہ طور پر نظر بند اور اسیر ہو کر قاہرہ میں قیام کر کے مالٹا پہنچے تو معزز ترکی افسروں کو اسیر و نظر بند دیکھنا ہی صدمات کے دوبالا کرنے کے لئے کافی تھا۔ پھر ان کی زبان سے سرکار برطانیہ کا کارنامہ طرزِ عملِ سلطنت اسلامیہ کے ساتھ اور وہ باتیں جو ہندوستان کے دور افتادوں کے کبھی خیال میں بھی نہیں آتی بلا واسطہ بالیقین معلوم فرمائی۔ یہ امور ایک صاف دل مومن کامل کے کے تکدّد خاطر و نفرت کے لئے کچھ ناکافی نہ تھے کہ خود اپنی بلا قصوُر اسیری کی عین الیقین تکالیف نے اس قلبی مضمون میں بے شمار اضافہ کر دیا۔ اور اب حضرت مولانا اس مطیع خائف

شہری رعایا کے افراد میں نہ رہے جو مشتبہ و ناگوارِ سرکار امور کو بھی محرمات ابدیہ کا مساوی سمجھے
نظر بندی سے رہا ہو کر حضرت مولانا ہندوستان پہنچے تو خلاف امید ملک میں ایک زندگی کی حرکت اور قوم میں بیداری کے آثار اور مسلمانوں میں اپنے بہت سے ہم خیال دیکھ کر نہایت مسرور ہوئے اور احکام شرع کے ماتحت سیاسی جدوجہد کرنے پر مجبور۔ کیونکہ چشم دید حالات۔ مسلمانوں کی نسبت اہل یورپ کے ارادے اور خیالات معتبر لوگوں سے سنی ہوئی سرگذشتیں اور واقعات حضرت کے ذہن میں موجود تھے۔ اور وہ یہ دیکھ کر لہو کے گھونٹ پی رہے تھے کہ بقائے احترام اماکن مقدسہ کے وعدے حرف غلط کی طرح محو کر دیئے گئے۔ سلطنت اسلامیہ کے اقتدار کو بحال و برقرار رکھنے کے مواعید نقش برآب ثابت ہوئے۔ صلح کانفرنس نے اپنے اختیار بھر ترکوں کو (نہیں بلکہ مسلمانوں کو) یورپ سے نکالنے کی تدبیر کر لی۔ جزیرۃ العرب میں سید العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے خلاف مشرکین کا اقتدار و عمل و دخل ہو گیا شام و عراق جیسے مسلمانوں کے مایۂ فخر و ناز مقامات غیر مسلموں کے ماتحت کر دیئے گئے اور انتہا یہ کہ خلیفہ صاحب شوکت قادر علی مدافعۃ اعداء الدین کا قیام و بقاء جو ایک قدیم و منصوص ناقابل تغیر و تبدیل مذہبی مسئلہ ہے مخالفوں کی عمداً و قصداً تدابیر سے خطرہ میں آگیا اور انہیں مصائب کے ضمن میں اور بہت سے ناقابل برداشت امور پیش آ رہے ہیں۔

اب حضرت مولانا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور سکوت و صموت کی گنجائش نہ رہی احکام شرع کی اطاعت مولانا کی اسلامی حمیت، اور دینی غیرت نے بیٹھنے نہ دیا اور ارادہ کو مضبوط جرأت کو قوی کر کے نہایت جرأت کے ساتھ اعلان حق کے لئے کھڑے ہو گئے اور مخالف و معاوق طاقتوں سے نڈر ہو کر آپ نے تحریراً و تقریراً بالواسطہ اور بلا واسطہ تبلیغ حق شروع فرما دی۔ استفتاء اور خطوط کے جوابات میں تو تشریف آوری کے دن ہی سے کلمۃ الحق کا اظہار ہو رہا تھا اب آپ نے اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ سے بلا توریہ و تقیۃ اپنا مشہور و معروف ترک موالات کا اعلان شائع فرما کر اونگھنے والوں کو بیدار کر دیا اور جاگتے ہوؤں کو کھڑا کر دیا اور ایسے زمانہ میں کہ آپ

کہ ہم خیال اور تبیع و متوسل لوگ بھی اس کو قبل الوقت اور صعب العمل سمجھ رہے تھے بلاخوف لومۃ لائم مذہبی احکام کو واضح فرما دیا۔ اور متردد و متحیر مسلمانوں کے لئے ایک صاف راستہ اور شاہراہ کھول دی جس پہ چلنے والوں کا ثواب ہمیشہ آپ کے نامۂ اعمال میں تحریر ہوتا رہے گا۔ صدہا اہل علم جو اس مسئلہ میں متردد تھے اور حیران تھے کہ اپنے متبعین کو کونسی راہ بتلائیں وہ مطمئن ہو گئے اور بشرح صدر دوسروں کو ہدایت کرنے لگے۔ اور ہزارہا دیندار مسلمان جو دنیاوی مشاہیر کے اقوال پہ مضبوطی و اعتماد کے ساتھ عمل نہیں کر سکتے تھے وہ آپ کے اعلانِ ہدایت کو ایک شرعی فتویٰ سمجھ کر باُمیدِ ثواب قومی تحریک میں شریک ہو گئے۔

آپ نے ضعیفوں کے ضعف اور مجبوروں کے عذر کو ملحوظ رکھتے ہوئے قولاً و عملاً کبھی تشدد اور دلخراش طرز کو پسند نہیں فرمایا بلکہ اپنے آقائے نامدار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وصیت یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا[1] پر عمل فرمایا۔ اور احسن المعلمین (روحی فداہ) کی روش پر اپنے متوسلین اور دوستوں کے اسی شاہراہ پہ چلنے کے لئے بزرگانہ نصائح سے متأثر کیا اور طرز محبت سے مجبور۔ اور چونکہ آپ کے کمال علمی اور معرفت و بصیرت کا سب کو بدرجۂ اتم اعتراف تھا۔ اس لئے باوجود ظاہری نامساعدتِ اسباب و حالات کے سب نے گوارا کیا جس کے خوشگوار نتائج دینی انشاء اللہ تعالیٰ سب متبعین کو ہمیشہ حضرت مولانا جیسے مربی روحانی کا ممنونِ احسان رکھیں گے۔

حضرت مولانا کی ظاہری و باطنی توجہ نے اہل اسلام کے با اثر دیندار طبقے کو جوش کے ساتھ آمادہ کر دیا اور آپ کے اعلان سے ترک موالات کی مذہبی تحریک کو ایک حیات تازہ حاصل ہو گئی۔ صدہا علماء جو اپنی دینداری سے تعلیم و تعلم ہی کو آخری اشغال سمجھے ہوئے تھے وہ بھی ضرورت حاضرہ پہ متنبہ ہو کر خلوص نیت سے مسئلہ خلافت میں تحریراً و تقریراً حصہ لینے لگے اور اہل اسلام میں گویا ایک حالتِ جدیدہ ہو گئی

---

[1] یعنی لوگوں کے لئے آسانی کرو، دشواری میں مت ڈالو۔ لوگوں کو بشارت دو احکام دین سے نفرت نہ دلاؤ۔ ۱۲

سوائے شاذ افراد کے اہلِ اسلام کا اتحادِ خیال اور قومی تحریک میں لوگوں کی بے ت شرکت جو آج مشاہدہ ہو رہی ہے حضرت مولانا کے اعلان سے پہلے مفقود نہیں تھی بلکہ دار معلوم ہوتی تھی۔

ابھی یہ اعلان رفتہ رفتہ قلوب میں اثر کر رہا تھا کہ حضرت نے اپنی وفات سے پورے ایک ماہ پہلے ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء) کو باوجود شدت مرض کے بنائے مُسلم یونیورسٹی کے جلسہ میں خود شرکت کر کے اپنا درس عبرت یعنی مؤثر خطبۂ صدارت پڑھوا کر سنوایا جس میں موجودہ تکالیف و مصائب کی طرف کچھ اشارہ کرنے کی ضمن میں باثر آیات قرآنی پیش کرنے کے بعد اسلامی یونیورسٹی کا اظہار ضرورت لیڈران قوم کی تحسین، نوجوانان قوم یعنی طلبہ کی ہمت افزائی فرمانے کے بعد تعلیمی ترک موالات کی تائید فرمائی تھی اور اسی خطبہ کے اخیر میں اپنی پُر درد تحریر کا اضافہ فرمایا جو چند روز قبل بعض طلبائے علی گڑھ کے جواب میں تحریر فرمائی تھی جس میں اسلامی مصائب کو رقت انگیز طرز سے شمار کرنے کے بعد آیات و احادیث سے موالات کفار کی مذمت، ترک موالات کی ضرورت بعض شبہات کے جواب میں بیان فرمانے کے بعد ہندو مُسلم اتحاد کی تحسین کرتے ہوئے ایسی مصالحت و رواداری کے برتاؤ اور حسن سلوک کا ارشاد فرمایا جس سے احکامِ مذہبی پر بُرا اثر نہ پڑے اور شرک و کفر کی نوبت نہ آجائے۔

حضرت مولانا کی یہ تمام تحریرات اخبارات و اشتہارات اور مسائل وغیرہ کی مختلف صورتوں میں ہزار ہا تعداد میں شائع ہو کر اہل اسلام تک پہنچی۔ اور ان کا ایک خاص اثر ہُوا جس کا نتیجہ آپ حالت موجودہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔

آخر آپ نے اسی مبارک سعی اور جہاد بالقلم واللسان میں اپنی پاک زندگی کو ختم کر دیا اور مرض الموت میں دہلی کی جمیعۃ العلما کی صدارت کو قبول فرما کر اس کے اہتمام و تعلق کی وجہ سے اشتداد مرض کی حالت میں بھی وطن آنا گوارا نہ کیا۔ اور وفات سے صرف آٹھ روز پہلے قومی عروج کے سنگ بنیاد یعنی علماء ہند کے اس بے مثل و عظیم الشان اجتماع کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی فرمائی جو انشاء اللہ تعالیٰ موجودہ مُسلمانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کی عظیم الشان

فوائد بخشنے کے ساتھ ہی حضرت قدس سرہٗ کے لئے باقیات صالحات اور بہترین یادگار رہے گا۔

جمعیۃ العلماء کی اہمیت اور اپنے قلبی اور قومی تعلق کے تقاضا سے حضرت بار بار جلسہ گاہ تک جاکر شریک ہونے کا قصد فرماتے رہے۔ لیکن مرض کی تکالیف اور اطباء کی ممانعت سے مجبور ہو گئے۔ اور تیسرے دن جمعیۃ کے آخری اجلاس میں آپ کی ایک مختصر مگر نہایت پر مغز ماقلّ و دلّ سب سے آخری تقریر پڑھی گئی جس کے چند ضروری جملے نقل کر کے آخری حیات میں حضرت مولانا کے تعلق بالسیّنیات کو واضح کر کے ہم اس بحث کا خاتمہ کرتے ہیں۔

"مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت مسرت ہوئی کہ جسم قوم کی رُوح (جماعت علماء) نے بعض ان شعب سیاسیہ میں پھر اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے جن میں وُہ بالکل مردہ سمجھے جاچکے تھے اور جن میں اگر وہ مُردہ ثابت رہتے تو اسلامی عزت و وقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا آپ رنجیدہ نہ ہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم وتدین اگر اب بھی عالم اسلامی کے خوفناک مصائب سے آنکھ بند رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دُنیا ہماری غیرت ایمانی اور شرافت انسانی دونوں کے بہ یک وقت دفن کئے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔

اب ہم سب کو مل کر متوکلاً علی اللہ ان تجاویز پر عمل کرنا اور کرانا چاہیئے جن سے ہمارے ایمان ہمارے کعبے، ہماری خلافت، ہماری عزت و آبرو اور ہمارے وطنی اور قومی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت ہم نے غفلت اور تن آسانی اختیار کی تو شاید عافیت حاصل کرنے کا یہ آخری موقع ہوگا جس کو ہم جان بُوجھ کر اپنے ہاتھوں سے کھوئیں گے۔"

تصنیفات وتالیفات، تحریرات وفتاویٰ

حضرت مولانا کی تصنیف وتالیف کی تعریف کرنا " مادح خورشید مداح خوداست" کا مصداق بننا ہے اور ان کی نسبت کوئی تبصرہ کرنا یا مفصل بیان لکھنا معمولی اہلِ علم کی وسعت سے خارج ۔ لہٰذا معمولی مختصر حالات واسبابِ تالیف لکھنے کے ساتھ صرف نام شمار کرا دینے کے سوا کچھ چارہ نہیں ۔ حضرت کی تصنیف جس کی تصنیف جس مبحث پر دیکھئے گا معلوم ہوگا کہ دریائے علم وتحقیق موجیں مار رہا ہے اور جنابِ مؤلف بالکل شرح صدر کے ساتھ انتہائی درجہ تحقیق پر پہنچے ہوئے دُوسروں کے سمجھانے کی سعی فرما رہے ہیں ۔

مولانا کو اپنے اکابر کے ساتھ معمولی عقیدت نہ تھی ۔ بلکہ ان کی محبت وعظمت بدرجۂ کمال دل میں جاگزیں تھی ۔ جب ان کی نسبت کوئی خلافِ ادب کلمہ سنتے یا ان پر کسی کا اعتراض دیکھتے یا تعریض سمجھتے تو تابِ خاموشی نہ لا کر لب جنبانی پر مجبور ہو جاتے ۔ آپ کی تمام تصنیفات اسی داعیۂ انتصار للمظلوم اور ذبّ عن السلف سے لکھی گئی ہیں اور ابتداءً شوقِ تالیف کی محرک بھی یہی نیت حسنہ ہوتی ہے ۔

ادلہ کاملہ جس کا نام اظہار الحق بھی ہے دو جزو کا ایک مختصر رسالہ اور سب سے پہلی تصنیف ہے اور حضرت کی نوجوانی کی تیزی اور شوخی اس کی عبارت میں نمایاں ہے دیباچہ میں زیادہ اور اصل مضمون میں کچھ کم ۔ لیکن برخلاف عام مصنفین کے ابتدائی تصانیف میں وہ بات نہیں ہوتی جو آخری تصانیف میں ہے ۔ حضرت مولانا کی یہ پہلی کتاب بھی آئندہ تصانیف کی طرح مکمل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ پر مضامین اور دقیق ومدلل ۔ اہلِ علم ہی کچھ داد دے سکتے ہیں کہ کس طرح بڑے بڑے مضامین کو مختصر عبارت میں ادا فرمایا ہے اور اسی لئے عوام تو عوام معمولی اہلِ علم کے فہم سے بھی باہر ہو گئی ہے ۔

اس تالیف کی تحریک اس طرح ہوئی کہ تقریباً اڑتالیس ۴۸ سال ہوتے کہ اہلِ حدیث

کے مشہور عالم مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی نے مذہب حنفیہ پر اعتراض کرنے کے لئے ایک اشتہار شائع کیا اور گویا تمام حنفیانِ ہندوستان کو اعلان جنگ دے دیا، کہ رفع یدین ۔ قرأتِ فاتحہ ۔ آمین بالجہر ۔ نفاذ قضاء قاضی وغیرہ دس مسئلوں کو اگر کوئی عالم حنفیہ کے طرز پر آیت قرآنی یا صحیح حدیث سے ثابت کر دے تو فی مسئلہ دس روپیہ نذر کریں ۔ یہ اشتہار دیوبند بھی پہنچا ۔ یہ سخت حملہ عموماً تمام حنفیوں کو شاق گذر رہا تھا اور پنجاب کے کسی حنفی عالم نے اپنی وسعت کے موافق کچھ جواب لکھا بھی تھا ۔ حضرت مولانا اور آپ کے محترم اُستاد مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو یہ ناگوار طرز اور یہ تعلی نہایت ہی ناپسند آئی اور اہل علم کی شان سے بعید نظر آئی اور اس صورت میں بالالتزام گویا صاحبِ مذہب امام الائمہ کی توہین محسوس ہوئی ۔ اور خیال فرمایا کہ اگر معقول جواب نہ دیا گیا تو تمام احناف کے لئے باعثِ خفت ہوگا اور معترضین کو عوام کی ابلہ فریبی کا موقع ملے گا ۔ حضرت مولانا نے اُستاد مکرّم کی اجازت و اشارہ سے قلم اٹھایا اور اختصاً کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا جواب لکھا کہ قلم توڑ دیئے ۔ ہر اعتراض کا بظاہر ایک الزامی جواب ہے لیکن حقیقت میں اسی الزامی کے ضمن میں ہر جگہ ایک جواب تحقیقی بھی موجود ہے ، بلکہ بعض جگہ دو دو تحقیقی جواب ۔ اور اسی پر بس نہیں کی ۔ اخیر رسالہ میں معترض کے مسلک پر گیارہ اعتراض ایسی زبردست چسپاں کئے کہ مقابل کسی طرح سر نہ اُٹھا سکے ۔ یا تو اپنا مسلک چھوڑ کر خفت اُٹھائے یا اعتراضوں کے بارگراں میں دبا رہے حضرت اُستاد نے نہایت پسند فرما کر طبع کرانے کا ارشاد فرمایا اور آئندہ تالیف کے لئے ہمّت بندھا دی ۔

ایضاح الادلہ ۔ ادلہ کاملہ شائع ہونے کے بعد حضرت مولانا منتظر تھے کہ دیکھئے نتیجہ کیا ہوتا ہے حق واضح دیکھ کر مخالف خاموش ہو جاتے ہیں یا حق سے چشم پوشی کر کے دفع عار کے لئے جواب لکھتے ہیں ۔ مولوی محمد حسن صاحب کچھ عرصہ تک اپنے ماہوار رسالہ اشاعۃ السنۃ میں وعدہ فرماتے رہے کہ عنقریب جواب لکھیں گے

لیکن کچھ دنوں کے بعد خاموش ہو رہے اور خلاف امید اہل حدیث کے لقب دادہ احسن المناظرین مولوی سید احسن صاحب امروہی کے نام سے ادلہ کاملہ کے جواب میں ایک رسالہ رجس کا غیر موزوں نام اس کے مضامین کا نمونہ ہے) مصباح الادلہ لدفع الادلہ طبع ہو کر مشتہر ہوا۔ حضرت مولانا نے جواب لکھنے میں توقف فرمایا کہ شاید مولوی محمد حسین صاحب بھی کوئی جواب لکھیں تو ایک ہی تالیف میں دونوں کا جواب دیا جائے لیکن جب مولوی صاحب موصوف نے اپنے رسالہ میں اعلان کر دیا کہ " ہمارا قصد جواب لکھنے کے لئے مصمّم تھا لیکن سید محمد حسن کی کتاب لاجواب و باصواب ہے اب ہمارے لئے اس کا جواب لکھنا فضول ہے " تو حضرت مولانا نے اُستاد مقدس کی اجازت سے جواب کے لئے قلم اُٹھایا اور اپنے نہایت مختصر اور دقیق رسالہ ادلہ کاملہ کی دلائل کو ایک شاندار بسط سے بیان کرتے ہوئے مجیب صاحب کے اعتراضات کا جواب اور ان کی غلطیوں کی تشریح شروع کی ، اور ایضاح الادلہ اسم بامسمّٰی اور موزوں نام رکھا۔ تازہ تازہ علم کا وفور اور مقدس اُستاد کی خوشنودی کا نیک خیال اور احقاقِ حق کا جوش دشواریوں کو آسان کر رہا تھا محنت کو راحت بنا دیتا تھا۔ مطالعہ اور درس و تدریس کی فراغت کے بعد اکثر رات کو جواب لکھتے اور دن کو جس وقت اُستاد علیہ الرحمۃ کو فرصت ہوتی اپنی اپنی تحقیق سنا کر تحسین و آفرین اور مبارک دُعاؤں کا انعام حاصل فرماتے۔

حضرت کے شوق تحقیق اور باکمال اُستاد کی تاکید و تحسین نے تھوڑے ہی دنوں میں قرأت فاتحہ کی دشوار گزار منزل کو بھی طے کرا دیا اور حضرت مولانا نے پچیس سال کی عمر میں اپنے آپ کو ابجد خواں نادانی کہتے ہوئے احادیث ، آیات کے متعلق وہ عجیب غریب تحقیقات بیان فرمائی کہ پرانے اور تجربہ کار عالم دنگ رہ گئے۔ یہ بحث اچھی طرح ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اکابر علمائے ہندوستان اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو سفر حج پیش آیا اور ایک عجیب دبے مثل اہل علم و عرفان کا مجمع ہندوستان سے حرمین کی خاکبوسی کو روانہ ہوا اور حضرت مولانا نے بھی شرکت اختیار فرمائی جس کو اپنے الفاظ میں یوں ادا فرماتے ہیں کہ " دیکھا بھائی بعض بعض ہم جلیسوں نے بھی دفعیۂ نظر بد کے

لئے ہمرکابیٔ اہل اللہ اور گرد افشانیٔ راہ بیت اللہ اختیار کی اور بہرکت اقدام اکابر مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوکر وطن واپس آگئے۔"

واپسی کے بعد مخدوم اُستاد کی علالت اور درس و تدریس کے علاوہ شب و روز کی حاضری و خدمت نے تکمیل و تحریر کی فرصت نہ دی اور ان ایام میں (غالباً) ایک یا آدھی بحث لکھ کر سُنانا نصیب ہُوا تھا کہ دو برس تک مختلف عوارض کی تکلیف برداشت کرنے کے بعد مخدوم و مطاع وسیلۂ دارین اُستاد محترم نے وفات پائی اس نمونہ فزع اکبر میں حضرت مولانا کی حیرانی و پریشانی نے مشاغل علمیہ کو بالکل چھڑا دیا۔ خود فرماتے ہیں کہ "درس و تدریس کے نام سے نفرت اور کتاب کے خیال سے وحشت ہوتی تھی" (جیسا کہ ابتدا میں معلوم ہو چکا ہے) ایک ماہ کے بعد حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کی توجہ اور دلدہی سے حضرت مولانا نے تعلیم و تدریس کا کام جاری فرما دیا۔ لیکن یہ تصنیف ناتمام پڑی رہی جس کی ناتمامی اور تکمیل کا حال دیباچہ میں بایں الفاظ تحریر فرماتے ہیں۔

"تو اسی طرح جب ایک عرصہ گزر گیا تو مخدوم زادۂ عالم مطاع و مکرم جناب مولوی حافظ احمد صاحب زادہ اللہ علماً علی علم و فضلاً علی فضل خلفت الصدق حضرت مولینا معتمدی و مستندی و وسیلۃ یومی و غدی رحمۃ اللہ علیہ و علی اتباعہ نے تحریر مذکور کی تکمیل کے لئے فرمایا۔ ہر چند بوجہ تن آسانی و پریشانی احقر نے انکار کیا مگر ان کا اصرار احقر کے انکار سے بڑھا رہا۔ اس لئے ناچار اوراق مسطورہ نکال کر بنام خدا پورا کیا اور جملہ دفعات باقیہ کا جواب لکھ کر تعمیلاً للحکم مولوی صاحب کے حوالہ کیا۔"

حضرت مولانا نے اس کتاب میں شرح معانی حدیث اور تطبیق بین الروایات اور توفیق اقوال المجتہدین بالحدیث میں اپنے خداداد تفقہ فی الدین کا نمونہ دکھلایا ہے اور مختلف ابحاث کے ضمن میں ایسے مضامین عالیہ بیان فرمائے ہیں کہ اذہان متوسط کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی اور آیات قرآنی اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ اقوال فقہاء و مجتہدین کی بھی اس خوبی سے شرح فرمائی ہے کہ بے ساختہ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْحَقُّ الْمُبِیْن زبان سے نکل جاتا ہے اور قرأت فاتحہ اور نفاذ قضاء قاضی اور نکاح محرمات

اور زیادہ نقصانِ ایمانی کی ابحاث میں بے مثل تحقیقات کو دیکھ کر الہام من عند اللہ کا یقین ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ اردو عبارت نہایت سلیس تعریفات و اشارات د بے شمار اور با موقع۔ اردو فارسی کے پر مغز و ذائقہ دار اشعار۔ اس بے مثل خزینۂ علوم محدثین کو چار سو صفحات پر ختم کر کے ۱۲۹۹ھ میں مولانا نے فراغت پائی اور اسی وقت طبع[1] ہو کر مقبولِ خاطر اہل علم ہوا۔ حضرت مولانا کے علوم و کمالات کے لئے اگر بالفرض دنیا میں کوئی بھی ثبوت اور کوئی بھی یادگار نہ ہوتی تو یہی کتاب کافی تھی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ عنا و عن سائر المسلمین۔

احسن القریٰ فی توضیح اوثق العریٰ۔ ایضاح ادلہ سے چودہ سال کے بعد حضرت نے اس کتاب کے لئے قلم اٹھایا اور باعث وسبب تالیف اس کا بھی وہی دفع العارعن الاکابر اور جوش تحقیق حق ہوا۔ یعنی کسی شخص کے استفتاء پر دہلی کے اہل حدیث نے یہ جواب دیا کہ جمعہ میں کسی مکان کی تخصیص نہیں۔ جب دو شخص کسی جگہ مل کر جمعہ پڑھ لیں گے جمعہ ہوجائے گا۔ اور ان میں سے کسی دستخط کرنے والے نے اس مسئلہ میں مذہب حنفیہ کو ہوسً من ہوسات الشیطان کہہ کر اپنی عاقبت سنواری۔ یہ فتویٰ جب گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب (قدس سرہٗ) کی خدمت میں پیش ہوا تو حضرت ممدوح نے اس جواب کو خلاف حق و تحقیق خیال فرما کر موافق مذہب حنفیہ جواب لکھوایا اور روایات صحیحہ سے اپنے مدعا کو محقق فرمایا اور یہ ثابت کر دیا کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں دیہات و قریٰ میں جمعہ کا کہیں وجود نہ تھا۔

یہ رسالہ بنام اوثق العریٰ بصورتِ رسالہ مطبوع ہو کر شائع ہوا تو مولوی محمد سعید صاحب بنارسی نے مستقل جواب لکھا اور مولوی محمد علی صاحب اعظم گڈھی نے مولانا ظہیر الحسن صاحب کے رسالہ جمعہ کے جواب کے اخیر میں اوثق العریٰ پر اعتراضات کئے۔ چونکہ ان دونوں

---

[1] پھر ۱۳۳۰ھ میں احقر نے تصحیح کا اہتمام کیا اور جابجا حضرت مولانا سے دریافت کر کے اغلاط کتابت کی اصلاح کی اور اکتیس برس کے بعد دوبارہ نہایت عمدگی سے طبع ہو کر شائع ہوئی اور حضرت مولانا نہایت مسرور ہوئے ۱۲۔ فقیر اصغر حسین عفی عنہ

رسالوں میں مذہب حنفیہ کی نسبت سخت الفاظ استعمال کئے گئے تھے اور حضرت مولانا گنگوہی مؤلف رسالہ قدس سرہٗ کی طرف خلاف واقعہ امور منسوب کئے گئے تھے اس لئے حضرت مولانا کے جوش ایمانی نے حمایتِ حق پر قلم اٹھانے کے مجبور کر دیا۔ اور مولوی محمد سعید صاحب کے رسالہ کے جواب کو مقصود بالذات رکھ کر اسی کے ذیل میں اعظم گڑھی صاحب کی نکتہ چینیوں کا بھی جواب دیا۔ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ "تعجب یہ ہے کہ ان ہردو رسائل کو دیکھ کر اس ہیچمدان کو بھی خود بخود شوقِ تحریر جواب دامنگیر ہوا اور بسم اللہ کہہ کر بلا تامل قلم ہاتھ میں لے بیٹھا۔ حالانکہ اہل علم و فہم کے نزدیک ان جوابوں سے انشاء اللہ تعالیٰ اوثق العریٰ میں کوئی ضعف پیدا نہیں ہوا اور نہ مجھ جیسے کی تائید کی کوئی حاجت۔ نہ کسی بڑے چھوٹے نے مجھ کو اس کام کے لئے مجبور یا مامور کیا۔"

اس ضخیم کتاب کی عبارت مولانا کی تمام تصانیف سے زیادہ شگفتہ اور سلیس اور رواں ہے اور مولانا کی مہذب ظرافت اور بذلہ سنجی بہ نسبت دیگر تصانیف کے اس میں زیادہ نمایاں۔ اثبات مدعا کے لئے احادیث و اقوال محدثین کے علاوہ جا بجا آیات اور احادیث کی طرف لطیف اشارات اور موقع بموقع ادیبان عرب کے مشہور مقولے اور اہل عرب کی زبان زد مثالیں تحریر فرماتے جاتے ہیں کبھی عارف شیرازی کے شعر سے بیان میں جان ڈال دیتے ہیں اور کبھی استاد ذوق و غالب کے کلام سے لطف دوبالا کر دیتے ہیں اور بسط و طول کی پروا نہ کر کے نہایت سلاست سے اظہار مقصود و افہام مطلوب میں انتہائی سعی فرماتے ہیں اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اختصار میں جو حقائق غامضہ اور معانی دقیقہ عقول متوسطہ سے مخفی رہ گئے تھے ان کے اظہار میں کمال کر کے ناظر فہیم کو متحیر بنا تے ہیں۔ کبھی وہ حضرت مؤلف کے فضل و کمال وسعت نظر اور قوت استدلال پر عش عش کرتا ہے اور کبھی حضرت مولانا کے ذہن رسا، کمال فہم اور حسن بیان پر سبحان اللہ کہتا ہے۔

مذکورہ بالا دو جوابوں کے بعد اوثق العریٰ کا ایک بہت مختصر جواب ایک

غیر مشہور عامل بالحدیث مولوی مولا بخش خانصاحب نے بھی لکھا تھا۔ جس میں رسائل سابقہ سے کوئی بات زائد اور نئی نہ تھی بعض لوگوں کے اصرار سے حضرت نے اس کا بھی مختصر جواب بنام التلمیع الی مفاسد التجمیع تحریر فرما کر احسن القریٰ کے اخیر میں بطور ضمیمہ ملحق فرما دیا اور چونکہ خانصاحب نے جسارت اور بیباکی سے کام لیا تھا، اور بزرگوں کی نسبت سخت الفاظ کا استعمال کیا تھا حضرت مولانا نے بھی علیٰ سبیل الانتصار ومدافعت عن العشیرہ تلمیحات واشارات اور برمحل اشعار اور برجستہ فقرات سے اس طرح مہذب خبر لی کہ باحیا کو گردن اٹھانے کی جگہ نہ رہے۔

با ایں ہمہ عظمت وشان حضرت مولانا کی خاکساری اور خلوص وعقیدت اور قدر شناسی اکابر کا یہ حال تھا کہ زمانۂ تصنیف میں احسن القریٰ کے اجزاء گنگوہ لے جاتے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ کو سُناتے اور اصلاح کے منتظر رہتے۔ مولانا ممدوح کتاب کے مضامین سُن کر نہایت محظوظ ہوتے اور قلبی فرحت کیساتھ حضرت مولانا کی تحقیقات کی داد دیتے۔ یہ کتاب حضرت مولانا گنگوہی کی حیات ہی میں آپ کے مخصوص ومعزز خادم مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام سے طبع اور شائع کی گئی۔

جہد المقل

فی تنزیہ المعزّ والمذلّ۔ یہ رسالہ مولانا کی تصانیف میں ایک مستقل شان رکھتا ہے اوّل تو بحث ہی من حیث المعقول پھر روئے سخن ایسے حضرات کی طرف جو بخیال معتقدانِ خود ان علوم میں یکتائے روزگار اس لئے موقع موقع آپ نے مضامین واستدلالات میں اسی علم کو استعمال فرمایا ہے اور انتہائے تحقیق سے نظریات کو مثل البدیہیات واضح اور مشاہد کرا کے دکھلا دیا ہے جس سے علوم نقلیہ میں مسلم الکل ہونے کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوگیا کہ علوم عقلیہ میں مولانا کا کیا درجہ اور کس قدر زبردست پایہ ہے۔

منشائے تحریر یا سبب تالیف اس رسالہ کا بھی وہی امر مشترک فی جمیع التالیفات

ہے یعنی خلوص نیت و ذب العارعن السّلف وحمایت اہل اللہ، اور صورت اس کی یہ ہوئی کہ بعض مروّجان بدعت اور مخالفانِ حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ کی تحریک و ترغیب سے مولانا احمد حسن صاحبؒ پنجابی مدرس مدرسہ کانپور نے ابطال امکانِ کذب میں بسُوط رسالہ تحریر کرکے شائع کیا۔ جس میں مولانا شہید اور ان کے ہم عقیدہ حضرات کو فرقہ ضالہ مزداریہ میں (جو معتزلہ میں سے ایک گروہ ہے) داخل کر دیا اور اس پر تقریظ لکھنے والوں نے تو اکابرِ دین کی نسبت ایسی زبان درازی کی اور ایسے کلمات سے یاد کیا کہ سُننے والا تاب نہ لاوے۔ حضرت مولانا کو طیش تو بہت آیا مگر بمقتضائے علم و تقویٰ یہ فرمایا کہ "ان گستاخ لوگوں کو برا کہنے سے تو اکابر کا انتقام پُورا نہیں لیا جا سکتا، اور ان کے اکابر کی نسبت کچھ کہہ کر اگر دل ٹھنڈا کیا جائے تو وُہ لوگ معذور و بے قصور ہیں"۔

بہر حال حضرت مولانا نے طعن و تشنیع اور تفسیق و تضلیل کے جواب سے بفحوائے اِذَا مَرُّوْا عَلَى اللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا اعراض فرما کر مولوی احمد حسن صاحب کو عالم اور مہذّب اور بزرگوں کا صحبت یافتہ خیال کرکے بامید انصاف و رجوع الی الحق مخاطب بنا کر غایت تحقیق سے جواب تحریر فرمانا شروع کیا اور چند مقامات کو عقلاً و نقلاً ثابت کرنے کے بعد بطور تمہید ایک نہایت پر زور بسیط تقریر تحریر فرمائی جس کے سننے اور دیکھنے سے اہلِ علم کے دل منوّر ہوتے ہیں اور آنکھیں روشن۔ اور اس کے بعد مسئلہ مبحوث عنہا میں صاحب رسالہ کے جواب کے ضمن میں مسائلِ علمِ کلام کی تحقیقاتِ عجیبہ اور علوم منطقیہ کی تدقیقات غریبہ فرمانے لگے۔ استدلال پر استدلال بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور عبارت پر عبارت نقل فرماتے ہیں کتب متداولہ اور غیر متداولہ اور شروح و حواشی کے ایسے غیر مانوس اور بعید مقامات کی عبارات نکال کر سامنے رکھدیتے ہیں جن کی طرف کسی کا خیال بھی نہ جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ باکمال مجیب کے سامنے تمام کتابوں کے صفحات کھلے ہوئے پڑے ہیں جن سے وُہ بے تکلف اپنے مفید مدّعا اقوال نقل کر دیتے ہیں یا خزینۂ حافظہ میں تمام عبارات محفوظ اور قلب مصفّی کے آئینہ میں تمام مضامین منعکس ہو رہے ہیں کہ نقل مستدل میں دیر ہی نہیں لگتی اور اسی پر اکتفا نہیں

عبارات کی شرح فرما کر صحیح مطلب اور واقعی مطلوب سمجھاتے ہیں اور جن عبارات کو مؤلف تنزیہ الرحمٰن نے سرسری نظر میں اپنے لئے مفید سمجھ کر پیش کیا تھا۔ وہاں عبارات واقوال کا حقیقی مدعا بقرائن و دلائل وشواہد واضح فرما کر مؤلف صاحب کی غلطی کا اظہار کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حضرت مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کی تائید اور ان کی حقانیت کا اظہار کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حضرت مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کی تائید اور ان کی حقانیت کا اظہار فرماتے جاتے ہیں۔ اور جب کلام نفسی ولفظی کی مشہور و مزلۃ الاقدام بحث شروع ہوتی ہے تو حضرت مولانا ایک اعلیٰ ثبات و استقلال سے بفرحت و انشراح ایسی تحقیقات و تقریرات فرماتے ہیں کہ گویا لوح محفوظ سے دیکھ دیکھ کر فرما رہے ہیں اس بے مثل رسالہ کی نسبت کچھ زیادہ لکھنا حدِ ادب سے نکلنا ہے۔ دو حصوں میں تقریباً تین سو صفحہ پر طبع ہو کر مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام سے شائع ہوا۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ اس کی طبع و اشاعت میں اتنی تاخیر ہوئی کہ اصل مخاطب یعنی مولانا احمد حسن صاحب مقیم کانپور کی وفات ہو گئی اور غالباً قبل الطبع بھی ان کی خدمت میں نہیں پہنچ سکا۔

ترجمۃ القرآن المجید:- بعض اہل علم کی استدعا اور بہت مصالح سے اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی غایت آرزو دیکھ کر حضرت مولانا کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا خیال ہوا لیکن بجائے ترجمہ کرنے کے آپ نے مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کی خدمتِ تصحیح و ترمیم اختیار کی اور خلاف محاورہ الفاظ کی تبدیل و تغیر کا التزام فرمایا اور حاشیہ پر فوائد و نکات بھی بیان کرنے شروع کئے۔ مختلف ترجمے اور معتمد تفسیریں حضرت کے سامنے کھلی رہتیں اور خدام و تلامذہ اور فارغ التحصیل طلبہ خدمت میں بیٹھتے۔ اور ان تراجم و تفاسیر کو دیکھتے رہتے۔ آپ کے خادم خاص مولوی احمد اللہ صاحب خدمت کتابت کو انجام دیتے اور آپ املا فرماتے اور ایک ایک لفظ بہت سی تحقیق اور غور کے بعد لکھا جاتا۔ ہندوستان میں

چھ بارے سے زیادہ مکمل ہوگئے تھے باقی آپ نے بحالتِ اسیری بمقام مالٹا بلا موجودگی کتب کے مخصوص توجہ اور پورے غور و فکر سے تمام کیا اور جیسا کہ سابقاً گزر چکا ہے ماہ شوال ۱۳۳۶ھ میں باعانت خداوندی یہ عظیم الشان کام آپ کام آپ کے دستِ حق پرست سے انجام کو پہنچا اور حضرت کو مسرت روحانی حاصل ہوئی۔

اس ترجمہ کی ابتدا میں حضرت مولانا نے ایک بسیط مقدمہ مشتمل مضامین عالیہ تحریر فرمایا ہے جو خود ایک مستقل علمی رسالہ ہے جس میں قدیم ترجمہ کے بیش قدر علمی نکات اور دقیق محاسن بہ تشریح و بیان امثلہ واضح فرماتے ہیں جن سے حضرت شاہ صاحب کا تبحر علمی نکات اور دقیق محاسن بہ تشریح و بیان امثلہ واضح فرماتے ہیں جن سے حضرت شاہ صاحب کا تبحر علمی اور تفقہ فی الدین اور اس کے ساتھ ترجمہ کا حسن ظاہر ہوتا ہے اور خود جن امور کی رعایت فرمائی ہے ان کو بھی بیان کیا ہے نظر بندی سے رہائی کے بعد حضرت مولانا اہلِ علم کے مجمع میں اس کو سنا کر خود بشاش ہوتے اور دوسروں کو محظوظ کرتے بڑے بڑے اہلِ علم و کمال اس کو سن کر اپنے عجز و قصور کے معترف ہوتے اور مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا کے قائل۔ ترجمہ اور مقدمہ اب تک حضرت کے وارثوں کے قبضہ میں محفوظ ہے۔

الابواب والتراجم:۔ حضرت مولانا کو علوم حدیث میں کمال حاصل ہونے کے ساتھ ہی اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری سے ایک مخصوص مناسبت تھی۔ اور حضرت مولانا اس مخزن علوم حدیث کے غوامض و دقائق، اسرار و حقائق سے باحسن الوجوہ واقف اور ماہر تھے اور اس کے درس و تدریس میں آپ کو ایک خاص حظ حاصل تھا۔ اور مناسبت التراجم بالابواب میں شروح و حواشی کے علاوہ اپنی نفیس و گرانمایہ تحقیقات بھی بیان فرمایا کرتے تھے نظر بندی مالٹا

میں ترقی درجات و رفعتِ مقامات کے ساتھ وحی الٰہی کا ترجمہ ختم کرتے ہوئے علوم قرآن پر مزید غور کرنے سے مناسبت بالاحادیث کو اضعاف مضاعف ترقی ہوئی اور علوم بخاری گویا منکشف ہوکر ایک داعیۂ غیبی بخاری شریف کے متعلق کسی تحریر کا محرک ہوا اور حضرت نے تراجم بخاری کے متعلق متفرق اوقات میں بطرزِ یادداشت کچھ تحریر فرمانے کا ارادہ کیا اور ایسے زمانہ میں کہ آپکے پاس بخاری شریف کا صرف ایک مصری نسخہ بلا حاشیہ و بین السطور موجود تھا، حسب معمول سلیس اردو میں اپنی تحقیق اور بہترین مناسبت بالابواب تحریر فرمانی شروع کی۔ اور جس قدر تحریر فرمانا مدنظر تھا۔ ابھی اس قدر لکھنے کی نوبت نہ آئی تھی بلکہ ابتدائی ۶۷ ابواب کے متعلق لکھا گیا تھا کہ قید فرنگ سے رہائی ہوئی اور ہندوستان پہنچ کر کچھ ایام کثرت زائرین و مہمانان میں اور کچھ ضروری سفر میں اور باقی تکالیف و مرض میں گزر کر صرف پانچ ہی ماہ کے بعد وفات ہوجانے سے یہ عظیم الفوائد تحریر ناتمام رہ گئی۔ حضرت کی یہ آخری تصنیف اسی ناتمام حالت میں مولانا حسین احمد صاحب کی حسن سعی سے بصورت رسالہ مرتب ہوئی اور مولانا عزیز گل صاحب کے اہتمام سے طبع ہوکر شائع ہوگئی۔ اس کی ابتداء میں حضرت مولانا کے حالات اور صورت تالیف کتاب کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب کا نہایت مختصر مگر شاندار دیباچہ ہے اور پھر تراجم بخاری کے متعلق حضرت مولانا کے تحریر فرمودہ پندرہ اصول اور پھر اصلی مقصود یعنی کتاب الایمان کے ابواب و تراجم کے متعلق تحریر ہے اور پھر ابواب و تراجم کے اصول میں حضرت مولانا کی ایک عربی تحریر درج ہے اور سب سے آخر میں ابواب بخاری کی ایک جدید و مفید نہایت کارآمد فہرست حضرت ہی کی مرتب فرمودہ ہے غرض یہ تالیف حضرت کی بہترین آخری یادگار ہے اور مشتغلین فن حدیث کے لئے ایک کامل اُستاد اور معین مددگار۔

ان عظیم النفع علمی تصنیفات خمسہ معتبرہ کے علاوہ صحاح اربعہ و بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، خصوصاً ترمذی و بخاری کے متعلق حضرت مولانا کی اثنائے درس

ہیں فرمائی ہوئی تقریریں جو صدہا طلبہ نے ضبط کی ہیں اور نقل در نقل ہو کر ان کے ہزارہا قلمی نسخے ہو گئے ہیں جن میں مضامین علمیہ تحقیقات احادیث اور تفصیل مذاہب اور ترجیح مذہب ابی حنیفہ بطرز محققانہ بکمال شرح و بسط مذکور ہیں بطرز بزرگان سلف مولانا کی افضل التصانیف میں شمار ہونے کی قابل ہیں جو انشاء اللہ تعالیٰ مطبوعہ تصانیف سے بھی زیادہ حضرت مولانا کے لئے باعث اجر و صدقہ جاریہ رہیں گی۔

تصحیح ابی داؤد بھی حضرت قدس سرہٗ کی ایک قابل وقعت خدمت حدیث اور کامل اہتمام اور نہایت عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔ ابوداؤد کے قلمی و مطبوعہ قدیم جدید نسخوں کو جمع فرما کر آپ نے ان کے مطالعہ اور مقابلہ سے ایک صحیح نسخہ مرتب فرمانے کا ارادہ کیا۔ درس و تدریس سے فراغت پانے کے بعد آپ منتخب فارغ التحصیل طلبہ کی جماعت کو لے کر اور تمام نسخے سامنے رکھ تصحیح پر متوجہ ہوتے۔ ہر لفظ و اعراب کو صحیح فرماتے تعلقات عبادت کی رموز ثبت فرماتے اور دوسرے نسخوں کی عبارات زوائد جو قلم ناسخین سے متن میں شامل ہو گئی تھی ان کو بہ حسن ترتیب حاشیہ پر درج کراتے اور جو عبارات و الفاظ غلطی سے چھوٹ گئے تھے ان کو اضافہ فرماتے اور دیگر کتب حدیث و شروح سے بھی مدد لے کر صحت میں کوشش فرماتے طویل مدت اور کمال محنت سے ایک نسخہ بغایت صحت مرتب ہوا جو ۱۳۱۸ھ میں مطبع مجتبائی دہلی میں طبع کیا گیا ہے یہ مخفی نہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے صرف متن کی صحت کی۔ اہل مطبع نے حاشیہ اور بین السطور کو ایک مولوی صاحب سے سرسری اور معمولی نظر سے صحت کرا کے قدیم مطبوعہ نسخوں سے نقل کیا ہے پس اس قسم کی غلطیاں حضرت مولانا کی تصحیح متن میں قادح و مخل نہیں ہو سکتی۔

۱۳۲۸ھ میں جب حضرت مولانا اور دیگر مقدس بزرگان ہمعصر کی سرپرستی میں دارالعلوم دیوبند سے رسالہ القاسم شائع ہوا تو حضرت مہتمم صاحبان مدظلہم کی

۱؎ اساتذہ کچھ فرماتے جاتے اور شاگرد قلم بند کرتے رہتے اس طریقہ املا پر جمع شدہ تصنیف کو امالی رکھتے تھے۔

فرمائش اور نیاز مند احقر کی استدعا اور مکرر معروض بلکہ تقاضا پر حضرت نے ایک محققانہ بے مثل مضمون بہ عنوان "عظمت وحی" تحریر فرمایا جو القاسم کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا مگر افسوس ہے کہ علمی کساد بازاری اور مسلمانوں کی ناقدردانی سے یہ نادر مضمون ایک مرتبہ القاسم میں چھپ کر نظروں سے چھپ گیا۔ دوبارہ بصورت کتاب طبع ہونے کی نوبت نہ آئی۔

ان تحریرات کے علاوہ حضرت مولانا کی بعض اردو نظمیں بھی رسالوں کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں اور بعض تاریخات وفات اور مرثیے وغیرہ متفرق طور سے طبع ہوتے ہیں۔

فتاویٰ

حضرت مولانا کے بقید کتابت ضبط و مرتب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ نہایت تواضع کی وجہ سے اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور دیگر مشاغل میں فرصت بھی نہیں ہوتی تھی۔ دارالعلوم میں باضابطہ دارالافتاء کے قیام سے پہلے جسقدر سوالات و استفتاء دارالعلوم میں اور خاص حضرت کے نام آتے تھے وہ سب فارغ التحصیل اور ذی استعداد طلبہ لکھتے تھے اور دارالافتاء قائم ہو جانے کے بعد حضرت مولانا کی خدمت میں آتے ہوئے تمام استفتاؤں کے جواب بھی حضرت مفتی صاحب مدظلہم تحریر فرماتے تھے۔ اس لئے خود تحریر فرمانے کی نوبت نہ آتی اور اگر کبھی ضرورتاً لکھتے بھی تو فتوے کو صورتِ مراسلت و خط و کتابت کے طرز میں بدل دیتے، علیٰ ہذا القیاس جو خطوط صورتِ استفتاء میں نہ ہوتے بلکہ شناسا خدام لوگ ضمن معروضات میں مسائل بھی دریافت کر لیتے۔ ان کے جواب خود تحریر فرماتے اور بعض مدرسین اور فارغ التحصیل حضرات مشکل مسائل آپ سے زبانی دریافت کر کے فتاویٰ تحریر کرتے۔ چنانچہ احقر راقم کو بھی اپنے اخیر زمانۂ طالب علمی میں تحریر فتاویٰ کا شوق ہوا اور کتاب دیکھنے کی فرصت نہ تھی تو حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ سے اور حضرت مفتی صاحب مدظلہم

لہ خاکسار نے تمام اردو منظوم کلام کو یکجا جمع کر کے بنام منظوم کلیات شیخ الہند طبع کرا دیا ہے۔ فقیر اصغر حسین دیوبندی۔

سے صدہا مشکل مسائل دریافت کرکے مفصل لکھدیتا تھا۔ غرض ان تمام اقسام کے فتاوی حضرت مولانا کے اگر شمار کیے جائیں تو ہزارہا ہو سکتے ہیں مگر مجموع و مکتوب نہ ہو سکے۔

دارالعلوم دیوبند سے جس قدر فتاوی جاتے تھے تقریباً سب ہی پر حضرت کی تصدیق و دستخط ہوتے تھے اور "الجواب صحیح" لکھ کر صرف بندہ محمود عفا اللہ عنہ" تحریر فرماتے تھے۔ عثمانی چشتی، صابری، قاسمی وغیرہ پُر معنے القاب سے نام کی عظمت نہیں بڑھانا چاہتے تھے ایک مخلص نے آپ کے نام نامی کی مہر بھی تیار کراکر بھیجدی تھی جو نقرئی انگشتری کے حلقہ میں لگی ہوئی کسی امین کے پاس محفوظ رہتی تھی اور کبھی شاذ و نادر کسی بہت مہتم بالشان فتوے پر یا کسی شخص کی انتہائی آرزو کی وجہ سے نام کے نیچے ثبت کردی جاتی تھی، اس میں آپ کا یہ پسندیدہ و مقبول سجع بہ ترتیب مزین کنندہ تھا۔ "الٰہی عاقبت محمود گرداں" ہم بھی اسی دعا پر آمین کہہ کر اس بیان کو ختم کرتے ہیں۔ آمین یا مجیب دعاء السائلین آمین۔

عبادت، ریاضت، شریعت، طریقت اور تصوف

علوم اسلامیہ کا نشر و اشاعت اور علم حدیث و تفسیر کا شغل شرعی نقطہ نگاہ سے بہترین عبادت اور افضل الطاعات سے ہے اور حضرت مولانا کے حالات سے ظاہر ہے، کہ تمام عمر اسی میں صرف ہوئی لیکن ہمارے عرف میں جس کو عبادت و ریاضت کہتے ہیں حضرت مولانا کا درجہ اس میں بھی نہایت اعلیٰ تھا۔ طالب علم کی مشغولیت میں اس قسم کی عبادات کا بہت کم لوگوں کو خیال ہوتا ہے مگر (جیساکہ حضرت کے ہمعصر لوگوں سے معلوم ہوا) مولانا ایام طالب علمی ہی سے قیام لیل کے پابند تھے اور حضرتِ استاد کی خدمت میں دہلی اور میرٹھ میں رہتے ہوئے جس طرح دن کو تعلیم و تعلم کا شغل رہتا تھا۔ رات کو ادائے اوراد و اذکار معمولہ مشائخ اور

تعلیم فرمودہ حضرت اُستاد کا شب کو دس گیارہ بجے تک حضرت اُستاد کی خدمت میں رہتے اس کے بعد گاہ گاہ شب کو مطالعہ وسبق دیکھتے۔ ذرا آرام کر کے نوافل و ذکر اللہ میں مصروف ہو جاتے۔ مخدوم استاد تمام خدام سے اپنی عبادت کو مخفی رکھنا چاہتے تھے لیکن حضرت مولانا کی خصوصیت نیز ان کی شب بیداری کی وجہ سے ان سے اخفاء کی کوشش بھی نہ کرتے تھے تعطیل کے ایام کو طلبہ اکثر لہو ولعب یا سیر و تفریح میں بسر کیا کرتے ہیں حضرت مولانا ان ایام کو اور ان کی راتوں کو عبادت کے لئے مخصوص کر لیتے۔

فراغتِ تحصیلِ علم اور قیام دیوبند کے بعد (جیسا کہ ابتدائی حالات میں مذکور ہو چکا ہے) باوجود تمام دن درس و تعلیم کی محنت برداشت کرنے کے عام طور سے شب کو دو بجے بیدار ہو جاتے اور بکمال اتباعِ سنت نوافل ادا فرماتے۔ اگر وقت میں تنگی نہ ہوتی تو طویل قیام اور طویل رکوع و سجود سے نماز ادا فرماتے اور اکثر نماز صبح تک بیدار رہ کر ذکر خفی میں مشغول رہتے لیکن گاہ گاہ فراغت کے بعد آرام فرماتے تھے اور جدید وضو سے نماز فجر ادا فرماتے تھے۔

رمضان المبارک میں آپ کے معمولات

رمضان المبارک میں مولانا کی خاص حالت ہوتی تھی اور دن رات عبادتِ خداوندی کے سوا کوئی کام ہی نہ ہوتا۔ دن کو لیٹتے اور آرام فرماتے لیکن رات کا اکثر حصہ بلکہ تمام رات قرآن مجید سننے میں گذارتے۔ کئی کئی حافظوں کو سنانے پر مقرر رکھتے۔ اگر وہ باہر کے رہنے والے خادم و شاگرد ہوتے تو ان کے قیام و طعام کا اہتمام فرماتے اور تمام مصارف برداشت کرتے۔ کبھی اپنے مرشد زادہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب (مہتمم دارالعلوم مدظلہم) سے اصرار کر کے کئی کئی قرآن مجید سنتے کبھی اپنے بے تکلف پیر بھائی حافظ انوارالحق مرحوم سے۔ کبھی اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد محسن صاحب کو مقرر فرماتے اور کبھی اپنے عزیز بھانجے مولینا

محمد حنیف صاحب کو۔ اور اخیر زمانہ میں اکثر مولوی حافظ کفایت اللہ صاحب اس خدمت سے سرفراز ہوتے تھے۔

تراویح سے فارغ ہو کر بہت دیر تک حاضرین کو مضامین علمیہ اور حکایات اکابر سے محظوظ فرماتے اور پھر اگر موقع ملتا تو چند منٹ کے لئے لیٹ جاتے اس کے بعد نوافل شروع ہوتے ایک حافظ دو چار پارے سُنا کر فارغ ہو کر آرام کرتا مگر حضرت اسی طرح مستعد رہتے اور دُوسرا حافظ شروع کر دیتا اسی طرح متعدد حفاظ باری باری کئی کئی پارے سُناتے قاری بدلتے رہتے تھے مگر مولانا کبھی دو تین بجے تک اور کبھی بالکل سحر کے وقت تک اسی طرح کھڑے سنتے رہتے۔

بعض رمضان میں فرائض مسجد میں پڑھ کر مکان میں بجماعت خدام و حاضرین تراویح پڑھتے اور اس طرح چار چار اور چھ چھ بلکہ کبھی دس دس پارے تراویح میں پڑھے جاتے تراویح ختم ہو جاتی تو کوئی حافظ نوافل میں شروع کر دیتا۔ تمام رات یہی لطف رہتا تھا۔ اور اس قدر طویل قیام کے باعث جب پاؤں ورم کر جاتے تو خدام و مخلصین کو رنج ہوتا اور حضرت دل میں خوش ہوتے کہ حتی[1] تو رمت قدماہ میں سید الاولین و الآخرین کا اتباع نصیب ہوا۔

ایک مرتبہ تقلیل طعام اور قلت منام اور پھر طول قیام سے رمضان المبارک میں نہایت ضعیف ہو گئے پاؤں کا ورم بہت زیادہ ہو گیا مگر قلبی شوق چین نہ لینے دیتا تھا۔ کثیر مقدار میں قرآن مجید سننے کے لئے مستعد تھے۔ آخر لاچار ہو کر مکان میں سے عورتوں نے مولوی حافظ کفایت اللہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ آج کسی بہانہ سے قلیل مقدار پر بس کر دینا مولوی صاحب نے تھوڑا سا پڑھ کر اپنی طبیعت کے کسل اور گرانی کا عذر کیا حضرت کو دُوسروں کی راحت کا بہت خیال رہتا تھا خُوشی سے منظور کر لیا۔ اندر حافظ صاحب لیٹ گئے باہر مولانا مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص آہستہ آہستہ پاؤں دبا رہا ہے۔ انہوں نے ہوشیار ہو کر

---

[1] حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم شب کو نماز میں اس قدر طویل قیام فرماتے تھے کہ قدم مبارک ورم کر جاتے

جب دیکھا کہ خود حضرت مولانا ہیں تو اُن کی حیرت اور ندامت کا کچھ ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ خود حضرت فرمانے لگے کہ نہیں بھائی کیا حرج ہے تمہاری طبیعت اچھی نہیں ذرا راحت آجائے گی۔

کیفیّاتِ قلبیہ کا اخفا

سنتِ نبویہ اور شریعت مطہرہ پر عمل کرتے ہوئے حضرت مولانا نے طریقت کو پالیا تھا اور یہی وہ حقیقی طریقت ہے جو اولیأ وانبیأ وصوفیا وعلما کے نزدیک ممدوح ومقصود رہی ہے وہ امور اسلامی پر عمل کرتے ہوئے درجۂ احسان تک پہنچ گئے تھے اور[۱] تعبد اللّٰہ کانک تراہ کے معنے کا مشاہدہ کرتے رہتے شریعت اوصاف اور اخلاقِ رذیلہ کے نتائج سے مانع ہے اور طریقت ان اوصاف کی بیخکنی کرتی ہے جیسے کہ ڈاکٹر صاحب کی کنین کا استعمال بخار روک دیتا ہے لیکن طبیب صاحب کا جوشاندہ وخیساندہ اخلاط کی اصلاح کر کے بخار کے مادہ کو قطع کرنا چاہتا ہے یہی طہارتِ اخلاق باعث قربِ خداوندی ہے اور قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی اور یُزَکِّیْھِمْ وَیُطَھِّرُھُمْ کے اشارات سے یہی شرعاً؛ اور دعائے اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی مطلوب یہی عین طریقت ہے اور یہی اصل تصوّف اور کمالِ ولایت۔ اور تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یا سلب ارادہ وکون العبد فی رضاء اللّٰہ اسی کے ثمرات ونتائج ہیں۔ یا اسی کے ساتھ لازم وملزوم۔ حضرت مولانا بفضلہ تعالیٰ ان امور میں درجات عالی رکھتے تھے اور غایت اتباع سنت اور حُبّ نبوی کی برکت سے کمالات نبویہ سے حصّہ وافی عطا ہوا تھا۔

حالات وکیفیات قلبیہ کے اخفا کا اس درجہ اہتمام تھا کہ مخصوص خدام کو بھی پتہ لگنا دشوار تھا اور انتہائی سادگی کی وجہ سے ظاہر پرست وعجائب پسند لوگوں کا

---

[۱] حضور سید عالم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ کی عبادت ایسی طرح کرو کہ گویا تم حق تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اگر یہ درجہ حاصل نہ تو کم ازکم یہ تو سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے ۱۲

آپ کو ولیٔ کامل سمجھنا نہایت دشوار۔ تراویح میں قرآن مجید سُن کر بے قرار ہو جاتے۔ غور کرنے والوں کو تغیر محسوس ہوتا مگر کیا مجال کہ اُف نکل جاتے یا بدن پر اثر آجائے کبھی بے اختیار آنسو گر پڑے تو خیر ورنہ جذب کر لیتے۔

آپ کی عظمت و محبت قلوب خواص کی طرف سے شائع ہوتی ہے اور آپ کی صحبت میں جو جمعیت خاطر حق تعالیٰ نے رکھی تھی وہ زبان و قلم سے بیان نہیں ہو سکتی ؎

در صد ہزار ساغر دینا نیافتیم
خاصیتے کہ در نگہ مے فروش بود

مصائب دنیا اور تکالیف قلبیہ سے مضطر ہو کر لوگ خدمت میں حاضر ہوتے۔ کچھ لفاظی اور پُر گوئی تو حضرت کے یہاں تھی ہی نہیں محض ایک دو کلمہ تسلی یا وعدۂ دعا سے اطمینان خاطر پاتے تھے۔ عام مستفیدین و معتقدین و تلامذہ کی حسب استعداد اصلاح قلوب و تصحیح عقائد تو ایک مسلم اور بدیہی امر ہے۔ ایسے مخصوص تصرفات بھی آپ کے بیشمار ہیں کہ خوش نصیب لوگ اپنے خراب و خستہ حال لے کر حاضر ہوئے اور توفیق خداوندی اور حضرت کی نظر توجہ سے قابل رشک حالت ہو گئی۔

بزرگوں کا ادب و احترام

بزرگوں کے ادب و احترام اور مقبولانِ خداوندی سے محبت و عقیدت میں مولانا کے برابر کوئی دنیا میں نظر نہیں آتا۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہما سے ایک خاص انس تھا۔ اور ان سے سوءِ عقیدت رکھنے والوں سے نفرت۔ ان حضرات کے حالات و کمالات بیان کرنے کے وقت مولانا کی بشاشت اور قلبی انشراح قابلِ دید ہوتا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کے ہمعصر حضرات رحمہم اللہ کے اوصاف حسنہ کمال محبت سے نقل فرماتے۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں ہر ہفتہ پا پیادہ حاضر ہونا اور باوجود اپنی وجاہت و عظمت کے عقیدت مندانہ پیش آنا اور

اپنی تصانیف کو بنظرِ اصلاح سنانا حقیقی محبت پر دال ہے اور حضرت مولانا کا ایک اعلیٰ کمال۔ مدرسہ کے مشاہرہ اور تعلیم کے معاوضہ سے دل گھبراتا تھا۔ لیکن مولانا ممدوح کے ارشاد سے خاموش رہے اُستاد کی وفات پر تعلیم و تعلم سے بر داشتہ ہوکر گوشۂ عافیت اختیار کر لیا تھا۔ مگر حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ کی قلبی عظمت نے تعمیل ارشاد پر مجبور کیا۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ اپنے ہمسر اور معصر حضرات سے ایسے ادب و تعظیم سے پیش آتے کہ گویا یہی پیر و مرشد ہیں۔ سچ ہے اِنَّمَا یَعْرِفُ ذُوالْفَضْلِ مِنَ النَّاسِ ذُوْدُہٗ

اپنے شیخ مولانا نانوتویؒ سے تعلق

اپنے مرشد و استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فنا فی الشیخ کا تعلق حاصل تھا اور محبت بدرجۂ عشق پہنچی ہوئی تھی۔ ان کے کمالات ان کے علوم، ان کا تفقہ تمام عالم سے بڑھ کر نظر آتا تھا۔ اور پھر اس کو اس حسن و خوبی سے بیان فرماتے کہ باید و شاید ان کے ذکر میں ایک خاص لطف آتا اور سلسلۂ کلام ختم ہونے کو نہ آتا۔ کبھی ذکر کرتے ہوئے انتہائی درجہ کو بشاش ہو جاتے اور کبھی نام لیتے ہوئے آنسو بھر لاتے وفات کے بعد ان کا ذکر خیر حضرت کے لئے موجب راحت تھا اور زندگی کی خدمت۔ حضرت نے ایسی خدمتیں کی ہیں کہ اس زمانہ میں یقین آنا مشکل ہے۔

ایک مرتبہ عین برسات کے زمانہ میں مولانا نے اپنے نانوتہ سے دیوبند کا قصد فرمایا۔ کچا راستہ خام سڑک۔ یہاں سے وہاں تک پانی بھرا ہوا اور پھر کسی قدر ترشح موجود۔ مولانا بیماری سے اُٹھے تھے اور نقیہ ہو رہے تھے۔ جاں نثار شاگرد نے اُونچا باندھا ایک ہاتھ سے اُستاد کے سر پر چھتری کا سایہ کیا اور گھوڑے کی رکاب سے بالکل متصل ہو کر دوسرا ہاتھ کمر میں ڈال کر سہارا لگایا چودہ میل اسی

شان سے طے کئے۔ راستہ میں ایک دو جگہ اُستاد کی راحت کے خیال سے ٹھہرے ورنہ حضرت مولانا کی کمر ہمت ڈھیلی نہ ہوئی۔ مرشدوں کی ایسی خدمتیں وہ منازل و مقامات سلوک ایک روز میں طے کرا دیتے ہیں جو برسوں کی عبادت سے مشکل طے ہوتے ہیں

چاروں سلسلوں میں اجازتِ بیعت

مشہور و معروف نسبت بیعت آپ کی اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے ہے ہر چہار خاندان میں بیعت فرمایا تھا اور چاروں سلسلوں میں اجازتِ بیعت عطا فرمائی تھی لیکن معروف و معمول بہا ان حضرات میں سلسلہ چشتیہ ہے اور حضرت شیخ العرب والعجم مرشد العلماء حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بذریعہ والانامہ کے اجازت و خلافت عطا فرمائی تھی ایک زمانہ میں اس کے متعلق بعض حضرات کا طلب ثبوت محسوس کر کے مولانا حسین احمد صاحب نے اس والانامہ کا فوٹو لے کر شائع کر دیا تھا بہرحال بالواسطہ اور بلاواسطہ آپ کا سلسلۂ ارشاد حضرت حاجی صاحب رح تک پہنچتا ہے اور حضرت ممدوح کے شجرات ہر چہار سلاسل میں مشتہر و شائع ہیں یہاں اُن کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

آپ کا فیضِ رُوحانی

حضرت مولانا بھی اپنے بزرگوں کے معمول کے موافق سلسلۂ چشتیہ میں بیعت فرمایا کرتے تھے لیکن تعلیم و تلقین بلا پابندی سلسلہ حسب استعداد و مناسبت فرما دیا کرتے تھے۔ ابتدائے زمانہ سے تمام شناسا لوگوں اور فیض یافتہ طالبعلموں کے قلب میں آپ کی محبت و عقیدت تھی۔ اور تمام شاگرد آپ کو ایک شیخ کامل سمجھتے تھے اس لئے بہت لوگ بیعت کے لئے اصرار کرتے تھے مگر بدشواری کبھی کوئی کامیاب ہوتا تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی وفات کے بعد بلا اختیار

منجانب اللہ آپ کی طرف خلقت کا بہت زیادہ رجوع ہوا۔ اس وقت آپ نے کسی قدر وسعت فرمائی پھر بھی اکثروں کو یہ کہکر ٹالدیتے کہ جو حضرات اس کام کو کر رہے ہیں اُن سے رجوع کرو زیادہ فائدہ ہوگا۔ کسی کو صرف تعلیم و تلقین کر دیتے اور کسی کو بہت انکار و اصرار کے بعد بیعت فرما لیتے۔

مالٹا میں حق تعالیٰ نے آپ کو اقطار بعیدہ کے مسلمانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا بہت لوگوں کو باقاعدہ سلسلہ میں داخل فرمایا اور صدہا کو آپ کی صحبت بابرکت اور آپ کے رفقاء کی نصیحت سے اتباع صراط مستقیم کی توفیق نصیب ہوئی۔ واپسی ہندوستان پر چونکہ اجل مقدر کا قرب ہوا لہٰذا بالکل يَدْخُلُونَ فِي دِيْنِ اللهِ أَفْوَاجًا کا منظر پیش نظر ہوگیا۔ معمولی استعداد پر، ذرا سی سفارش پر بیعت میں داخل فرمالیتے۔ سفر و حضر میں جا بجا صدہا لوگ داخل سلسلہ ہوئے جن میں اکثر فیوض باطنی سے مالامال ہوئے۔

بیعت کا طریقہ

بیعت کا طریقہ بالکل سادہ تھا نہ کوئی اہتمام نہ انتظام نہ تکلف، اکثر نماز عشاء کے بعد اور کبھی حسب موقع و ضرورت اور کسی وقت طالب کو بلا لیتے بعض کو دوگانہ نفل پڑھنے کا ارشاد فرماتے اور مختصر الفاظ توبہ بتوجہ قلبی کہلاتے۔ جن کا طالب پر خاص اثر پڑتا اور مدتوں قائم رہتا۔ پھر مناسب استعداد و حالات کچھ مختصر یا طویل ذکر اللہ تعلیم فرماتے۔ بعض کو دوازدہ تسبیح بتلاتے۔ جو لوگ باقاعدہ ذکر و شغل جاری رکھنا چاہتے ان کو اس کی تعلیم فرماتے اور نگران حال رہتے۔ ممکن ہے کہ اپنی شومئ قسمت سے کوئی بالکل عاری اور خالی رہ گیا ہو ورنہ کچھ نہ کچھ اصلاح حال ضرور نصیب ہوتی تھی۔ اور یہ تو کبھی نہیں ہوا کہ کوئی طالب علم فیضان یا بے توجہی کی شکایت سے حضرت کا دروازہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا ہو۔

حضرتؒ کے خلفاء

خلافت و اجازت کی حضرت کے خادموں میں نہ کسی کو آرزو ہوئی تھی نہ خیال اور کمال تواضع کی وجہ سے نہ حضرت اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے تھے کہ ان امور کا کوئی خاص اہتمام و انتظام فرماویں اس لئے حضرت کے خلفا کی تفصیل مشکل ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ کسی معمولی آدمی کو یہ عزت عطا نہ فرماتے تھے کسی بہت ہی محنت کش اور کامل کو مستحق سمجھتے تھے جیسے مولوی صوفی محمد اکرم صاحب پنجابی یا مولانا شاہ وارث حسن صاحب جو حضرت گنگوہیؒ کے دربار سے بھی مجاز تھے اور مولانا سہول صاحب بھاگلپوری اور ایسے ہی بعض اور حضرات۔

شجرہ

جیسا کہ ابھی عرض ہوا ہے حضرت اپنے آپ کو کوئی شیخ یا پیر و مرشد نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے شجرات کا بھی کچھ اہتمام نہ تھا دوسرے بزرگوں کے شجروں پر آپ کے نام کے اشعار لکھ کر خدام اپنے پاس رکھتے اور پڑھتے لیکن ۱۳۳۰ھ کے بعد جب کثرت سے لوگ اصرار کرنے لگے تو بہ تعمیل ارشادِ حضرت احقر نے آپ کا شجرہ طبع رکھ لیا۔ جو کوئی اصرار کرتا احقر کے پاس بھیجدیتے۔ آخر زمانہ میں مفصل کتاب شجرات خدام کے اہتمام سے طبع ہو گئی اور مولانا عزیز گل صاحب وغیرہ کے سپرد رہتی تھی جس کو حضرت مستحق سمجھتے دلوا دیتے۔ احقر وہی اپنا طبع کیا ہوا مقبول بزرگانِ چشتیہ نقل کرنا کافی سمجھتا ہے۔

تعویذات و کرامات

اوقاتِ عزیزہ ضائع کرنے والا شغل تعویذات و عملیات کا حضرت نہ رکھتے تھے۔ قدیم زمانہ میں حضرت کو اہل سمجھ کر بعض بزرگوں نے بکمال شفقت سکھلانا بھی

چاہا مگر آپ نے پسند نہ فرمایا۔ آپ کی دُعا صدہا عملیات سے بڑھ کر تھی۔ اور آپ کی توجہ بہترین تعویذ۔ البتہ اگر کوئی مخصوص خادم و مخلص نیاز مندی سے استدعا کرتا تو کبھی کبھی کوئی تعویذ لکھ کر عطا فرما دیتے۔

بزرگوں کی بے سند کرامات تو حضرت کو یاد نہ تھی البتہ جب بزرگانِ دین اولیاء اللہ اور ائمۂ اسلام کے حالات و واقعات بیان کرنا شروع فرماتے تو سننے والے کو مرضیات الٰہی کی طرف بے اختیار رغبت ہوتی تھی اور دُنیاوی مشاغل سے نفرت۔ اظہارِ کمال کے لئے الفاظ میں اصلاحات تصوّف کا بے موقع استعمال تو نہ فرماتے لیکن کبھی موقع آ جاتا تو ایسے حقائق بیان فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بالکل کسی امر مشاہدہ کو بلا اشتباہ بیان فرما رہے ہیں۔

ایک روز مختصر مجلس تھی باتوں باتوں میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا ذکر آ گیا خادموں نے انبساط دیکھ کر چھیڑنا شروع کیا کسی نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین عالیہ کا ذکر کیا کسی نے دو چار جملے اس کے نقل کئے کسی نے ذرا ہمت کر کے عرض کیا حضرت کچھ فرمایئے ایک دو مرتبہ ٹلایا پھر تو حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین کی شرح کرتے ہوئے خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گئے سامعین حیران تھے کہ کس خزانۂ علمی کا دروازہ کھل گیا ہے مولانا تو حدیث و فقہ میں موشگافیاں فرمایا کرتے تھے یہ مضامین کہاں سے آ رہے ہیں۔ مضامین کا ضبط کرنا تو دشوار تھا ہی مگر اس حالت کا نقشہ دکھلانا تو ممکن ہی نہیں۔

تواضع

منجانب اللہ جس قدر شہرت ہوتی تھی ہوئی ورنہ حضرت نے اپنے آپ کو چھپانے میں کوتاہی نہیں فرمائی اپنے واقعات، حالات، واردات کو ہمیشہ بہت ہی گھٹا کر اور معمولی سطح پہ لا کر بیان فرماتے۔ ایک شب کو معمولی بخار کی حالت اور یکسوئی اور تنہائی کے وقت میں صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب کی ایک آیت قرآنی کے

متعلق کچھ مضمون عجیب منجانب اللہ القا ہوا۔ اگلے روز خدام جمع ہوئے تو فرماتے ہیں۔
"بیماری کی باتوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا اور بخار میں دماغ بہت پریشان ہوتا ہے کل اسی
حالت میں بخاری کے ترجمہ الباب اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ
مِنْۢ بَعْدِہٖ کی نسبت ایک بات خیال میں آئی مگر پریشانی کی حالت کی بات کچھ ایسی ہی
ہوتی ہے"۔ شاگردوں نے عرض کیا کہ حضرت کچھ تو فرمایئے فرمایا کہ میاں کچھ بات بھی ہو۔
خیر زیادہ اصرار پر فرمایا۔ اس وقت دیر ہوگئی رات زیادہ ہوگئی ہے کل انشاء اللہ بیان
کروں گا۔ اگلی شب کو بیان فرمانا شروع کیا اور باوجود ضعف کے نہایت شرح و بسط سے
باب سے آیت کی مناسبت اور آیت میں من بعدہ کی قید کا فائدہ بیان کرتے ہوئے
اور آیات و احادیث سے استشہاد کرتے ہوئے فیوض علمیہ سے سامعین کو مالامال فرمایا
پوری تقریر محفوظ رہنی دشوار تھی مکان پر جاکر جس قدر یاد آیا پنسل سے لکھ کر رکھ لیا۔
یہ تقریر کسی قدر اجمال کے ساتھ رسالہ الابواب والتراجم کے پہلے باب میں صفحہ ۲۰ و
۲۱ پر درج ہوگئی ہے۔

وفورِ علم و وسعتِ نظر اور خداداد تفقہ فی الدین کی وجہ سے مجتہدانہ حیثیت
رکھتے تھے مگر غایت تواضع سے محدثین و مجتہدین و مصنفین کے سامنے اپنا کوئی درجہ
ہی نہیں سمجھا اور کبھی یہ نہ فرمایا کہ میرے نزدیک یہ راجح ہے یا میں یہ کہتا ہوں۔ بہت سے
بہت کبھی فرمایا تو یہ کہ "اچھا یوں معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ یوں کہا جائے"۔
اہل علم تو کجا کبھی معمولی لوگوں سے بھی اپنے آپ کو ارفع نہ سمجھا۔ ظہر کے بعد ہم
لوگ ملا حسن کا سبق پڑھ رہے تھے کہ ایک پیر مرد سفید ریش آگئے جن کو سنے سنائے
کچھ اختلافی مسائل کی شُدبُد تھی۔ اوّل کچھ سوال کئے اور پھر اعتراض کرنے لگے اور
مناظرہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ مولانا مختصر اور مسکت جواب دیکر خاموش ہوجاتے۔
بڑے میاں عاجز ہوکر خفگی اور سختی سے دو چار جاہلانہ اعتراض کرتے یا کچھ جواب
دیتے، بڑے میاں تیز ہو رہے ہیں آواز بلند کرتے ہیں مگر حضرت ہنس ہنس کر آہستہ
جواب دے رہے ہیں۔ عصر کی نماز کو کسی قدر دیر بھی ہوگئی۔ مگر جب تک پیر مرد

نے خود بس نہ کر دی حضرت بیٹھے رہے یہ تحمل و بردباری کس کو نصیب ہوتی ہے۔
نظر بندی مالٹا کے زمانہ میں سکوت غالب رہتا تھا اور علمی اشغال کے بعد ذکر و فکر میں مشغول رہتے تسبیح ہاتھ میں لٹکائے ہوئے نہ رکھتے تھے اکثر جیب میں رکھتے جب کہیں بیٹھتے اور فراغت ہوتی فوراً نکال کر خاموشی سے پڑھنا شروع فرماتے اور لَایَزَالُ لِسَانُکَ رَطْباً مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ پر عمل کرتے۔

کرامات و برکات

مخدوم کا اثر خادموں میں بھی آتا ہے۔ اس لئے حضرت مولانا اور آپ کے اکابر کے متوسلین ہر وقت کرامت شماری کے خیال میں نہیں رہتے تھے عمل بالسنۃ اور اتباعِ شریعت ہی کو یہاں کمال سمجھا جاتا تھا تاہم اگر حضرتؒ کے معمولی واقعات و خوارق عادات جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے احقر کو چونکہ استیعاب حالات مقصود نہیں اور رسالہ بھی امید اور ارادہ سے زیادہ طویل ہوتا چلا جاتا ہے اس لئے تحقیق و تلاش سے جمع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اپنی ذاتی معلومات یا اتفاقیہ کسی معتبر سے سُنے ہوئے ایک دو واقعات ذکر کر دیتا ہوں۔
شریف صاحب کی بغاوت سے کچھ پہلے حضرت مولانا مع رفقاء کے طائف پہنچ گئے تھے اور ایک دو ماہ قیام کرنے کا ارادہ تھا۔ چند ہی روز کے بعد تقاضا فرمایا کہ مکہ معظمہ چلنا چاہیئے لیکن شتربان اجازت لے کر دیہات میں چلا گیا تھا اس لئے جانا ملتوی رہا۔ ایک دو روز کے بعد پھر زیادہ تقاضا فرمایا تو رفیقوں نے دوسری سواریاں تلاش کیں مگر کامیاب نہ ہوئے۔ خدام اس وقت اس راز کو نہ سمجھے کہ کیوں اس قدر تقاضا فرماتے ہیں لیکن دو ہی تین دن کے بعد معلوم ہو گیا کہ راستے بند ہو گئے، اور شریف صاحب کی فوج کشی اور بغاوت کی وجہ سے طائف نہایت خطرے میں پڑ گیا ہے اور انہیں آئندہ پیش آنے والے واقعات نے خلاف عادت حضرت کو تقاضائے سفر پر مجبور کیا تھا جن کو بہ نظر کشف حضرت نے معلوم کر لیا تھا مگر مقام رضا میں

نہایت راسخ القدم تھے اس لئے چند مرتبہ ظاہری تقاضا کرنے کے بعد خاموش رہے۔ واللہ اعلم۔

احقر نے اثنائے درس میں حضرت مولانا کی زبان سے سن کر بڑی محنت سے کچھ تقریریں اور یادداشتیں جمع کی تھیں طالب علم تو ایسے علمی جواہرات کے خواہشمند ہوتے ہی ہیں اور بلا محنت ہاتھ آجائے تو سبحان اللہ۔ جواز و عدم جواز کا خیال نہ کیا کوئی مہربان طالب علم لے اڑے۔ نہایت رنج ہوا اور کوئی صورت دستیابی کی نظر نہ آئی۔ اسی غم میں ایک روز مدرسہ جانے کو بھی دل نہ چاہا۔ حضرت کو خبر ہوئی تو عصر کے بعد تسلی کے لئے مکان پر تشریف لائے۔ مفصل حالات دریافت کر کے افسوس ظاہر فرمایا صبر دلایا اور پوچھا کہ تمہاری ہی لکھی ہوئی تھی؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے ہی لکھی تھی فرمایا پھر کیا غم ہے پھر لکھ لینا اور عجیب نہیں کہ ملجائے اگلے روز بخاری کے سبق کے بعد میں نے یاد دلایا تو سب طلبہ کو خطاب کر کے نہایت جوش سے ایک شاندار لہجہ میں فرمایا کہ " دیکھو! سید کی تقریر جس نے لی ہو دے دو، اُن کو بہت رنج ہے اگر نہیں دے گا تو خواہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوجائے لیکن علم نہیں آئے گا اور یہ خیال نہ کرنا کہ معلوم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بھی بتلا دیتے ہیں " یہ سن کر سب طلبہ سہم گئے اور چند روز کے بعد چور صاحب ہی قفل کھول کر وہ تقریر رکھ گئے۔ اس واقعہ سے حضرت کی کرامت و برکت معلوم ہونے کے ساتھ ہی آپ کی غایت توجہ اور شفقت علی الخدام والاصاغر بھی معلوم ہوتی ہے کہ معمولی مصائب میں بھی ہمدردی اور اعانت کا خیال فرماتے تھے اسی قسم کا ایک اور واقعہ سُنیئے۔

مولانا عبدالسمیع صاحب (مدرس دارالعلوم) کی اہلیہ اور صاحبزادی دونوں ہیضہ میں مبتلا ہوئیں سخت تکلیف تھی وبا کا زمانہ تھا بہت کم مریض جانبر ہوتے تھے حضرت کو خبر ہوئی تو بلا طلب مکان پر تشریف لے گئے۔ مولوی صاحب نے حالت بیان کی اور بچی کو گود میں لے کر سامنے کیا۔ آپ نے اس کے سر پر دست مبارک رکھ کر فرمایا کہ " ابھی یہ تو اچھی ہوجائے گی "۔ مولوی صاحب کی مدرسی کے شغل میں یہاں بھی قید

احترازی کا ہمیشہ ہوا اور گھبرا کر عرض کیا کہ حضرت " اس کی والدہ " آپ نے طمانیت بخش لہجہ میں فرمایا وہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ اچھی ہو جائے گی " مولوی صاحب نے کسی قدر پانی دم کرالیا اور حضرت نے ذرا سا اس میں سے نوش کر کے اس کو متبرک کر دیا اور واپس ہو گئے ۔ لڑکی کا مرض بڑھ کر مایوسی کی حالت ہو گئی اور سب نے خیال کیا کہ اب احتیاط و پرہیز سے کیا فائدہ ۔ پیاس شدید ہے ۔ ٹھنڈے پانی کے لئے کیوں ترسایا جائے وہی متبرک پانی خوب پلا دیا کچھ عرصہ کے بعد لڑکی کو افاقہ شروع ہوا اور شام تک حالت سنبھل گئی پھر کیا تھا وہی پانی کا نسخہ اس کی والدہ پر جاری کیا گیا اور حق تعالیٰ کے فضل سے اس کی بھی صحت ہو گئی ۔

یہی اہلیہ مرحومہ دوسری مرتبہ بیمار ہوئیں کئی روز کی پریشانی کے بعد مولوی صاحب کو اسی بابرکت علاج کا خیال آیا ۔ تقدیر خداوندی دیکھئے ۔ مکان پر حاضر ہوتے ہیں تو حضرت مولانا موجود نہیں ، مدرسہ میں تلاش کیا تو حضرت مکان تشریف لے گئے ۔ مسجد میں تلاش کرتے ہیں تو ملتے ہی نہیں ۔ اسی روز حضرت مہتمم صاحب کے مکان پر مجمع کی دعوت ہوئی ۔ مولوی صاحب نے غنیمت سمجھا اور نہایت اہتمام سے حضرت کے سامنے کا بقیہ شوربا مریضہ کے لئے لے کر اپنے مکان کی طرف چلے راستہ میں خلاف عادت ایسے گرے کہ پیالہ ٹوٹ کر شوربا گر گیا اور راستہ کے پانی میں مل گیا ۔ مولوی صاحب اسی وقت سمجھ گئے کہ بس قسمت ہی میں نہیں مایوس ہو کر چلے گئے اور مریضہ کی وفات ہو گئی ۔ رحمہا اللہ تعالیٰ ۔

میرے ایک متین ہم سبق اور عنایت فرما اور حضرت مولانا کے نہایت مخلص خادم شاگرد کا صاحبزادہ قرآن مجید حفظ کرتا تھا ۔ دوائیں کھلائیں ، دعائیں کرائیں ، استاد بدلا لیکن یاد ہی نہ ہوتا تھا ۔ اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی ارادہ ہوا کہ چھڑا دیں حاضری دیوبند میں حضرت سے بقصد طلب اجازت عرض کیا ۔ آپ نے فرمایا ، کہ پڑھتے دو چھڑاؤ نہیں اور شاید کوئی تسلی کا لفظ فرمایا ۔ تعمیل میں کہاں عذر ہو سکتا تھا ۔ حضرت کی برکت سے لڑکے نے حفظ کر لیا اور اب بہت اچھا حافظ ہے تراویح میں

سنایا جاتا ہے۔

۱۳۲۲ھ کے آخر میں دیوبند میں شدید طاعون ہوا۔ چند طلبہ بھی مبتلا ہوئے ایک فارغ التحصیل طالب علم محمد صالح ولایتی جو صبح و شام میں سند فراغت لے کر وطن رخصت ہونے والے تھے اسی مرض میں مبتلا ہوئے اور حالت آخری ہوگئی وفات سے کسی قدر پہلے انھوں نے ایسی گفتگو شروع کی کہ گویا شیطان سے مناظرہ کر رہے ہیں۔ اس کے دلائل کو توڑنے اپنے استدلال پیش کرتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے مناظرہ میں شیطان کو بخوبی شکست دیدی پھر کہنے لگے افسوس اس جگہ کوئی ایسا خدا کا بندہ نہیں ہے جو مجھ سے اس خبیث کو دفع کرے۔ یہی کہتے کہتے دفعتہً بول اٹھے کہ واہ واہ سبحان اللہ دیکھو میرے استاد حضرت مولانا محمود حسن صاحب تشریف لائے دیکھو وہ شیطان بھاگا۔ ارے خبیث کہاں جاتا ہے۔

ایک ساعت کے بعد طالب علم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ حضرت مولانا اس واقعہ کے وقت وہاں موجود نہ تھے۔ مگر روحانی تصرف سے امداد فرمائی اور فَقِیہٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ کے ایک معنے آنکھوں سے دکھلا دیئے اسی لئے حضرت عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

دامن او گیر زود تر بے گماں
تا رہی از آفتِ آخر زماں

مرض الموت سے چند ہی روز پہلے ایک بوڑھے شخص آئے اور مولانا رومؒ کا یہ شعر پڑھ کر ؎

بد ز گستاخی کسوف آفتاب ۔۔۔۔ شد عزازیلے ز جرأت ردِّ باب

معنے دریافت کیجئے۔ احقر کو چونکہ اتفاقیہ اسی شعر کے چند معنے محفوظ تھے خطرہ گزرا کہ یہ شخص مجھ سے دریافت کرتے تو خوب سمجھا دیتا۔ حضرت نے ان کے سوال پر بلا تامل میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان سے پوچھو۔ میں نے عرض کیا کہ "حضرت آپ کو بہت سے معنے یاد ہوں گے مگر شرح میں یہ لکھا ہے دکھیں

صحیح روایت میں تو ہے نہیں) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بدن سے کرتہ اُتار کر پھٹے ہوئے کو درست کرنے کے لئے سی رہے تھے۔ دھوپ کی تیزی سے بدن کو تکلیف محسوس ہوئی تو تیز نظر سے آفتاب کو دیکھا فوراً کسوف ہوگیا" اور پھر آہستہ آہستہ کئی معنے پیر مرد کو سمجھائے (جو میرے پاس ہی بیٹھے تھے) انہوں نے خوش ہوکر حضرت سے عرض کیا کہ کئی آدمیوں سے دریافت کیا، ایسے معنے کسی نے نہیں بتلائے تھے۔ حضرت نے تبسم سے فرمایا کہ اسی لئے تو کہتا تھا کہ ان سے دریافت کرو۔

مولانا مفتی سید مبارک علی صاحب قاضی سرونج (ریاست ٹونک) کی ایک تجویز مقدمہ سے مقامی علما نے (جنمیں بعض مقتدر علما بھی شامل تھے) اختلاف کیا، اور ان کی تجویز کے خلاف سرکار سے فیصلہ کرا دیا اپیل میں جب صورتِ واقعہ علمائے دیوبند و لکھنؤ کو لکھی گئی تو سب نے مولوی صاحب کی تجویز سے موافقت کی اور مقامی علماء کے فیصلے کو باطل ٹھہرایا۔ اسپر برافروختہ ہوکر علماء نے مولوی صاحب کی ایذا رسانی پر کمر باندھی اور خود نواب صاحب سے ان کی شکایت کی۔ معاملہ خطرناک ہوگیا تو مولوی صاحب نے اپنے ماوا و ملجا پیر و مرشد حضرت مولانا کو اطلاع دی اور پوری حالت سے مطلع کیا۔ حضرت نے خاص توجہ اور شفقت سے دُعا فرمائی اور خلاف اُمید حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے مولوی صاحب کو بعزت و حُرمت سرخرو رکھا اور شکایت کرنے والوں کے منہ پر نواب صاحب نے مولوی صاحب کی تعریف و تائید کرکے مخالفین کو ناکام و نامراد کیا۔

احقر کے زمانۂ قیام جونپور میں حضرت مولانا بھاگلپور سے واپس ہوتے ہوئے ایک روز کے لئے جونپور ٹھہرے، مولانا حسین احمد صاحب ہمراہ تھے۔ رمضان المبارک کا تیسرا روزہ تھا۔ شب بیداری کے کسل سے صبح کی نماز کے بعد حضرت نے آرام کرنا چاہا۔ تنہائی کے لئے مسجد اٹالہ کے بالائی درجہ پر بستر بچھا کر حضرت کو لٹا دیا۔ مولانا حسین احمد صاحب (جو اس زمانہ میں "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کے صحیح مصداق ہوگئے ہیں۔ ہمیشہ سفر و حضر میں خدمت کرکے حضرت کو راحت پہنچاتے

رہتے تھے حسب عادت پاؤں دبانے لگے۔

خاکسار محروم الخدمت کو بھی حرص آئی۔ دوسرا پاؤں دبانا شروع کیا اور ہنس کر مولانا حسین احمد صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب آج تو ہم بھی آپ کے برابر ہو گئے۔" حضرت نے سن کر فرمایا بھائی تم کہاں کہاں ان کی برابری کروگے اس وقت تو یہ ایک معمولی فقرہ سمجھا گیا۔ لیکن مولانا حسین احمد صاحب کا مدینہ منورہ میں اور پھر اپنی بیش قیمت آزادی کو قربان کر کے خوشی سے نظر بندی میں حضرت کی معیت اختیار کرنا۔ تمام سفر خصوصاً زندانِ قاہرہ اور اسیریٔ مالٹا میں جاں نثاری و خدمت کرنا اور پھر کلمۃ الحق کے اعلان پر زندانِ کراچی میں اسیر ہونا، اور تمام ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر مدحیہ اشعار میں مولانا حسین احمد کا نام ہونا بتلا رہا ہے کہ وہ ایک پر مغز کلام تھا اور مولانا حسین احمد صاحب کی آئندہ شاندار دینی و قومی زندگی کے لئے ایک معنی خیز اشارۂ خیر و برکت تھا۔

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی مقدس زندگی آپ کا اتباعِ سنت اشاعت علوم دین اشتغال بالحدیث النبوی اور تمام سیرت وحالات امید دلانے والے ہیں کہ حق تعالےٰ نے اپنی رحمت سے آپ کو اس عالم میں مدارج عظمیٰ اور درجات عالیہ عطا فرمائے ہوں گے۔ اور اسی کے ساتھ بعض مخلص و دیندار، بے لوث حضرات کی قابل قدر متبرک خوابیں بھی (اگرچہ مفید علم قطعی نہیں) اسی حسن ظن کی تائید و تصدیق کرتی ہیں، کسی نے دیکھا کہ حضرت شاداں و فرحاں باغ میں کھڑے ہیں کسی کو نظر آیا کہ بعزت و شان دربار لگا ہوا ہے اور تخت پر بیٹھے ہوئے قضایا فیصل فرما رہے ہیں۔ ایک شخص نے حدیث شریف کا درس دیتے ہوئے معائنہ کیا۔

اگرچہ مضمون و ماحصل سب کا تقریباً ایک ہی ہے لیکن سب سے فائق وہ خواب ہے جو ایک مخلص خادم نے وفات کے بعد بالکل متصل دیکھا کہ عظیم الشان مکان تیار ہے جس کی خوبصورتی اور زینت اور نورانیت و لذت کا بیان محال و دشوار ہے۔ خدام و حاضرین ہر طرف خوشی و اہتمام سے دوڑ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور جدید مہمان حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا انتظار

ہے۔ حق تعالیٰ ان سب بشاراتِ منامیہ کو سچا کر کے حضرت سید الکونین فخر عالم کی مہمانداری
کی عزت آپ کو نصیب فرماویں اور اپنی رحمت اور مغفرت سے معزز و ممتاز اور درجات
جنت میں سرفراز فرماویں آمین یارب العالمین۔

خاتمہ

عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ العزائم پہلے صرف تشریف آوری کے حالات
حضرت کے تشریف لانے کے بعد ہی فوراً طبع کرانے کا ارادہ تھا۔ امراض و اعذار نے
فرصت نہ دی یہاں تک کہ مرض و وفات کے دردانگیز حالات بھی بقضائے الٰہی شامل
کئے گئے اور صرف دو جزء پر طبع کرنے کا مصمم قصد کر لیا لیکن مالٹا کے واقعات کا اضافہ
مناسب سمجھا۔ پھر دیگر معمولی حالات بھی تحریر ہو گئے یہاں تک کہ یہ رسالہ اس قدر طویل
ہو گیا کہ بعض عدیم الفرصت یا نازک طبع ناظرین کو تکلیف مطالعہ بھی ناگوار گزرے گی مگر
کیا کیجئے ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

تزلزل و تلون اور ارادہ اور تغیر حالات ہی باعث ہے کہ بعض واقعات میں بالکل
اجمال ہے اور بعض جگہ تفصیل۔ تشریف آوری کے حالات ۱۳۳۸ھ کے تحریر کئے
ہوئے ہیں اور دیباچہ اور بعض واقعات رجب ۱۳۳۹ھ کے لکھے ہوئے اور آخری
اوراق ماہ صفر ۱۳۴۰ھ کے۔

یقین فرمائیے کہ طول فضول ہی کے خوف سے دوسروں سے دریافت کرنا تو
درکنار بہت سے واقعات کو ذکر کرتے ہوئے اختصار سے گلا مروڑ دیا۔ مضامین علمیہ
تقریرات اور احادیث کو اس مختصر کتاب میں اس لئے نقل کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ
کہ طلبہ اور اہل علم کے مطالعہ میں تو حضرت مولانا کی تصنیف و تقریرات موجود ہیں وہ
ان سے استفادہ کر رہے ہیں ان کے لئے ضرورت نہیں اور عام اردو دان اصحاب
سمجھ نہیں سکیں گے اور مناسب و دلچسپی نہ ہوگی۔ اس قسم کے مضامین اور دیگر ضروری
امور کے لئے جن سے یہ رسالہ خالی ہے مستند اہل علم کی جمع فرمودہ حیات شیخ کے منتظر

ہیں جو کسی نہ کسی وقت منصۂ ظہور پر جلوہ گر ہوگی۔

اب حضرت مولانا کا شجرہ منبرکہ نقل کرکے اور اس کے بعد ہزار ہا قطعات و اشعار تاریخی ہیں سے چند ایک منتخب درج کرکے اور مکرر یہ کہہ کر کہ "حضرت مولانا کے حالات طیبات کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا جاسکا اور آپ کے کمالات کے ہزارویں حصہ کا بھی اظہار نہیں ہوسکا" باعتراف عجز و قصور و بامید عفو و اصلاح اس اپنے درد نامہ کو ختم کرتا ہوں ؎

مرا بسادہ دلی ہائے من نواں بخشید ۔۔۔ خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ وَصَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ۔

شجرۂ مبارکہ چشتیہ صابریہ قدوسیہ امدادیہ بواسطہ قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَ بَارِكْ وَسَلِّمْ

یا دائم الانعام والاحسان ۔۔۔ ارحم علی العبد الفقیر الجانی

فبسیدی مولانای محمود حسن ۔۔۔ ممدوح اہل الحمد والاحسان

فبحق مولانا محمد قاسم ۔۔۔ ہو قاسمٌ للعلم والعرفان

فبمرشدی غوث الوریٰ شمس الہدیٰ ۔۔۔ مقدام اہل العشق والایمان

الشیخ امداد اللہ القطب العلیٰ ۔۔۔ الجاہ ذی التمکین والعرفان

وبکاشف الظلمت نور محمد ۔۔۔ وبسیدی عبد الرحیم الفانی

وبعبدی ذاک شیخ شیوخنا ۔۔۔ وبعید ہادی للزمان امان

وبحقّ عضد الدین حقّ محمّدٍ ومحمدی ظاهر البرهان
وبحقّ مولانا محبُّ الله مَنْ اعیت مدائحُهُ وسبع بیان
بابی سعیدٍ ماجدٍ متورّعٍ بنظام دینٍ عارفٍ ربّانی
بجلال دین ذی الکلام والعلیٰ وبعید قدوسٍ عظیم الشان
بمحمد قطب الوریٰ وبعارفٍ هُوَ للوریٰ کالماء للظلمان
بحق عبدالحق قدس سرُّهٗ بجلال دین ذاکبیرا وان
بالشیخ شمس الدین قدوة عصرهٖ بعلاء دینٍ صابرٍ حقانی
بفرید دین الحق عم فیوضهٗ وبقطب دینٍ ذاک قطب زمان
بمعین دین الله صاحب سرّه غوث الوری وبسیدی عُثمان
وبحرمة الحاجی الشریف امامنا بالخواجه بمودودٍ وحیدِ زمان
وبسیدی کهف الوریٰ علم الهدیٰ بُویُوسفٍ فی الفیض کالتهتان
بمحمّدٍ ذی المجد والعُلیاءِ مَن قد فاق عرفانًا علی الاقران
وبحرمةِ الشیخ الکریم المقتدیٰ بواحمدٍ فی السرّ والاعلان
وبحقّ بو اسحاق مرشد دهرهٖ وبحقّ ممشادٍ عدیم الثانی
بابی هبیرة ذی المقام العالی بحذیفةٍ هو نخبةُ الأعیان
وبحق ابراهیم سلطان الوریٰ بفضیل ن الهادی الی الاحسان
وبحقّ عبد الواحد الفرد الّذی هو فی العزام کطافحٍ سکران
وبحقّ خیر الاصفیاء امامهم حسنٍ ولم یر مثله العینان
وبحقّ مولی المومنین امیرهم وامام اهل الدّین والایمان
اعنی علیًّا خیر من وطی الثریٰ مأوی الضّعاف مجلّی الاحزان
وبحقّ سیدنا النّبیّ مُحَمَّدٍ هو للخلائق رحمة الرّحمان
من فاق کلّ الخلق فضلًا باذخًا من ساد مجدًا عالم الامکان
وبفضلک الجمّ العمیم الهنا یا غافرًا للذنب والعصیان

قد جاء عبدك بابا مستصرخاً — متوسلاً باولئك الاعيان
فاغفر خطایاہ وطھر قلبہ — عن ماسواك ایا رجاء العانی
سلط علیہ العشق حتی لایری — مولای غیرك کائناً بمکان
ثم السلام علی النبی المصطفیٰ
خیر الوریٰ ورسولك العدنانی

شجرہ مختصرہ تاج الاولیاء قدوۃ الاصفیاء
شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ

از طفیلِ ذاتِ پاک بہر ختم المرسلین — بہر حق اولیاء دربندگانِ صالحین
بہر حضرت مرشدی مولائے محمود الحسن — مظہر فیض رشید قاسم و امداد دین
حضرت امداد و نور و حاجی عبدالرحیم — عبد باری عبد ہادی عضد دیں مکی امین
شہ محمدی شہ محب اللہ و شاہ بوسعید — شہ نظام و شہ جلال و عبد قدوس فطین
سیدی شیخ محمد شیخ عارف عبد حق — شہ جلال و شمس و صابر شہ فرید و قطب دین
شہ معین و شاہ عثمان زندی مودود شاہ — شہ ابویوسف ولی و بومحمد ذی الیقین
شہ ابی احمد ابی اسحاق و ممشاد علوم — بوہبیرہ شہ حذیفہ ابن ادہم شاہ دین
شہ فضیل و عبد واحد شہ حسنؓ حضرت علیؓ
آتنا الحسنات فی الدارین رب العلمین

تمت بالخیر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

مناجات

از

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

سب مراتب ہیں تری ذاتِ مقدس سے ورے
کس زباں سے کہوں ہے مرتبہ اعلیٰ تیرا

نورِ خورشید چمکتا ہے ہر اک ذرہ میں،
چشم بینا ہو تو ہر شے میں ہے جلوہ تیرا

بیم دوزخ ہے اوسے اور نہ شوقِ جنت
جس کو مطلوب ہے اک درد کا ذرہ تیرا

تیرے دیوانوں کو کیا قیدِ علائق سے گزند
دونوں عالم سے بھی آزاد ہے بردا تیرا

دل صد پارہ د ہر پارہ میں ہو داغِ جنوں
نام کندہ ہو ہر اک داغ پہ مولا تیرا

نفس و ابلیس کے پھندے میں پھنسا ہوں لیکن
دل سے اقرار یہی ہے کہ ہوں بندہ تیرا

ہم سیہ بخت اگر ایسے ہی ناکام رہے
کیسے جانیں گے کہ کیا فضل ہے ربا تیرا

تمام شد

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

جسمیں

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ کے
چند خطوط جمع کئے گئے ہیں

تالیف

جناب حضرت مولانا سیّد میاں اصغر حسین صاحب محدّث دارالعلوم دیوبند

ناشر:

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدائے پاک جلّ وعلا شانہٗ کے کلام میں اور حضور سیّد الانبیاء علیہ وعلی آلہٖ و
اصحابہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات میں جو کچھ عظمت و برکت و تاثیر ہے، اسی کا ایک
شمہ اور پرتو اولیاء اللہ اور مقربانِ خداوندی کے کلام میں جلوہ گر ہوتا ہے جس کی معنوی
کشش قلوب کے لئے نہایت نافع اور مثمر برکات ہوتی ہے۔ اس لئے احقر نے اپنے
استاذ محترم حضرت قطب الواصلین مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند کے متبرک مکتوبات
جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ جن حضرات کے پاس یہ ذخیرہ تھا اُن کا تحمل کہئے یا بے پروائی
پر محمول کیجئے ایفاء مواعید میں تاخیر کی اور جن حضرات کو احقر کے ارادے کی اطلاع ہو
گئی تھی اُنہوں نے تقاضے شروع کئے تو احقر نے چند خطوط بنام مکتوب حصہ اوّل شائع
کرنا مناسب سمجھا۔ اس کے بعد جو خطوط قابلِ اشاعت جمع ہوں گے اُن کو دوسرے
حصے میں شائع کر دیا جائے گا۔ خدّام و متوسلین وصحبت یافتگان جانتے ہیں کہ حضرت
مولانا کو لفاظی اور متصوفانہ عبارت اور اظہار تصوف و مشیخیت سے خاص نفرت تھی۔
جو کچھ تحریر فرماتے تھے، بالکل سیدھے سادے طریقے سے اور معمولی الفاظ میں۔ لیکن
ادنیٰ تامل سے معلوم ہو جائے گا کہ انہیں الفاظ میں کیسے معانی بے بہا اور مضامین بے نظیر
ودیعت فرمائے ہیں۔ سب سے پہلے ہم وہ چھ مکتوب درج کرتے ہیں جو حضرت مولانا
قدس سرہٗ نے اپنے خادم و مخلص شاگرد مولانا مولوی حاجی محمد احمد صاحب ساکن سملک ضلع
سورت کو باوقات مختلفہ تحریر فرمائے ہیں۔

مکتوبِ اوّل

اخی فی دین اللہ الاوحد رزقکم اللہ علماً نافعاً وعملاً متقبلاً

احقر محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے آپ کا عنایت نامہ پہنچا خیریت معلوم ہو کر اطمینان ہوا اور عزم سفر مبارک سے مسرت ہوئی۔ حق سبحانہٗ آپ کو بخیریت لاوے اور قبول فرماوے۔ وہاں کی خصوصیات سے یہ بات ہے کہ مکہ میں حرم شریف کی نماز با جماعت کا پورا التزام کیا جاتے اور وہاں کی حاضری اور کثرت طواف جد وجہد کے ساتھ کی جاوے اور مسجد نبوی کی بھی جماعت اور حاضری میں اہتمام ہو اور روضہ مطہرہ کے سامنے جس قدر ہو سکے حاضر رہنا اور وہاں بیٹھنا نعمت کبریٰ سمجھا جاوے مگر جس قدر ہو غایت تعظیم وحرمت اور توجہ تام اور شوق وخشوع کے ساتھ ہو باقی سفر میں اپنے کام میں مستعد اور ہوشیاری سے رہنا چاہیئے۔ جس پر اطمینان نہ ہو اس کی شرکت سے اجتناب بہتر ہے۔ اگر سفر میں کسی قسم کی تشویش یا تکلیف پیش آوے تو گھبرانا نہ چاہیئے۔ بلکہ اس تکلیف کو بھی شوق ومحبت کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے حُفَّتِ الجنۃُ بالمکارِہِ۔ ہر ایک حالت عسر ویسر میں اللہ پر اعتماد ہو کسی سے کچھ توقع نہ کی جاوے۔ مکہ مکرمہ میں کوئی شخص جس کو خط لکھوں یاد نہیں آتا اور مدینہ طیبہ میں مولوی حسین احمد صاحب اور اُن کے ہر دو بھائی موجود ہیں وہ انشاء اللہ آپ کی رفاقت کریں گے۔ ان کو خط کی حاجت نہیں ان سے جو حاجت ہو بے تکلف فرماویں وہ تعمیل کریں گے اور میرا سلام بھی ان کی اور ان کے والد ماجد کی خدمات میں عرض کر دینا۔ آپ کے خواب اوّل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ باذن اللہ عالم میں اسلام کو فروغ ہو اور انوار سنت عالم میں جلوہ گر ہوں واللہ اعلم ۱۲۔

بندہ حقیر آپ کے مطالب دارین کے لئے دُعا کرتا ہے اور انشاء اللہ کرتا رہے گا واللہ معکم این ماکنتم والسلام فقط۔ مواقع متبرکہ اور اوقات مخصوصہ میں بندہ کو دُعائے خیر سے گاہ گاہ یاد کرتا رہا کرنا کرتے واللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ مولانا مسعود احمد صاحب خیریت ہیں۔ مدرسہ دیوبند میں خیریت ہے۔ والحمد للہ

مکتوبِ دوم

برادرِ مکرم بارک اللہ فیکم و علیکم ۔ بندہ محمود بسلام مسنون کے بعد ملتمس ہے
مولوی کفایت اللہ صاحب کے خط سے آپ کی تشریف کی خبر معلوم ہوئی تھی ۔
خط لکھنے کا ارادہ کرتا تھا مگر پتہ پورا معلوم نہ تھا ۔ الحمدللہ آپ کے خط سے
خیریت اور دیگر حالات معلوم ہو کر اطمینان ہوا بخیر و خوبی اس سفر مبارک طویل کا
انجام پذیر ہو جانا حق تعالیٰ کا انعام ہے فلہ الحمد والمنۃ ۔
بچہ کے انتقال سے افسوس ہوا مگر کچھ مضائقہ نہیں آپ کا فرط خیر مکہ
میں رہا جس سے خیر و فلاح کی توقع ہے اللہ قبول فرماوے آمین
اللہ کے فضل سے جب آپ کو اس وقت فراغت ہے تو ضرور جم کر کسی
کار خیر میں لگ جائیں ۔ حیات دنیوی کا کچھ اعتبار نہیں ۔ آدمی سے جو کچھ ہو سکے
اس میں دیر نہ کرے ۔ ع اے ز غفلت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش
مگر آپ تمام جوانب پر نظر ڈال کر یہ طے کر لیں کہ قیام کہاں مناسب اور سہل ہوگا
چونکہ اہلیہ بھی معیت میں ہیں اس لئے تامل کر لینا بہتر ہے ۔ وطن میں سہولت ہوتی ہے ۔
عورت اور اطفال کو باہر رہنے میں دقت ہوتی ہے آپ تو یہاں رہے ہوئے ہیں ۔
آپ کو انشاء اللہ پریشانی نہ ہوگی ۔ بہتر ہو جو آپ ایک دو مرتبہ استخارہ بھی کر لیں
اور پھر جو رائے ہو اس کو قائم کریں ۔ یہ بھی خیال کر لیجئے کہ وہاں کے قیام میں یہاں
کے لوگوں کو ہدایت ہو جانے کی توقع ہے اور بدعات میں اور لوگوں کی جہالت
میں کمی ہونے کی امید ہو سکتی ہے ۔ اتنے میں آپ بہنوں کے عقد سے فارغ ہوں
اس عرصہ میں ان امور کو باطمینان طے فرمالیویں ۔ آپ کی تحریر کے موافق دربارۂ
طلبی ایک تحریر روانہ کئے دیتا ہوں ۔ آپ جملہ جوانب سے مطمئن ہو کر اگر یہاں
آنے کی ہی رائے قائم ہو جاوے تو اس تحریر کو دکھلا دیں ۔ تازہ سانحہ یہ گزرا کہ میری بڑی

لڑکی عوارض اسقاط میں انتقال کر گئی۔ آپ اس کی مغفرت کی دعا ضرور فرما دیں۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ آپ کے قیام کی وجہ سے وہاں کے مدرسہ میں کسی حد تک ترقی ہوسکیگی۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ ہر برس روز چھ۶ مہینے کے لئے یہاں آجاویں اور اس کے بعد وطن چلے جاویں اور پھر وہاں کی باتوں کو انجام دیں بہرحال جو صورت مناسب اور مفید تر نظر آوے اس کو معیّن فرمادیں۔ واللہ ولی التوفیق۔ والسلام فقط

بندہ محمود عفی عنہ جمعہ

مکتوب سوم

برادر معظم اکرمکم اللہ وسلم۔ بندہ محمود۔ سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے۔ عرصہ کے بعد آپ کا عنایت نامہ صادر ہوا آپ کی خیریت معلوم ہوکر مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت کے ساتھ اپنی مرضیات کی توفیق روز افزوں عنایت فرمادے۔ آدمی کو لازم ہے کہ وقت کو ضائع نہ کرے اپنی وسعت کے موافق نیک کام اور نیک خیال میں لگا رہے اور جہاں رہے۔ ہر وقت مفید کام سے غافل نہ ہو۔ بندہ بھی بحمداللہ خیریت سے ہے اور مدرسہ میں بھی سب خیریت سے ہیں۔

خواب سب مبارک و مفید ہیں۔ اوّل خواب میں اس امر کی ہدایت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کو صرف اپنے نفع پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ خلق اللہ کی نفع رسانی ہر امر خیر میں ملحوظ رہے۔ خواب دویم میں اس امر کی طرف تنبیہ ہے کہ جملہ مرغوبات نفس صرف زندگی تک نظر آتے ہیں۔ بعد حیات کارآمد نہیں۔ آدمی کو ایسے کاموں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے جو بعد میں کام آویں۔ تیسرے خواب میں اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بحمداللہ آپ کی طلب مقبول اور آپ کی درستی اور تربیت اور اصلاح عنداللہ ملحوظ ہے اور آپ کو کسی مقبول بندہ سے نفع پہنچے۔ مزنیؒ حضرت امام شافعیؒ کے بلا واسطہ شاگرد رشید اور غالباً امام طحاویؒ کے ماموں ہیں۔ اکابر علماء اور مشاہیر میں سے ہیں رحمۃ اللہ۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام فقط۔ مولوی حسین احمد صاحب دیوبند میں مقیم

ہیں۔ بعد رمضان عزم مدینہ طیبہ مصمّم رکھتے ہیں۔ بندہ محمود عفی عنہ۔ یکشنبہ

مکتوب چہارم

مخدوم بندہ دام فضلکم۔ بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے ذیقعدہ کے اخیر میں آپ کا گرامی نامہ معہ بلٹی پہنچا تھا۔ بندہ گنگوہ وغیرہ چلا گیا۔ جواب میں اس لئے تساہل ہو گیا۔ لیموں اور ادرک بجنسہٖ پہنچ گئی۔ مفتی صاحب مہتمم صاحب اور بعض صاحبوں کو بھی پہنچا دیا گیا۔ لیموں بہت بڑے تھے اور ادرک تازہ عمدہ۔ باقی بندہ بحمد اللہ خیریت سے ہے اور مدرسہ میں بہمہ وجوہ خیریت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت سے رکھے اور فلاح دارین عطا فرمادے۔ مولوی محمد شفیع صاحب سے سلام فرما دیجئے۔ مولوی حسین احمد صاحب کی مکّہ سے خیریت آگئی۔ مدینہ طیبّہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ ڈاک بھی بند معلوم ہوتی ہے۔ حرب وضرب میں طول بڑھتا جاتا ہے۔ تشویش میں ترقی ہے۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے۔ مولوی محمد میاں دیوبند میں ہیں خیریت سے ہیں۔ بعض تدابیر میں مشغول ہیں۔ مقدمہ کے لئے روپیہ کی فکر میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائے اپنے اوراد التزام سے کئے جائیں حق سبحانہٗ استقامت نصیب کرے۔ مولوی عزیز گل گھر گئے ہیں۔ مولوی خان محمد صاحب خیریت سے ہیں اُن کا سلام قبول ہو۔ اپنی خیریت سے مطلع فرماتے رہیئے۔ والسلام فقط بندہ محمود عفی عنہ۔ شنبہ

مکتوب پنجم

مکرم بندہ۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط اس وقت ملا جبکہ میں جہاز پر سوار ہونے کے لئے لبِ دریا پڑا ہوں۔ اس وقت سند لکھنے سے مجبور ہوں۔ انشاء اللہ دوسرے وقت لکھ دوں گا۔ آپ کی ہمشیرہ خدیجہ عائشہ اور جو درخواست کریں اور آپ مناسب

سمجھیں اُن کی بیعت قبول کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ برکت دے۔ سب کو صبح و شام کا وظیفہ معہ تاکید نماز وغیرہ فرما دیجئے سعی فی الدین کا خیال رہے۔ اللہ مددگار ہے آپ کے لئے انشاء اللہ دعا کرتا رہوں گا۔ آپ بھی دعا فرماتے رہیں اور سب سے سلام فرما دیجئے۔ والسلام فقط بندہ محمود عفی عنہ بمبئی شنبہ

مکتوب ششم

برادر مکرم و محترم مد فیوضکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کا محبت نامہ ۱۴ ر صفر کا آٹھ نو ماہ کے بعد ذیقعدہ کی شروع میں مجھ کو ملا۔ بہت ہی مسرت ہوئی آپ کی یاد آوری کا ممنون اور آپ کی خیریت معلوم ہونے سے مسرور رہوں الحمد ثم الحمد للہ

بخاری شریف۔ ہدایہ وغیرہ کتب کی تدریس سے بہت خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ آپ کی علم و عمل میں برکت دے اور اپنے بندوں کو آپ کے فیض سے مستفیض فرما وے۔ یہ عاجز حق سبحانہ تعالیٰ کی رحمت اور آپ کی دعا سے معہ جملہ رفقاء بہمہ وجوہ خیریت سے ہے۔ مولوی حسین احمد صاحب مدنی، وحید احمد اُن کا برادر زادہ، مولوی عزیز گل، مولوی حکیم نصرت حسین۔ یہ چار حضرات میرے ساتھ ہیں، سب خیریت سے ہیں اور سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔ جس کاغذ پر یہ خط لکھ رہا ہوں انہیں پر خط لکھنے کی اجازت ہے۔ اس لئے سند حدیث اس وقت ارسال کرنے کا موقع نہیں خدائے تعالیٰ کو منظور ہے تو دوسرے وقت آپ کے فرمانے کی تعمیل ہو جاوے گی۔ آپ طلبہ کو سند دیجئے اس میں تامل نہ فرماویں۔ بندہ کی سند یہ ہے، کہ بندہ کو حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ سے اُن کو حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی رح اور مولانا احمد علی صاحب رح سہارنپوری سے اِن دونوں حضرات کو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رح سے، ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز رح سے، ان کو اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح

سے رحمہم اللہ علیہم اجمعین ۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی سند کتابوں میں اور علماء میں مشہور ہے ۔ اُس کے لکھنے کی حاجت نہیں ۔ آپ احقر کے لئے دُعا عافیت دارین فرماتے رہیں ۔ بندہ بھی آپ کے لئے دُعا کرتا ہے ۔ تولد فرزند سے خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ عمر اور سعادت دارین عطا فرماوے ۔ ایک تعویذ لکھتا ہوں اس کو لکھ کر عزیز معصوم کے گلے میں ڈال دینا ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵ اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من شر
کل شیطان وھامۃ وعین لامۃ تحصنت بحصن الف الف
لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

اصحاب سورت خدا کرے سب خیریت سے ہوں ۔ سب کی خدمت میں سلام مسنون پہنچا دیجئے ۔ والسلام مع الاکرام ۔ بندہ محمود الحسن ۔ مالٹا سینٹ کلیمنٹ براکس ۔
۲۸ ذیقعد ۱۳۳۶ھ ۲۲۱۹

مکتوب ہفتم

از مالٹا ، بنام مولوی محمد حنیف صاحب

عزیز محترم اسعدکم اللہ واکرم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ پہلے بھی کئی خط روانہ کر چکا ہوں تمہارے بھی کئی خط آئے بحمد اللہ خیریت سے ہوں اور جملہ رفقا بھی خیریت سے ہیں ۔ جمادی الثانی کے شروع پر تمہارا مرسلہ گوشت پہنچا ۔ عجیب چیز معلوم ہوا ۔ کئی برس بعد گائے کا گوشت نظر آیا ۔ کچے میں کسی قدر بو آتی تھی مگر پکنے کے بعد اچھا ہو گیا ۔ مزے سے کھایا ۔ چونکہ گوشت کا قدر دان اور شائق اپنی جماعت میں صرف میں ہی ہوں اس لئے باوجود دانتوں کی کمزوری کے اوروں سے زیادہ کھایا ۔ تم نے جو چیزیں بھیجے تھے اُن کی رسید اسی وقت تمہارے پاس روانہ کر دی تھی مولوی زاہد حسن صاحب امروہی نے سب کے واسطے متعدد کرتے اور پاجامے سلوا کر اور بہت سی چائے اور چاول وغیرہ اشیاء بھیجی تھی ۔ اُس کی رسید بھی اُن کے نام روانہ کر چکا ہوں تمہارے

یہ س خط پہنچ جائے تو تم بھی اُن کو مطلع کر دینا۔ میرا سلام چھوٹوں بڑوں سبھی کو پہنچا دینا اور جملہ رفیق آپ کو اور سب کو سلام عرض کرتے ہیں اسیروں کے متعلق تحریکات شروع ہیں حق سبحانہٗ کو منظور رہے تو جلد یا کچھ دیر کے بعد نتائج بھی ظاہر ہو جاویں گے۔ اللہ بس باقی ہوس والسلام۔ ۴۔ جمادی الثانی ۱۳۳۷ھ

مکتوب ہشتم

بنام مولوی محمد حنیف صاحب از مالٹا (مختصراً)

مَیں اور جملہ رفقا اطمینان سے ہیں۔ حق تعالیٰ بخیریت آپ سے ملا دے۔ دُعا کرتے رہیئے۔ وہاں کہیں کی کمی نہیں جملہ رفقا جس عزم اور ہمّت سے میرے ساتھ ہُوئے تھے اسی عزم پر پختہ ہیں۔ بعض موقعوں پر بعض صاحبوں کو مَیں نے چھوڑنا بھی چاہا کہ تم کیوں میری وجہ سے مفت دِقّت میں پڑتے ہو، مگر کسی نے علیحدگی گوارا نہیں ہر جگہ ہر طرح سے میری راحت اور تقویّت میں مستعد ہیں۔ گویا اپنے گھر بیٹھا ہُوا ہُوں۔ مجھ کو کچھ فکر کرنا نہیں پڑتا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ ؎

خدا گر بحکمت بہ بندد درے
کشاید بہ فضل و کرم دیگرے

اکثر یاد آجاتا ہے